غارِ حرا میں ایک رات

(سفرنامہ)

مستنصر حسین تارڑ

غارِ حرا میں ایک رات

(سفرنامہ)



مستنصر حسین تارڑ

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور



ے تپشِ شوق نے ہر ذرّے پہ اک دل باندھا
(غالب)

910.4 Tarar, Mustansar Hussain
Ghaar-i Hira Main Aik Raat/
Mustansar Hussain Tarar.- Lahore : Sang-e-
Meel Publications, 2007.
296pp.
1. Urdu Literature - Travelogue.
I. Title.

2007
نیاز احمد نے
سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1895-0

Sang-e-Meel Publications
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز لاہور

ترتیب



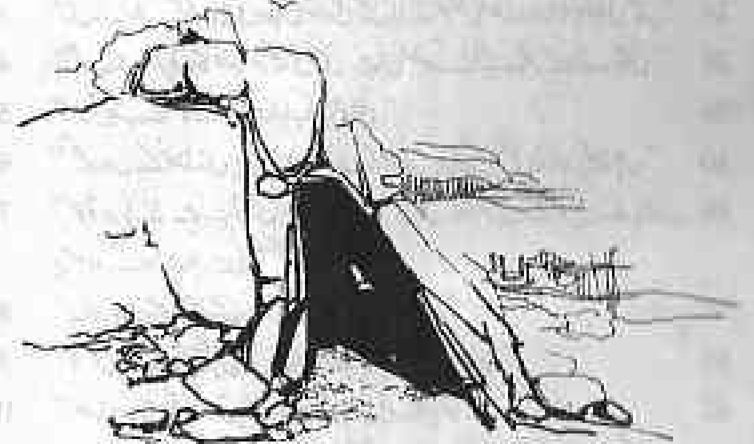
"پھر مدینے میں ہونا کیسا ہوتا ہے"

میں پھر مدینے میں تھا..
اور مدینے میں ہونا کیسا ہوتا ہے..
جیسے قصر الحمرا کے حصار کی ایک شکستہ دیوار پر میکسیکو کے شاعر اکازا کے یہ مصرعے کندہ دکھائی دیتے ہیں جو اس نے غرناطہ میں ایک اندھے گداگر کو دیکھ کر لکھے تھے..

"اے عورت اس گداگر کو بھیک دو
کہ غرناطہ جیسے شہر میں ہونا..
اور آنکھوں سے محروم ہونا..
زندگی میں اس سے بڑی اذیت اور کوئی نہیں."

تو وہ غرناطہ تو محض ایک کونپل تھی..
تو محض ایک کونپل کی اس شجرِ گل ریز سے کیا نسبت جس کی شاخوں سے ایسی، غرناطہ جیسی ہزاروں کونپلیں پھوٹی تھیں..
ایک غرناطہ.. ایک کونپل اگر ایسی تھی تو جس شجر.. مدینے سے وہ پھوٹی تھی وہ کیسا ہوگا..
مدینے ایسے شہر میں تو انسان بے شک اندھا ہو تو بھی یہ اس کی سب سے بڑی خوش قسمتی ہوگی..

مدینے میں ہونا ایسا ہوتا ہے..



''تنہائی میں اپنے رسولؐ سے ملاقات..

اندھے گداگر کے کشکول میں ایک سنہری سکّہ!''

میں پھر مدینے میں تھا.. اس فرق کے ساتھ کہ اسی برس فروری میں حج کے ایام میں تمیر میرے ہمراہ تھا اور اب اکتوبر کے اوائل میں میمونہ میرے ساتھ تھی..

ان سات ماہ کے اندر اندر غیب نے میرے لیے یہ بندوبست کر دیا گیا تھا کہ میں پھر مدینے میں ہو جاؤں..

میں لاہور میں ابھی حج کی تھکن اتار رہا تھا کہ مجھے اطلاع کی گئی کہ اس برس قطر کی انجمن فروغ اردو ادب کا معتبر ایوارڈ.. زندگی بھر کی نثری کاوشوں کے سلسلے میں مجھے عطا کیا جا رہا ہے.. اور یونہی قطر میں ایک عالی شان محفل میں مجھے ایک شیلڈ دے کر رخصت نہیں کیا جانا تھا بلکہ اس کے ہمراہ ایک خطیر رقم کا چیک بھی تھمایا جانا تھا.. مجھے یہ بھی خبر ملی کہ مشتاق احمد یوسفی صاحب کی سربراہی میں جو جیوری تھی اس نے نہ صرف متفقہ طور پر یہ فیصلہ سنایا تھا بلکہ ایوارڈ کی تاریخ میں کم سے کم.. یعنی دو تین منٹ کے اندر اندر یہ فیصلہ سنایا تھا..

میں کسر نفسی سے کام نہیں لے رہا لیکن مجھے اس ایوارڈ کی سمجھ نہ آئی.. کہ یہ کیوں مجھے مل گیا ہے.. مجھ سے پیشتر یہ ایوارڈ جن بزرگان ادب کو ملا تھا میں ان کے ہم پلہ نہ تھا.. میں نے جو سیکھا تھا ان سے سیکھا تھا.. یوسفی صاحب.. احمد ندیم قاسمی.. ممتاز مسعود.. اشفاق احمد.. محمد خالد اختر اور پچھلے برس شوکت صدیقی کے بعد مجھ ایسے نابالغ ادیب کو کیوں عنایت کیا گیا تھا..

اس کی صرف ایک ہی توجیہ تھی..

اس کے سوا اور کوئی جواز نہ تھا..

یہ ایوارڈ محض ایک بہانہ تھا مجھے پھر سے مدینے بلانے کا..

یہ سب انہی کا کیا دھرا تھا..

ورنہ ادب کے بابا لوگ کے بعد مجھ ایسے بچہ لوگ کو اتنا بڑا ایوارڈ دینے کا اور کوئی جواز نہ تھا..

نہ جیوری کو کچھ خبر ہوئی اور نہ ایوارڈ دینے والوں کو.. کہ اس بندے کی تو سفارش آ گئی ہے..

قطر سے جدّہ کچھ دور نہ تھا.. اور جدّہ سے مدینہ تو بالکل دور نہ تھا..

میں نے ایک سفارشی کے طور پر دوحہ کی ایک شاندار ادبی محفل میں یہ ایوارڈ وصول کیا اور ملک حبیب الرحمان نے میرے لیے قطر اور جدّہ کے درمیان فاصلے طے کرنے کا بندوبست کر دیا..

تو میں پھر مدینے میں تھا..

سلجوق ابھی تک جدّہ میں تعینات تھا.. ہمارا منتظر تھا.. بلکہ اپنی امی کا منتظر تھا..

جدّہ ایئرپورٹ پر سلجوق کے ہمراہ رنگین آنکھوں والی اپنی بہو رابعہ کو دیکھ کر ہم دونوں کھل اٹھے.. وہ ہمیں گھر لے گئے.. شتابی سے ایک عمرہ کروایا اور پھر ہم مدینے کے مسافر ہو گئے..

جس نے سفارش کی تھی اس کے شہر کے مسافر ہو گئے..

مسجد نبویؐ کے مقفل ہو جانے کا لمحہ گیارہ بجے رات کے لگ بھگ ہوتا ہے..

اور دس بجے رہے تھے..

اور مسافر میں تھا.. میمونہ تھی اور جو شخص ہم مسافروں کو غریب الوطن نہیں ہونے دیتا تھا اور ہمارا ساربان تھا' سلجوق تھا..

اور ساربان اپنی سواری کو حسب معمول بھگاتا چلا جاتا تھا.. ''ابو.. جونہی مسجد نبویؐ کے بند ہونے کا وقت قریب آتا ہے لوگ اٹھتے جاتے ہیں' اسے خالی کرتے جاتے ہیں تو یہی وہ وقت ہوتا ہے جب آپ اس میں داخل ہو جائیں تو ہر مقام ویران ہو رہا ہوتا ہے.. ریاض الجنۃ کا سفید قالین خالی نظر آتا ہے.. منبر رسولؐ اور محراب رسولؐ کے پاس کم لوگ ہوتے ہیں.. اور ابو.. حضورؐ کی جالیوں کے سامنے بھی..''

''کیا ہم اس وقت تک مدینہ پہنچ جائیں گے..''

''انشاء اللہ..''

دائیں ہاتھ پر تاریکی میں کھجوروں کا وہ باغ گزرتا چلا جاتا تھا جس کے درمیان میں کوئی قدیم رہائش گاہ تھی اور اس کی ایک کھلی کھڑکی میں روشنی تھی..

اس کے مکینوں میں سے کوئی جاگ رہا تھا..

میں نے پچھلی بار دن کی تیز دھوپ میں اس باغ کو دیکھا تھا جو مدینے کی قربت کی نشاندہی کرتا تھا..

ہم پہنچنے والے تھے..

اور پھر سامنے روشنیاں جھلملانے لگیں ایک شہر کی.. ایک منور شہر.. نبیؐ کا شہر..

رات سے مکّہ کی پہاڑیوں پر دمکتے چراغ نشیب میں اترتے ہیں..

جب کہ مدینہ کی روشنیاں ایک آہستہ رو دریا کی مانند ہموار سطح پر بہتی چلی جاتی ہیں..

مدینے میں جو بھی چراغ جلتا ہے.. ایک مدھم بہاؤ پر تیرتا چلا جاتا ہے..

شہر میں چہل پہل کم تھی کہ یہ حج کے موسم نہ تھے..

اور یوں بھی رات ہو چکی تھی..

مدینے میں داخل ہوتے ہی ہماری نظریں جس عمارت کی تلاش میں بھٹکتی تھیں اس نے ایک فلائی اوور کے پار.. کھجوروں کے ایک گھنے جھنڈ سے پرے اپنے روشنی میں نہائے مینار صرف ہماری سہولت کی خاطر دھیرے دھیرے بلند کیے..

مسجد نبویؐ کی مکمل روشن تصویر ایک پکچر پوسٹ کارڈ کی طرح مدینے کے در و دیوار کے ماتھے پر آویزاں تھی.. اور پھر صرف ایک پل کے لیے مسجد کی چکا چوند میں گوشہ نشین سبز پوش گنبد نمائش اور امارت سے الگ تھلگ.. آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنیوں سے لاتعلق.. ایک خرقہ پوش بزرگ کی مانند اپنے ہی دھیان میں گم اور اپنے رتبۂ بلند پر قانع کہ اس کے تلے کل کائنات کا محبوب خوابیدہ ہے.. صرف ایک پل کے لیے نظر آیا گوشہ نشین سبز پوش گنبد اور پھر پوشیدہ ہو گیا.. ہوٹلوں.. مہمان خانوں اور سپر سٹوروں کے انبار کے پیچھے..

مسجد نبویؐ کا صحن اتنا وسیع ہے کہ بس چلتے چلتے دن سے رات ہو جاتی ہے۔ پر ابھی اتنی رات نہیں ہوئی تھی کہ اس کے سب دروازے بند ہو جائیں..

ہم تینوں اس صحن میں ہانپتے ہوئے بھاگتے ہوئے چلتے تھے..

باب السلام کی جانب تیز تیز قدم اٹھاتے تھے..

سلجوق بہت آگے تھا.. پھر میں تھا بار بار پیچھے دیکھتا.. اس دیکھنے میں پیچھے آنے والی میمونہ سے التجا تھی کہ ذرا ہمت کرو.. تم تھکی ہوئی ہو تو میں بھی تھک چکا ہوں.. کہیں کارواں سرائے کا رکھوالا بڑا پھاٹک بند نہ کر دے اور ہم بے آسرا نہ ہو جائیں.. ہمارا بیٹا ہم سے پہلے پہنچ کر رکھوالے کی منت تو کرے گا کہ دور کے شہروں سے آنے والے میرے عمر رسیدہ ماں باپ وہ دیکھو مسجد کے صحن میں پاؤں گھسیٹتے جو سامنے نظر آتے ہیں وہ چلے آتے ہیں.. ابھی پھاٹک بند نہ کرو..

باب السلام نظر آیا تو کچھ دھارس بندھی.. اس کی بلند و بالا چوکھٹ پر ترک کاریگروں کی دستکاری و مینا کاری ایک گھنے جنگل ایسی آرائش کی صورت نمایاں ہو رہی تھی اور عین اوپر ایک فانوس ترک ذوقِ جمال کی لطافت سے مزین جگمگا رہا تھا..

پہرے دار ایک سٹول پر بیٹھا جمائیاں لے رہا تھا اور مسجد کے اندرون سے باہر آنے والوں کو دیکھتا تھا کہ کب آخری زائر باہر آئے اور وہ باب السلام مقفل کر کے اپنے گھر جائے..

مجھے تنہا ہی اندر جانا تھا..

میمونہ پچھلے برس حج سے لوٹی تو اس کی ایک شکایت میں کڑواہٹ بہت تھی.. وہ روضۂ رسولؐ کی ایک جھلک بھی دیکھ نہ پائی تھی.. باب جبریل کے گرد ہجوم کرتی خواتین جو سب کی سب اندر جھانکنے کی کوشش کرتی تھیں.. شُرطوں سے ڈرتی پیچھے پیچھے بھی ہوتی تھیں اور ان کی تمنائی آنکھیں روضۂ رسولؐ کی جالی کا بس ایک ذرّہ دیکھنے کی تمنائی بھی تھیں لیکن سوائے ایک مردانہ ہجوم کے انہیں کچھ دکھائی نہ دیتا تھا.. میمونہ بھی ان میں سے ایک تھی اور اسے یہ مذہبی منطق سمجھ میں نہ آتی تھی کہ عورتوں کو یہاں تک آنے سے کیوں روک دیا گیا تھا.. جب کہ اس کی بڑی بہن طاہرہ کا کہنا تھا کہ پندرہ بیس برس پیشتر ایسی کوئی پابندی نہ تھی اور خواتین بھی حاضر ہو سکتی تھیں.. چنانچہ سلجوق اسے مسجد نبویؐ کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ باب جبریل کی جانب لے کر جا رہا تھا کہ شاید ادھر سے اماں کو ایک جھلک.. دکھائی دے جائے باہر کھڑے ہو کر جالی کا کوئی حصہ نظر آ جائے..

اس لیے مجھے تنہا ہی اندر جانا تھا..

باب السلام اور اس کے برابر میں باب ابوبکر صدیقؓ میں سے اکا دکا لوگ مسجد سے باہر آ رہے تھے لیکن کوئی ایک فرد بھی اندر نہیں جا رہا تھا..

میں تنہا تمنائی تھا..

میں کچھ دیر کے لیے سٹول پر بیٹھے جمائیاں لیتے پہرے دار کو تکتا رہا.. مجھے یقین تھا کہ یہ مجھے روک لے گا.. اندر نہیں جانے دے گا..

باب ابوبکر صدیقؓ کے اندر مسجد کا جو وسیع اور روشن پھیلاؤ نظر آ رہا تھا وہ سارے کا سارا خالی ہو چکا تھا..

میں کیسے جاؤں.. ؟ یونہی مجاہدوں کا لبادہ اوڑھ کر نظریں جھکائے پہرے دار سے آنکھیں ملائے بغیر اندر داخل ہو جاؤں.. مسکراتا ہوا.. سر ہلاتا کہ بھائی جان آپ کی مہربانی میں تو ابھی گیا اور ابھی آیا.. یا پھر بگٹٹ بھاگتا ہوا اندر چلا جاؤں کہ یہ سست جمائیاں لیتا ہوا پہرے دار

میرے پیچھے بھاگنے سے تو رہا.. اتنی دیر میں اس نے مجھے دیکھ لیا.. کہ میں صحن کی وسعت میں باب السلام کے باہر کھڑا اکیلا شخص تھا..

اب تو تو بالکل نہیں جانے دے گا..

لیکن یہاں کھڑے رہنے میں بھی کچھ بھلائی نہ تھی.. اگر میں تادیر یونہی بت بنا کھڑا رہتا ہوں تو پہرے دار کے ذہن میں شکوک ابھریں گے اس لیے میں نے ہمت کی اور اس کی جانب چلنا شروع کر دیا.. اس بھلے مانس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور کچھ نہ کہا.. اور یقین مانیے میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس سے اجازت لینے سے روکا..

شاید مجھے.. اگر میں کر سکا تو.. پل صراط عبور کرنے پر بھی اتنی خوشی نہ ہوگی.. جتنی مجھے اس لمحے ہوئی جب میں باب السلام میں سے گزر کر مسجد کے اندر داخل ہو گیا..

اور اسی لمحے مسجد جو پرانے زمانوں کے کل مدینے پر محیط ہو چکی ہے اس کے در و بام میں.. اس کی تقریباً خالی ہو چکی وسعت میں اور محرابوں اور فانوسوں میں ایک درخواست گونجنے لگی کہ مسجد بند ہونے کو ہے.. براہ کرم باہر چلے جائیں..

لوگ باہر جانے لگے اور میں اندر جانے لگا..

پوری مسجد خالی پڑی تھی.. جہاں تک نظر جاتی تھی محرابوں اور قالینوں اور فانوسوں کے سوا اور کچھ نہ تھا..

اگر کچھ لوگ تھے تو ریاض الجنۃ کے آس پاس.. منبرِ رسولؐ اور محرابِ رسولؐ کی قربت میں.. بمشکل تیس چالیس.. عبادت میں مگن..

مسجد کو خالی کر دینے کا اعلان دہرایا جا رہا تھا..

مجھے اپنی نظروں پہ یقین نہ آیا.. ریاض الجنۃ کا وہ سفید قالین جو ہزاروں لوگوں سے یوں ڈھکا ہوتا تھا کہ اس پر ایک جبیں رکھنے کی بھی گنجائش نہ ہوتی تھی.. خالی پڑا تھا.. جیسے ابھی ابھی میرے لیے ہی بچھایا گیا ہو..

چند لوگوں کے سوا منبرِ رسولؐ کے آس پاس بھی کوئی نہ تھا..

محرابِ رسولؐ تو گویا سناٹے میں آئی ہوئی ایک تنہا تصویر تھی..

حجرۂ رسولؐ کی دیوار اور میرے درمیان کوئی ایک فرد نہ تھا..

جتنے بھی بلند مرتبت ستون تھے.... سب کے سب جھکے ہوئے آرام کرتے تھے کہ آج اتنے ہزاروں لوگوں نے ان کی قربت میں نفل ادا کیے تھے ان سے لپٹ کر روئے تھے..

اصحابِ صفہ کا تھڑا بھائیں بھائیں کر رہا تھا..

اور باب السلام سے شروع ہونے والی وہ راہداری جو روضۂ رسولؐ کو جاتی تھی وہ بھی ویران پڑی تھی اور میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کے آخر میں سبز گنبد تلے جو سنہری جالیاں ہیں ان کی قربت میں بھی گنے چنے لوگ ہیں..

پہلے تو یہی خیال آیا کہ گداگر اگر اندھا ہے تو بھی سب سے پہلے ان جالیوں کو چھو کر.. انہیں بریل کی عبارت کی مانند چھو کر ٹٹول کر کچھ "پڑھ" لے.. ابھی نہ رہے.. پھر لالچ غالب آ گیا..

میں ایک ایسا بچہ تھا جو من پسند کھلونوں کی دکان میں تنہا کھڑا تھا.. جن کھلونوں کو وہ زندگی بھر ترستا تھا.. جو وہ خرید نہ سکتا تھا.. انہیں حاصل کرنے کے خواب دیکھتا تھا وہ سب کے سب اس کے آس پاس تھے.. کوئی روکنے والا نہ تھا.. جو جی چاہے اٹھا لو.. اگرچہ جھولی مختصر ہے اور کھلونے بہت..

مسجد خالی کرنے کا اعلان درشتگی سے نہیں نرماہٹ کے لہجے میں مسلسل ہو رہا تھا.. مہربان نگہبان بھی عبادت گزاروں کو مسکراتے ہوئے تکتے تھے اور باہر جانے کے اشارے کرتے تھے..

چنانچہ میں تنہا ہوا ریاض الجنۃ کے جنت کے ٹکڑے میں.. کہ صرف یہ حصہ ہوگا کائناتوں کا جو روزِ حشر تباہ نہیں ہوگا جوں کا توں جنت کو اٹھایا جائے گا..

میں نے ہر ستون سے تنہائی میں مخاطب ہو کر نفل ادا کیے..

منبرِ رسولؐ کے سامنے کھڑا ہوا تو بابا کو بھی حیرت ہوئی کہ آج بس یہی ہے نمی سے بھری سرخ آنکھوں والا.. میری باتیں سننے والا.. یہ تو وہی ہے جو صفہ کے تھڑے پر بھوکا پیاسا بیٹھا تھا اور میں اسے اپنے حجرے میں لے گیا تھا.. دودھ کا ایک پیالہ پلانے کے لیے.. چند کھجوریں کھلانے کے لیے..

محرابِ رسولؐ میں بھی ان کو خبر ہو گئی ہوگی کہ میرے قدموں میں سجدے کرنے والا ابھی وہی تنہا شخص ہے..

البتہ میں اصحابِ صفہ کے تھڑے تک نہ گیا کہ میں وہاں تو بیٹھتا ہی رہتا تھا..

اس زندگی میں.. اور اس زندگی میں بھی..

نگہبانوں کی مہربانی میں کمی آنے لگی..

میرے علاوہ وہ چند ایک اور زاہد بھی تھے جو اٹھائے نہ اٹھتے تھے..

اور تب مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں باب جبریل بند نہ ہو جائے.. اور مجھے بابا کو سلام کیے بغیر واپس

باب السلام سے باہر نہ جانا پڑ جائے..اور یہ امکان موجود تھا کیونکہ بیشتر لوگ اسی پھاٹک سے نکل رہے تھے..

تب میں ایک ہی جیسے ہو گئے ایک دوسرے کے ہم شکل ہو گئے لوگوں کے ہجوم میں ہولے ہولے سرکتا تھا..اور اب میں رات کو اس سے اس خالی راہداری میں تیز چلتا..ذرا تیز تیز چلتا جا رہا تھا..

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام..

میں آج..تنہا انجمن تھا..اس لیے جمال یار کی جتنی روشنی تھی اس میں کوئی اور میرا حصہ دار نہ تھا..

میں نے دیکھا کہ باب جبریل کا ایک پٹ بند ہو چکا ہے اور دوسرے کواڑ کو ایک مضطرب پہریدار تھامے ہوئے ہے..

دو چار لوگ تھے جالیوں کے سامنے کھڑے ہوئے..لرزش میں آئے ہوئے چند ہونٹ تھے..نم آلود کچھ آنکھیں تھیں..

کتھے مہر علیؒ کتھے تیری ثناء..

پہریدار ان چند لوگوں سے باری باری اب ذرا سختی سے چلے جانے کو کہہ رہے تھے..

میں اُس سنہری بوند کے اندر کبھی چھب دکھلاتے کبھی اوجھل ہو جاتے اس پیراہن کو تکے جا رہا تھا جو جسم یار کی خوبی سے رنگینیوں میں ڈوبا ہوا تھا..جس کی ڈاچی چھن چھن کرتی میرے بدن کی گلیوں میں سے گزرتی جاتی تھی..میں اس لمحے سنہری جالی کو ذرا نظر بچا کے چھو بھی سکتا تھا..لیکن مجھ میں سکت نہ تھی..

پہریدار اب سرزنش کر رہے تھے..وہ مزید مہربان نہ ہو سکتے تھے..

جو گنے چنے لوگ ابھی تک جھجک رہے تھے وہ مجبور ہو کر باب جبریل سے نکلنے لگے..

اور تب..

اور تب ایک لمحہ..ایک نہایت شاید پلک جھپکنے جتنی ساعت ایسی آئی کہ میں..

بابا کے سامنے تنہا کھڑا تھا..

آس پاس کوئی ایک بشر نہ تھا..

سوائے پہریداروں کے..

ان میں سے ایک نے مجھے سرزنش کی نگاہ سے دیکھا تو میں نے شہادت کی انگلی اٹھا کر مسکراتے ہوئے ایک لمحے کی اجازت چاہی..

اور جب میں بابا کے دربار میں ان کے سامنے تنہا کھڑا تھا..روبرو تھا..

چہرہ بہ چہرہ تھا تو میں نے کیا کیا؟..

نہ کچھ طلب کیا..نہ کوئی دعا مانگی..نہ کسی تمنا کا اظہار کیا..اور نہ ہی آنکھوں سے کوئی آنسو بہا..میں اس مختصر ساعت میں..اس ایک لمحے میں بس مسکراتا رہا..

جمال یار کی روشنی میں یار کو دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا..

جیسے ایک اندھے گداگر کے کشکول میں ایک غیر متوقع سنہری سکہ گرے تو وہ اپنی نابینائی میں بھی مسکراتا جاتا ہے..

''امّاں ماریہ قبطیہ کے گھر.. جہاں وہ بال سنوارتی تھیں بابا کے ہم شکل حضرت ابراہیم کو کھلاتی تھیں''

میں پھر مدینے میں تھا..

اور پھر ''پاکستان ہاؤس'' میں ہی قیام کرتا تھا..

لیکن ہمارے کمرے کی بالکونی سے مسجد نبویؐ کا مینار طلوع ہوتا دکھائی نہ دیتا تھا کہ ہم ''پاکستان ہاؤس نمبر 2'' میں مقیم تھے..

میں جب بھی اس ایک لمحے کا خیال کرتا جب میں روضۂ رسولؐ کے سامنے تنہا کھڑا تھا تو میں اسی طور مسکرانے لگتا.. جیسے پچھلی شب بابا کے سامنے اکیلا کھڑا مسکراتا تھا..

تھکن تو بہت تھی لیکن اتنی بھی نہ تھی کہ ہم مسجد نبویؐ میں فجر ادا کرنے سے غفلت برت جاتے.. مدینے کی سویر کی ٹھنڈک اپنے بدنوں میں نہ اتارتے..

واپس آئے تو پھر بستروں پر ڈھیر ہو گئے..

میں سو تو نہ سکا بس اونگھتا رہا.. کھڑکیوں میں سے دھوپ آنے لگی.. میں نے ایک کھڑکی میں سے نیچے جھانکا تو گلی میں متعدد لوگوں کو منتظر حالت میں پایا.. اپنے پاسپورٹ.. فائلیں.. کاغذات سینے سے لگائے منتظر دیکھا.. کچھ ''پاکستان ہاؤس'' کی سیڑھیوں پر براجمان تھے اور بیشتر گلی میں ٹہل رہے تھے.. وہ اپنے نائب قونصل کے منتظر تھے جس نے ان کی شکایات کا مداوا کرنا تھا.. ان کے پاسپورٹ.. اقامے یعنی رہائش کے قانونی کاغذ اور دیگر سرٹیفکیٹ چیک کر کے منظوری یا نامنظوری کی سرکاری مہر لگانی تھی.. ان میں سے کچھ ایسے تھے جن کے عزیز جیلوں میں تھے اور وہ ان کی رہائی کے لیے نائب قونصل کی مدد چاہتے تھے..

اور نائب قونصل صاحب ابھی تک نیند میں بے سدھ پڑے تھے..

یہ ایک خوشگوار اتفاق تھا کہ جن دنوں ہم نے مدینے آنا تھا انہی دنوں سلجوق کا سرکاری دورہ بھی تھا..

''سلجوق..'' میں نے اسے جگانے کی کوشش کی ''بیٹے اٹھو.. نیچے لوگ تمہارے منتظر ہیں..''

وہ نیند میں ہی بڑبڑایا.. ''ابو.. میں نے ابھی نہیں جانا..''

یہ بچہ تو فارن سروس میں جا کر بھی نہیں بدلا تھا وہی تھا جسے میں ہر صبح جگانے کی کوشش کرتا تھا کہ بیٹا اٹھو سکول کا وقت ہو گیا ہے اور وہ کروٹ بدل کر منہ بسورتے ہوئے کہتا تھا.. ''ابو.. میں نے سکول نہیں جانا..''

جانے کیوں وہ ایک خاص عمر تک سکول جانے سے بے حد خوفزدہ رہا..

جب وہ نرسری میں تھا تو پورے لکشمی مینشن میں اس کی ''ابو میں نے ٹول نہیں جانا'' کی آہ و زاری مکینوں کو آبدیدہ کر دیا کرتی تھی.. نرسری کلاس کی استانیاں شاید سخت گیر تھیں کہ ہر صبح جب بابا نذیر گلی میں اس کا بستہ اپنے گلے میں ڈالتا اور اسے سائیکل پر اپنے آگے بٹھاتا تو وہ اوپر تین منزل اوپر دیکھ رہا ہوتا اور میں وہاں سے نیچے دیکھ رہا ہوتا اور جونہی اس کی نظر مجھ پر پڑتی تو ایسی دلدوز آواز میں ''ابو میں نے ٹول نہیں جانا'' کا اشک آور الاپ شروع کر دیتا.. اکثر میں اپنے دل پر پتھر رکھ کر پیچھے ہو جاتا تا کہ وہ مجھے دیکھ نہ سکے اور کبھی کبھار بھیگتی آنکھوں سے بابا نذیر کو کہتا.. بابا اسے سکول نہ لے جاؤ.. بلکہ لکشمی مینشن کے ہمسائے بھی سفارش کرتے کہ بچہ رو رو کر ہچکیاں بھرتے ہلکان ہو رہا ہے کہ میں نے ٹول نہیں جانا تو آج نہ بھیجیں ٹول..

اور وہی بچہ.. اگرچہ ڈپلومیٹ ہو چکا تھا لیکن اب بھی وہی تھا.. کہ ابو.. میں نے ابھی نہیں جانا..

پھر پہلی منزل پر لگائے ہوئے اس کے کیمپ آفس سے اس کے ماتحت افسر فائلوں کے انبار لے کر آنے لگے تو وہ مجبوراً اٹھ کھڑا ہوا اور اٹھتے ہی ایک خرگوش کی طرح چوکنا اور ہوشیار ہوا' لمحوں میں تیار ہو کر نیچے اپنے آفس میں جا براجمان ہوا.. چونکہ اس نے پورا دن وہاں براجمانی کرنی تھی اس لیے مدینے کی سیر میں وہ ہمارا ساتھ دینے سے قاصر تھا..

ہم تیار ہو کر نیچے گئے تو نیچے گُڈ اولڈ مولا بخش ہمارا منتظر تھا.. اپنی گھنی مولا بخشی مونچھوں کے ساتھ مسکراتا.. سائیں سائیں کرتا..

''آؤ سائیں مدینے چلیں..'' شاید اس کے ہاں ایک اور بچہ تولد ہوا تھا کہ وہ اتنا ہی خوش نظر آتا تھا جتنا حج کے زمانوں میں تھا.. ''سلجوق صاحب نے کہا ہے کہ مولا بخش میرے ابا جی مدینے میں ثواب کمانے نہیں آئے.. ان جگہوں کی تلاش میں آئے ہیں جہاں ہمارے تمہارے حضورؐ کے نقش قدم

ہیں تو سائیں آج اپنے ساتھ ایک فقیر کو لیتے ہیں۔"

"کونسا فقیر..؟"

"ہے ایک محمد فقیر.. تو نصلیٹ کی جانب سے اسے ہزار دو ہزار ریال ماہانہ صرف اس لیے ملتے ہیں کہ وہ یہاں آنے والے صاحب لوگوں کو مدینے کی زیارات کا چکر لگوائے.. اتنا فقیر نہیں ہے.."

مولا بخش کے لہجے سے عیاں تھا کہ وہ اُس فقیر کے لیے دل میں اگر کوئی گوشہ رکھتا ہے تو وہ اتنا نرم نہیں ہے..

"میں نے اسے فون پر بتا دیا تھا کہ نائب قونصل صاحب کے اماں اور ابا آئے ہیں تو اس نے بولا کہ ابھی آدھے گھنٹے بعد آنا میں تیار ہو جاؤں۔"

چنانچہ اُس فقیر کو تیاری کی مہلت دینے کے لیے ہم اِدھر اُدھر بے مقصد گھومتے رہے اور پھر ایک شاہراہ پر گامزن ہوئے.. اس شاہراہ کو چھوڑا تو ایک بستی میں آ گئے..

اور پھر اس غریبانہ سی بستی کہ فقیر ایسی ہی بستیوں میں بھلے لگتے ہیں ہم ایک گلی کے باہر جا رکے.. مکان اندرون لاہور کی مانند قدیم تو نہیں لیکن آپس میں جڑے ہوئے.. بدتمیز سے مدنی بچے ہماری کار کے گرد منڈلانے لگے اور چند مرغیاں جو بے دھیانی میں کٹ کٹ کرتی پھرتی تھیں ہماری طرف متوجہ ہو گئیں..

کچھ دیر انتظار کیا.. بہت سا صبر کیا کہ مدینے میں صرف ایک دن ہو اور بابا کے راستوں کی دھول سانسوں میں اتارنے کی چاہت ہو تو صبر ہوتا نہیں..

بالآخر بابا فقیر محمد گلی میں سے برآمد ہوئے.. اور نہایت پاکیزہ اگرچہ رعب والے گیٹ اپ میں برآمد ہوئے.. خاصے عمر رسیدہ فقیر تھے.. سر پر ایک سفید براق پگڑی نہایت پیچیدگی سے بندھی ہوئی.. کرتہ اور سفید کھڑ کھڑاتا تہبند.. پاؤں میں ملتانی کھسہ اور ہاتھ میں ایک عصا.. ٹیکتے ہوئے آئے..

میں نے نہایت احترام سے انہیں اگلی نشست پر بٹھایا اور بصد ادب کار کا دروازہ بند کیا.. پہلی بار بند کیا تو ان کے لہراتے تہبند کا ایک پلو باہر رہ گیا.. ان کے سمٹنے پر دوبارہ بند کیا اور پچھلی نشست پر میمونہ کے پہلو میں آ بیٹھا..

میں نے دیکھا کہ مولا بخش نے میرے اس احترام اور ادب کو تحسین سے نہ دیکھا..

ہم اس غریبانہ بستی سے باہر آ گئے..

فقیر بابا کے دانت نہیں تھے..

اگر تھے تو نہ دکھائی دیتے تھے نہ سنائی دیتے تھے..

انہوں نے فوری طور پر ایک تعارفی لیکچر کا آغاز کر دیا کہ وہ کیسے پچھلے چالیس برسوں سے کن کن وی آئی پیز کی.. کیسے کیسے وزرائے اعظم اور صدور کی میزبانی کر چکے تھے اور انہیں کیسے کیسے تحائف سے نوازا گیا تھا اور اب اگر ان پر یہ بُرا دن آ گیا تھا کہ ایک نہایت جونیئر ڈپلومیٹ کے والدین کو انہیں مدینہ دکھانا پڑ گیا تھا تو یہ ان کے لیے کچھ ذریعہ عزت نہیں تھا..

ان کی مسلسل باتیں مکمل طور پر ہمارے پلے نہیں پڑ رہی تھیں..

وہ ایک پوپلے انداز میں.. ملتانی لہجے میں کہ وہ ملتان کے باسی تھے بولتے چلے جاتے تھے اور تاریخ اسلام کے عمومی واقعات نہایت رقت سے بیان کرتے چلے جاتے تھے.. بالآخر میں ان کے احترام کی مناسب حدوں کو پار کر گیا اور پار جا کر میں نے گزارش کی "بابا فقیر.. یہ میں سب جانتا ہوں.. کچھ شد بد رکھتا ہوں.. آپ براہ کرم ہمیں ان مقامات تک لے جائیے جہاں حضورؐ کے حوالے روشن ہیں۔"

اس پر بابا فقیر نے بے حد بُرا مانا "میں آپ کو وہی تو بتا رہا ہوں.. صبر کیوں نہیں کرتے.."

صد شکر کہ انہوں نے میمونہ کو نہیں پہچانا تھا..

"حج کے بعد جب سلجوق مجھے مدینے لے کر آیا تھا تو.. یہی بابا فقیر تھا" میمونہ نے نہایت دھیمی آواز میں مجھے مطلع کیا اگرچہ اسے اس احتیاط کی چنداں حاجت نہ تھی کہ فقیر بابا سننے والے تو تھے نہیں.. بولنے والے تھے.. "لیکن تب ان کے دو چار دانت سلامت تھے اور جو کچھ کہتے تھے کچھ نہ کچھ پلے پڑ جاتا تھا.. اب پتہ نہیں کیا کہے چلے جا رہے ہیں۔"

ویسے فقیر بابا تاریخ جانتے تھے.. اور جہاں کہیں کوئی فقرہ پلے پڑ جاتا تھا اس میں مدینے کی تاریخ اور صحابہ کرامؓ کے شب و روز سے شناسائی جھلک جاتی تھی..

ان دنوں جب میں سُمیر کے ہمراہ ادھر آیا تھا تو فروری کے موسم تھے اور مدینے کے موسم بھی کیا موسم تھے.. لیکن اب اکتوبر کے اوائل میں بھی دھوپ کی تیزی گھائل کر دینے والی تھی..

ایک جدہ سٹائل.. فیشن گھروں.. شاپنگ مالز اور غیر ملکی ریستورانوں سے بھری پُری سڑک پر سے گزرے تو مولا بخش نے فقیر بابا کے مسلسل لیکچر میں دخل انداز ہو کر کہا "صاحب یہ ادھر مدینے کی انار کلی ہے.. مدینے کے لوگ ادھر سیر کرتے ہیں.. شاپنگ کرتے ہیں، ان کی خواتین یورپ کے لباس خریدتی ہیں.. کھاتے پیتے ہیں اور بہت موج کرتے ہیں۔"

ہمارے نادان اور عقیدت سے اندھے ذہنوں میں تو یہی تصویر ابھرتی تھی کہ اہل مدینہ ہمہ وقت تسبیح و تلاوت میں مگن درود پڑھتے "مسجد نبویؐ کے پھیرے لگاتے.. مقامات مقدسہ کے طواف کرتے

زندگی کرتے ہوں گے تو یہ سن کر قدرے حیرت ہوئی کہ مدنی بھی شاپنگ مالز میں گھومتے ہیں' ریستورانوں میں ڈائن آؤٹ کرتے ہیں اور ان کی خواتین بھی فرانسیسی زیر جامہ شوق سے خریدتی اور پہنتی ہیں.. حیرت بھی ہوئی اور ایک دھچکا بھی لگا..

مولا بخش ایک زیرک شخص تھا..

بابا فقیر کو موصول کرنے سے پیشتر جب ہم بے مقصد گھومتے تھے اور میں نے سرسری طور پر شکایت کی تھی یہاں ان تمام آثار کو مٹایا جا رہا ہے' جو ہماری تاریخ کی گواہی دیتے ہیں اور کسی کو کچھ پروا نہیں تو..

اس نے ایک نہایت پتے کی بات کی.. کہنے لگا "صاحب ان لوگوں کے پیٹ بھرے ہوئے ہیں' بھوکے تو ہم ہیں.. ہم پیاسے ہیں ناں اس لیے ان مقامات کے مٹنے کا ہمیں دکھ ہوتا ہے.."

مولا بخش کی بات میں وزن تھا.. مجھے خیال یہ آیا کہ اگر میں مدینے کا باسی ہوتا.. سعودی سلطنت کا ایک شہری ہوتا تو کیا میرا پیٹ بھی بھرا ہوا ہوتا.. مجھے کچھ پروا نہ ہوتی کہ قدیم نشانیاں مٹائی جا رہی ہیں.. حوالے نابود ہو رہے ہیں.. میں بے اثر رہتا..؟ اس کا جواب شدید نفی میں تھا.. نسبت روڈ کے چوک میں ایک بہت قدیم اور گھنا برگد تھا' جس کے تلے گھوڑوں کے پانی پینے کے لیے ایک پتھریلی ناند تھی.. مسافر شدید گرمیوں میں اس برگد کے سائے میں آرام کرتے.. پھر وہ برگد ترقی اور وسعت کی راہ میں رکاوٹ ہوا تو اسے کاٹ دیا گیا.. بہت برس ہو گئے ہیں اسے معدوم ہوئے لیکن مجھے آج بھی اس کا خیال آتا ہے تو میں مغموم ہو جاتا ہوں.. اس چوک سے گزرتا ہوں تو ہر بار رنج سے دوچار ہوتا ہوں.. اگرچہ میں لاہور کا باسی تھا' میرا پیٹ بھرا ہوا تھا.. وہ تو ایک معمولی سا برگد تھا.. تو اس کی نشانیاں جس کی گھنی چھاؤں عمر بھر سایہ کرتی ہے تو اس برگد کے حوالے معدوم ہوتے جاتے تو میرا دل ضرور کٹتا' چاہے میں مدینے کا رہنے والا ہوتا..

بابا فقیر نے مجھے صبر کی تلقین کی تھی' چنانچہ جب بہت صبر ہو چکا تو میں پھر بے صبر ہوا اور ان سے گزارش کی کہ بابا.. کچھ تو بتاؤ کہ ہم جا کہاں رہے ہیں.. کون سے مقام کی زیارت پہلے کریں گے تو بابا نے اپنے لیکچر میں وقفہ ڈال کر قدرے ناراضی سے کہا "بابا ہم پہلے امت المومنین حضرت ماریہ قبطیہ کے گھر جا رہیں گے.."

"سبحان اللہ.." میں نے بے اختیار کہا کہ یہ ماں میری بہت ہی پسندیدہ تھیں..

امہات المومنین میں سے صرف حضرت ماریہ قبطیہ تھیں جو مسجد نبویؐ سے ملحقہ حجروں میں حضورؐ کی دوسری بیویوں کے ہمراہ نہ رہتی تھیں.. حضورؐ نے ان کے لیے مدینہ میں ایک الگ مکان کا

بندوبست کر رکھا تھا.. کیوں؟ شاید اس لیے کہ وہ ایک کنیز تھیں' سیاہ فام تھیں' نہیں حضورؐ کے نزدیک نہیں کہ وہ تو رنگ و نسل کے امتیاز کو مٹانے والے تھے.. شاید گھریلو رقابتیں تھیں.. لیکن انہی ماریہ قبطیہ کو ایک ایسا شرف حاصل ہوا کہ وہ سب میں ممتاز ہو گئیں کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے بعد صرف انہوں نے حضورؐ کی گود ایک بیٹے حضرت ابراہیم سے بھری..

روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اپنی خادمہ سے کہا کہ "چل مجھے وہ عورت تو دکھا جسے رسول اللہؐ نے پسند کیا ہے".. کہتے ہیں اس لمحے حضرت ماریہ قبطیہ اپنے گھنے اور سیاہ بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے انہیں دیکھ کر کہا.. "ہاں یہ ایسی ہے کہ اسے پسند کیا جا سکے.."

ہم شاہراہ سے ہٹ کر.. ایک ویران سے علاقے میں گئے.. ایک چوڑی اور دھول آلود گلی تھی.. مولا بخش نے فقیر بابا کا اشارہ پا کر کار روک دی..

یہاں تو کوئی مکان نہ تھا.. کوئی کھنڈر کوئی نشان نہ تھا.. ہم ایک دیوار کے سائے میں کھڑے تھے.. جو ایک چاردیواری کا حصہ معلوم پڑتی تھی..

"یہی وہ مقام ہے.." فقیر بابا نے پوپلاہٹ میں لفظ گھولتے ہوئے بتایا..

"یہاں تو بس یہ دیوار ہے.." دھوپ تیز تھی..

"تو وہ مقام اس دیوار کے اندر ہے ناں.." بابا فقیر جھنجھلا گئے.. "اب یہاں ایک قبرستان ہے چاردیواری کے اندر.. مکان تو نہیں ہے ناں لیکن مقام یہی ہے.."

"ہم قبرستان کے اندر جا سکتے ہیں..؟"

"اجازت نہیں.."

"کہیں سے اندر جھانک بھی نہیں سکتے؟"

"نہیں.."

میں بھی جھنجھلا گیا کہ عجیب فقیر ہے نہ اندر جا سکتے ہیں نہ جھانک سکتے ہیں تو یہاں آنے سے فائدہ.. پھر جنت البقیع کے بارے میں جو قیاس میں نے کیا تھا اسی نے ہاتھ تھاما.. کہ بے شک نشاندہی نہیں ہو سکتی.. تعین نہیں کیا جا سکتا لیکن کیا یہ احساس کافی نہیں ہے کہ وہ مکان یہیں کہیں ہوا کرتا تھا.. دیکھ تو نہیں سکتے تھے اس مقام کو لیکن اس کی قربت میں چشم تصور کو یہ تو کہہ سکتے تھے کہ ذرا اس منظر کو تخلیق کر دے جب یہاں کوئی حجرہ ہوا کرتا تھا.. شاید کچی اینٹوں کا.. ہو سکتا ہے مدینے کے آتش فشانی پتھروں کا.. جس پر کھجور کے تنوں کی چھت تھی اور آنگن میں حضرت ماریہ قبطیہ اپنے سیاہ بال سنوارتی تھیں

اور یہیں کہیں حضرت عائشہ صدیقہؓ انہیں رشک سے دیکھتی تھیں.. اور یہیں حضورؐ تشریف لایا کرتے تھے.. اس نظر نہ آنے والے قبرستان کے اندر.. اس کے کسی حصے میں جواب قبروں سے ڈھکا ہوا ہے.. وہ دیار تھا جہاں حضورؐ نے اپنے آخری بیٹے حضرت ابراہیم کی ولادت پر انہیں گود میں لے کر چوما ہوگا کہ وہ آخری عمر کی اولاد تھے اور حضورؐ کو اولادِ نرینہ کی بے حد چاہت تھی..

روایت ہے کہ حضرت ابراہیم اپنے باپ کی شکل کے تھے اور اگر وہ زندہ رہتے تو حضورؐ کی عمر کو پہنچ کر حضورؐ جیسے ہی ہو جاتے.. ایسے کہ جن صحابہ کرامؓ نے طویل عمریں پائیں وہ انہیں دیکھتے تو دھوکا کھا جاتے.. ان کی شکل اتنی مشابہ تھی..

میں پہلے بھی ابن ہشام کا حوالہ دے چکا ہوں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

"مدرہ کے کالے کلوٹے گھونگھریالے بال والے ذمیوں (حبشیوں) کے بارے میں اللہ سے ڈرو کیونکہ اُن سے میرا نسب کا رشتہ بھی ہے اور سمدھیانا بھی۔"

یعنی نسب اس طرح کہ حضرت ہاجرہ انہی حبشیوں کے خاندان سے تھیں اور بقول ہشام ابراہیم کی والدہ ماریہ رسول اللہؐ کی کنیز تھیں جنہیں مقوقس نے آپ کے لیے ضلع انصبا کے مقام حفن سے بہ طور ہدیہ بھیجا تھا..

اسی طور ابن اسحاق نے محمد بن مسلم کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا...

"جب تم مصر فتح کرو تو اس کے رہنے والوں سے نیکی کا برتاؤ کرنے کی وصیت یاد رکھنا کیونکہ ان کے متعلق ایک قسم کی ذمہ داری ہے اور ان سے قرابت ہے۔"

کونسی قرابت؟.. اماں ہاجرہ کی اور حضرت ماریہ قبطیہ کی بھی... ایک پورے ملک سے نیکی کا برتاؤ کرنے کی وصیت ہمارے حضورؐ کرتے ہیں، حضرت ابراہیم کی والدہ کے ناتے سے.. تو کیا وہ سب سے متاثر نہ ہو گئیں..

ہم یونہی بے مقصد.. میں اور میمونہ قبرستان کی دیوار کو تکتے تھے..

آس پاس کوئی آبادی نہ تھی اور نہ ہی کسی نفس کا وہاں سے گزر ہوا.. اگر کچھ دکھائی دے جائے.. کوئی نشانی نظر آ جائے تو انسان وہاں کھڑا ہو کر کچھ دیر اسے نظر میں اتارتا ہے اور چلا جاتا ہے.. اور

جہاں کچھ بھی نہ ہو.. صرف ایک دیوار ہو اور دھوپ ہو وہاں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ابھی ٹھہریں یا چلے جائیں..

جہاں ہماری کار ساکت تھی اور مولا بخش دھوپ میں جلتا تھا اُس کے برابر میں ایک ٹیلہ تھا.. قدرتی نہ تھا کسی عمارت کے ملبے سے وجود میں آیا تھا اور اس کے اوپر میں نے چند ایرانی زائرین کو دھوپ میں نمایاں ہوتے دیکھا.. سیاہ پوش عورتیں.. بڑھی ہوئی داڑھیوں والے درمیانی قامتوں کے ذرا فربہ کچھ مرد.. جنہیں اس بلند سطح سے چاردیواری کے اندر جو گورستان تھا وہ دکھائی دیتا تھا اور وہ اس کی جانب ہاتھ بلند کرتے کچھ پڑھتے تھے اور آہ وزاری کرتے تھے..

حج کے تجربے نے مجھے سمجھایا تھا کہ اگر کہیں.. کسی مقام پر.. کسی غیر معروف جگہ پر ایرانی زائرین جمع ہیں تو وہ وہاں بے وجہ نہیں ہیں.. وہاں کچھ نہ کچھ ہوتا ہے.. کبھی تاریخ ہوتی ہے اور کبھی صرف عقیدت..

میں اور میمونہ ذرا احتیاط کرتے سنبھلتے اُس ٹیلے پر چڑھ گئے..

ایک ایرانی ٹیلے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور نہ اسے دھوپ کی شدت ستاتی تھی اور نہ تن بدن سے نچڑتا پسینہ اور وہ قبرستان کی جانب ہاتھ اٹھا کر کبھی کچھ پڑھتا تھا اور کبھی تقریر کرنے لگتا تھا..

یہاں سے.. ہم چاردیواری سے بلند ہو کر قبرستان کو اپنی نظروں کے سامنے پاتے تھے.. وہی ادھر ادھر بکھرے چند پتھر.. کچھ مسمار شدہ قبروں کے آثار اور دھوپ..

جیسے کبھی شمال میں کسی کوہ نوردی کے دوران کوئی ہموار علاقہ سامنے آ جاتا ہے.. کہیں جھاڑیاں خودرو اور کہیں کہیں پتھر ابھرے ہوئے..

مرد آنسو پونچھتے تھے اور خواتین روئے چلی جا رہی تھیں..

دھوپ میں.. ایک ٹیلے پر.. مدینے میں.. ایک گمنام شہرِ خموشاں کے سامنے ایک ٹیلے پر سیاہ پوش خواتین ماتم میں مصروف تھیں.. وہ سر جھکائے بیٹھی تھیں اور اس شخص کی تقریر سنتی تھیں جو قبرستان کی جانب اشارہ کرتے کچھ بیان کرتا تھا.. بالآخر اس شخص نے.. بڑھی ہوئی داڑھی والے درمیانی عمر کے ایرانی نے چند دعائیں کر کے اختتام کیا تو میں نے.. اگرچہ وہ ہم دونوں کی موجودگی سے آگاہ ہو چکا تھا اور تقریر کے دوران کن انکھیوں سے ہمیں دیکھتا تھا کہ یہ کون ہیں جو یہاں تک آ گئے ہیں.. تو میں نے اردو اور فارسی کے چند لفظ جوڑ کر اس سے پوچھا کہ برادر اس مقام کی کیا اہمیت ہے جو آپ یہاں ماتم کرتے ہیں..

خوش قسمتی سے وہ میرا بے جوڑ فقرہ سمجھ گیا اور کہنے لگا "مادرِ امام رضا۔"

’’کہاں..‘‘

’’اُس نے قبرستان کی جانب اشارہ کیا کہ ’’وہاں‘‘ اور آنسو پونچھنے لگا..

مشہد کے امام رضا کے مرقد پر بہت برس پہلے میں نے بھی حاضری دی تھی.. جنہیں ایک روایت کے مطابق طوس کے دہقانوں نے شہید کیا تھا اور ایک اور روایت یوں ہے کہ انہیں اپنا ولی عہد مقرر کرنے کے باوجود مامون الرشید نے انگوروں میں زہر بھر کر ہلاک کرایا تھا..

کہاں جا رہے ہو؟.. مامون نے پوچھا تھا.. جب امام زہر آلود انگور کے خوشے کھا کر جانے لگے..

جہاں تم مجھے بھیجنا چاہتے ہو.. وہاں.. امام نے جواب دیا..

ان روایتوں کی تصدیق یا تردید میرے بس میں نہیں کہ یہ عقیدے کا معاملہ ہے..

میرے لیے یہ ایک خبر تھی کہ امام رضا کی والدہ یہاں مدینے میں اس قبرستان میں دفن ہیں..

میں نے اُس ایرانی کو اشاروں کنایوں اور بھولی بسری.. ماسٹر دین محمد کی پڑھائی ہوئی فارسی میں بتایا کہ میری معلومات... بلکہ بابا فقیر کی معلومات کے مطابق جہاں یہ قبرستان ہے وہاں حضرت ماریہ قبطیہ کا مکان ہوا کرتا تھا اور حضرت ابراہیم یہیں پیدا ہوئے تھے..

یہ ان سب ایرانیوں کے لیے ایک خبر تھی..

اور جب اُس ایرانی نے جس سے میں مخاطب تھا اُس نے مجھ سے منہ موڑ کر اپنے گروہ کے ساتھیوں کو یہ خبر سنائی تو وہ سب جو اب اطمینان سے بیٹھے تھے اور منرل واٹر کی بوتلوں سے گھونٹ گھونٹ پانی پیتے تھے پھر سے آہ و زاری کرنے لگے..

ان کی عقیدت اور افسوس کی کوئی حد نہ تھی..

مجھے قلق ہوا کہ میں نے خواہ مخواہ ان تک یہ اطلاع پہنچا کر انہیں مزید نڈھال کیا اور پھر ایک طمانیت بھی ہوئی کہ وہ یہ خبر عام بھی کریں گے اور لوگ آنے لگیں گے اور حضرت ماریہ اور حضرت ابراہیم کے مقام پیدائش کی جگہ یوں گمنام نہ رہے گی..

پھر اس ایرانی نے آبدیدہ ہو کر اپنے ساتھیوں کو ظاہر ہے فارسی میں ایک حکایت بیان کی کہ کیسے حضورؐ کے ایک زانو پر امام حسینؓ.. بقول اُس کے کوچک امام حسینؓ اور دوسرے زانو پر کوچک حضرت ابراہیم بیٹھے ہوئے تھے.. جب جبریل امین آئے اور انہوں نے کہا.. افسوس یہ دونوں زیادہ دیر تک نہیں رہیں گے..

یہ حکایت بھی غمناک اور پُر اثر تھی.. اور پھر سے آنسو بہہ نکلے..

میں نے اسے حکایت لکھنے کو اس لیے مناسب جانا ہے کہ میرے سرسری تاریخی مطالعے کے مطابق حضرت امام حسینؓ اور حضرت ابراہیم ہم عمر نہ تھے.. بہت فرق تھا.. لیکن عقیدت اکثر تاریخ اور حقیقت سے ماورا ہوتی ہے.. البتہ یہ بہر حال ایک حقیقت تھی کہ وہ دونوں زیادہ دیر نہ رہے.. ایک نے ایک برس اور چند ماہ کی عمر پائی اور حضورؐ نے اپنے ہاتھوں سے اسے دفن کیا.. اور دوسرے کی لاش بے گور و کفن رہی..

''کعب بن اشرف کا قلعہ.. بنونضیر کی بستی..
جہاں حضورؐ نے ایک پتھر سے ٹیک لگائی..''

مسکنِ ماریہ کے مقام سے نکلے تو پھر ہم بہت دور تک گئے..

مدینے کی حدود سے نکل گئے اور ایک طویل شاہراہ کے آخر میں سیاہ پہاڑیاں جو پہلے دھوپ کی.. گرمی کی شدت سے اٹھنے والی دھندلی لرزش میں آئی ہوئی ہواؤں میں ایک سراب کی مانند دکھائی دیتی تھیں، واضح ہوتی گئیں اور ہم ان کے قریب ہوتے گئے..

ان میں ایک کوہ بنوقریظہ تھی..

اور اس کی قربت میں ایک سیاہی مائل پہاڑ ''جبل النار'' نام کا تھا..

شاید ان زمانوں کی یادگار جب مدینے میں شدید زلزلہ آیا تھا اور آتش فشاں اُبل پڑے تھے.. عین ممکن ہے کہ اسی ''جبل النار'' نے لاوا اُگلا تھا اور اب یہ ایک سرد ہو چکا آتش فشاں پہاڑ تھا..

یہ علاقہ سعید بٹھان کا تھا.. کم از کم بابا فقیر کے بے دانت لہجے میں اس کا نام یہی سنائی دیا تھا..

آبادی کی نشانیاں بہت کم تھیں اور ویرانی کا آغاز تھا..

بابا فقیر نے اپنا عصا اٹھا کر مولا بخش کو رُکنے کا حکم دیا..

وہ رُک گیا..

دائیں ہاتھ پر شاہراہ سے کچھ فاصلے پر ایک کھنڈر تھا..

یہ یہودی قبیلہ بنونضیر کا علاقہ تھا..

کعب بن اشرف کا قلعہ تھا..

''دیکھو گی؟'' میں نے میمونہ سے دریافت کیا..

''میں نہیں دیکھتی یہودیوں کے قلعے..'' وہ دراصل دھوپ میں جانے سے گریزاں تھی..

''تو میں دیکھ کر آتا ہوں..''

''ٹھہرو صاحب..'' مولا بخش نے کار سٹارٹ کی اور اُسے شاہراہ سے اُتار کر کھنڈر کے قریب لے گیا تاکہ مجھے دھوپ میں زیادہ چلنا نہ پڑے..

کھنڈر قدرے بلند سطح پر تھا.. اس کے پس منظر میں ایک مختصر بیابانی کے پار مدینے کی بستیاں اور کھجوروں کے باغ دکھائی دے رہے تھے.. بائیں ہاتھ پر نشیب میں چند گھر ایک چھوٹے سے محلے کی صورت میں نظر آ رہے تھے اور ان کے برابر میں کھجوروں کا ایک جھنڈ تھا..

کھنڈر کے بائیں جانب اور وہ بھی نشیب میں کھجوروں کا ایک وسیع باغ تھا جس کے درخت ایک خاص ترتیب سے لگائے گئے تھے اور ان کے تلے جو زمین تھی وہ ہری بھری گھاس سے ڈھکی ہوئی تھی جس میں سے آب پاشی کی نالیاں ظاہر ہوتی تھیں.. کہیں دھوپ کا لشکارا نالیوں میں بہتے پانی کو آئینہ کر دیتا..

کھنڈر کے آغاز میں ایک زنگ آلود بورڈ آویزاں تھا جو ترکوں کے محکمۂ آثار قدیمہ کی یادگار تھا... یہ بورڈ بھی اپنے خستہ وجود کو زیادہ مدت تک نہ سہار سکے گا.. اس پر اینٹیکوئٹی ایکٹ 1372 کا کوئی حوالہ درج تھا..

کھنڈر کے اندر جانے لگا تو مولا بخش جو میرے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا کہنے لگا ''سائیں ادھر باہر سے ہی دیکھ لو.. اندر جانے کی اجازت نہیں.. کوئی شرطہ آ گیا تو اعتراض کرے گا''

''مولا بخش اس ویرانے میں اور اتنی دھوپ میں کوئی شرطہ ادھر کیسے آئے گا صرف یہ چیک کرنے کہ کوئی کیا دیکھ رہا ہے..''

''ادھر کیا دیکھو گے؟''

''ادھر کسی دیوار میں ایک پتھر ہے جس کے ساتھ ٹیک لگا کر بابا بیٹھے تھے.. وہ دیکھ کر آتا ہوں..''

کعب بن اشرف یا بنونضیر کے قلعے کے کھنڈر سوات کی بدھ خانقاہوں کے کھنڈروں ایسے تھے.. یہ زیادہ سے زیادہ تین چار کنال رقبے پر محیط تھا.. ہو سکتا ہے ابتدائی حالت میں یہ اس سے کہیں وسیع رقبے پر آباد ہو.. جیسے گندھارا عہد کی عمارتیں بڑے بڑے سلیٹی پتھروں سے تعمیر کی جاتی تھیں اس کی تعمیر کا انداز بھی وہی تھا.. بیشتر پتھر ان گھڑے تھے اور اسی سیاہ اور جلی ہوئی ہیئت کے تھے جو مدینے میں داخلے سے قبل دائیں ہاتھ پر بکھرے نظر آتے ہیں.. آتش فشانی پتھر تھے.. ایک جانب تین کمرے.. یا مختصر ہال کہ جن کی چھتیں ڈھے چکی تھیں اور مسمار شدہ دیواریں میرے قد سے اونچی نہ ہوتی تھیں..

درمیان میں ایک دالان اور ان کمروں کے سامنے اتنے ہی سائز کے تین اور کمروں کے کھنڈر.. ان میں ایک متروک شدہ کنویں کے بھی آثار تھے..

اس کے اندر قدم رکھتے ہی یہ خیال دامن گیر ہوتا ہے کہ ایک بار حضورؐ یہاں آئے تھے اور اس کی ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے تھے اور جان گئے تھے کہ بنو نضیر اوپر سے پتھر گرا کر انہیں ہلاک کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں تو وہ یک لخت وہاں سے اُٹھ گئے تھے..

یہ ایک ایسا کھنڈر تھا جہاں رونما ہونے والے واقعات کا تذکرہ قرآن پاک میں بھی آیا ہے..

اس تاریخی قلعے کے کھنڈروں کی.. میری معلومات کے مطابق کبھی باقاعدہ کھدائی نہیں کی گئی.. کہ اپنی تاریخ کے آثار میں سے کھوج لگانے کے لیے جو شوق' جستجو اور تدبیر درکار ہوتی ہے وہ سونے کے محلوں میں رہنے والے حکمرانوں کے خالی ذہنوں میں مقیم نہیں ہو سکتی.. اگر اس قلعے کے کھنڈر اور اس کے نواح کو کوئی جان مارشل.. مارٹی مور وہیلر یا دانی مل جائے تو مجھے یقین ہے کہ ان کی تہوں میں مٹی میں مدفون اب بھی وہ تیر اور تلواریں بے شک زنگ آلود بھربھری حالت میں اب بھی موجود ہوں گی جو بنو نضیر اور صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں میں رہی ہوں گی..

وہ تیر بھی جو اس قلعے کے محاصرے کے دوران حضورؐ کے خیمے تک پہنچتے اور اس میں چھید کرتے تھے..

میں کعب بن اشرف کے قلعے کے کھنڈروں میں اُس کے سیاہ پتھروں میں سے اُٹھتی ہوئی تاریخ کی حدت محسوس کرتا' تپتا تھا..

یہاں میں اپنے ایک شدید خدشے کا اظہار کرنا چاہتا ہوں..

بے شک چھوٹا منہ ہے لیکن بات اتنی بڑی ہے کہ اس پر دھیان کرنا چاہیے..

مجھے خدشہ ہے کہ آیندہ سو دو سو برسوں میں دیگر مذاہب کی مانند اسلام بھی ایک دیومالائی کہانی بن سکتا ہے.. جوں جوں اس کے آثار مٹتے چلے جائیں گے ہم حقیقت سے دور ہو کر داستانوں میں چلے جائیں گے..

تاریخ پر.. تاریخ کے آثار پر ہل چلا کر پھر وہاں سہاگا پھیر کر زمین کو ہموار ایسے کر دینے سے کہ وہاں سے گزرنے والے کو شائبہ بھی نہ ہو کہ یہاں ایسے مقام ایسے کھنڈر ایسے نشان موجود تھے جو اس کے عقیدے اور کتاب کی شہادت دے کر اسے پختہ کرتے تھے.. ایسا کرنے سے.. ایسے بے رحم عمل سے اپنے تئیں شرک کو مسمار کرنے والے یہ نہیں جانتے.. کہ آثار اور تاریخ کو منہدم کر دینے سے مذہب کے ایک دیومالائی داستان بن جانے کا خدشہ وجود میں آ جاتا ہے..

مثلاً.. اگر بنو نضیر کے قلعے کے یہ کھنڈر بھی مٹا دیے جاتے ہیں جیسا کہ دستور ہو چلا ہے تو آیندہ نسلیں جب تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے اسے اپنے تصور میں لائیں گی تو اُن کے سامنے کوئی تصویر نہ ہو گی.. شواہد نہ ہوں گے محض تصور ہو گا.. اور یہ تصور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ.. جذباتی وابستگی اور عقیدے کی عظمت کو وسعت دیتے ہوئے ایک ٹھوس حقیقت کی بجائے ایک دیومالا کی صورت اختیار کر جائے گا..

بنو نضیر کا یہ قلعہ اگرچہ تین چار کنال کے رقبے پر محیط ہے.. ایک بڑی حویلی جتنا بھی نہ ہو گا لیکن ہر شخص جب ایک قلعہ تصور کرے گا تو اپنے اپنے وطن میں جیسے قلعے ہوتے ہیں وہ اُنہی کا خیال کرے گا.. برصغیر کے باسی جب ''قلعہ'' کا تذکرہ پڑھیں گے تو اُن کے ذہنوں میں روہتاس۔ رائی کوٹ' لال قلعہ یا لاہور کا شاہی قلعہ ہی اُبھریں گے.. دیگر اقوام بھی اپنی تاریخ اور طرزِ تعمیر کے نمائندہ قلعے ہی تصور میں لائیں گی..

وہ تاریخ پڑھتے ہوئے اس تین چار کنال پر محیط قلعے کو بھی اپنے قلعوں کے معیار اور وسعت کے قریب لے جائیں گی.. جب اس کے کوئی آثار نہ ہوں گے.. کوئی حوالہ نہ ہو گا تو وقت گزرنے سے اس کا رقبہ بڑھتا چلا جائے گا.. اس کی فصیلیں بلند ہو کر آسمانوں کو چھونے لگیں گی.. اس کے برج اور مینار بے شمار ہو جائیں گے اور اس کے اندر یہودیوں کی چند سو نفری بے حساب سپاہ میں بدل جائے گی جو مسلمانوں کی یلغار کے آگے ہتھیار ڈال دے گی..

غرض کہ تاریخ اور حقیقت پیچھے رہ جائیں گے اور اُن کی جگہ ایک تصوراتی دیومالا جنم لے لے گی..

خیبر کے قلعے کے بارے میں ابھی سے ایک دیومالا جنم لے چکی ہے.. جب کہ اُس کا رقبہ بھی بنو نضیر کے اُس قلعے سے بڑھ کر نہیں اور اس کا دروازہ ابھی سے آسمان کو چھو رہا ہے..

ہمارا مذہب دیگر مذاہب سے یوں بھی ممتاز ہے کہ اس کی بنیاد حقیقت اور تاریخ ہے.. رسول اللہ کی حیات کا ہر لمحہ درج ہے.. ہر دن محفوظ ہے.. ہر مقام کی نشاندہی ہے.. جہاں وہ پیدا ہوئے تھے.. جس راستے پر اُنہیں گود میں اٹھائے ہوئے عبدالمطلب خانہ کعبہ کی جانب گئے تھے.. حلیمہ سعدیہ انہیں دودھ پلانے کے لیے کس قریہ میں لے کر گئی تھیں.. جبل حرا کی بلندی پر جو غار تھا وہاں پہنچنے کے لیے حضورؐ کونسا راستہ اختیار کرتے تھے اور کہاں اماں خدیجہ کا گھر تھا جس میں وہ کپکپاتے ہوئے آئے تھے اور انہیں سیاہ کمبل اوڑھایا گیا تھا.. صفا کی کس پہاڑی پر کھڑے ہو کر اُنہوں نے اپنے رسولؐ ہونے کا اعلان کیا تھا.. مدینے میں کون سے کنویں سے پانی پیا تھا.. قصویٰ کہاں بیٹھی تھی.. غرض کہ ہر لمحہ اور ہر مقام درج

ہے..اور یہ بھی کہ قرآن کی کون سی آیت کس حوالے سے کس مقام پر اُتری تھی..

اور اسی کھنڈر..بنو نضیر کے قلعے کے مختصر کھنڈر کے حوالے سے بھی تو اللہ کے فرمان اُترے تھے..

اس کھنڈر کے بھی مٹ جانے سے حوالہ کہاں سے آئے گا..

دیگر مذاہب کی بیشتر تاریخ اور اُن کے انبیاء کی حیات ایک دیومالائی قصے کی صورت اختیار کر چکی ہے..بے شک یہ بدھ ہوں..ہندو..یہودی یا عیسائی ان کی تاریخ اور ان کے پیغامبر قصے کہانیوں کے کردار نظر آتے ہیں..ان کے ہاں حقیقت اور آثار کے ثبوت نہ ہونے کے برابر ہیں..

ایک مدت تک ہیلن کی نسبت سے مشہور ٹرائے کا شہر دیومالا کے اندھیروں میں گم رہا اور بالآخر جب موجودہ ترکی میں اُس کے آثار دریافت ہوئے تو یہ کھلا کہ اُس کی فصیلیں اتنی بلند نہ تھیں جتنی بیان کی جاتی تھیں..اُس کے دروازے یا حفاظتی پھاٹک معمولی نوعیت کے تھے اور نہ ہی وہ اتنا وسیع اور پُرشکوہ شہر ہوا کرتا تھا جس کا تذکرہ ہومر کی داستانوں میں ملتا ہے..

کچھ اسی طور عظیم مہابھارت کی جنگ جو کوروؤں اور پانڈوں کے درمیان لڑی گئی اور جس کے نتیجے میں دنیا کی ایک بڑی رزمیہ داستان وجود میں آئی..ویسی ہرگز نہ تھی جیسی کہ اُس کی دیومالا میں بیان کی جاتی ہے..ولیم ڈل رمپل اپنی تصنیف ''سٹی آف جنز'' میں لکھتا ہے کہ اس جنگ میں ایٹمی اسلحہ ایسے تباہ کن ہتھیار اور پرواز کرتے ہوئے برباد کر دینے والے رتھ کے پہیوں کی بجائے صرف لاٹھیاں استعمال ہوئیں..آمنے سامنے ہو کر گھونسوں کا تبادلہ ہوا..لیکن نہ شواہد تھے اور نہ آثار تو لاٹھیاں تباہ کن ہتھیاروں میں بدل گئیں اور گھونسے مہلک پہیئے بن گئے..

مجھے بھی اسی قسم کا خدشہ ہے جس کا میں نے اظہار کر دیا..

مولا بخش مجھ پر کڑی نظر رکھتا تھا کہ یہ سائیں جوان کھنڈروں میں بھٹکتا ہے کہیں ادھر اُدھر نہ ہو جائے..اور یہ ہر پتھر کو ہاتھ لگا لگا کر کیا دیکھتا ہے..

بنو نضیر مدینہ کے یہودیوں میں سب سے اعلیٰ ذات کے سمجھے جاتے تھے..ڈاکٹر حمید اللہ کے مطابق ''نضیر'' تر و تازہ درخت یا پودے کو کہتے ہیں..وہ کامیاب کاشتکار اور باغبان تھے اور اُن کی بستی حرۃ واقم کے زرخیز علاقے وادیٔ بطحان سے ملحق تھی..یہ بستی مدینہ کے مرکز سے جنوب کی جانب تین میل کے فاصلے پر تھی اور اس کے گرد اعلیٰ ترین کھجور کے بڑے گھنے باغات تھے..

کعب بن اشرف اسی قبیلے بنو نضیر کا سردار تھا..جنگ بدر کے بعد اُس نے اپنی شعلہ بیان

شاعری سے قریش کو طیش دلایا کہ وہ ہر حال میں مسلمانوں سے بدلہ لیں..کعب نے بدر کے کنوئیں میں پھینکے جانے والے قریش کے سرداروں کا مرثیہ لکھا..خود روتا اور قریش کو رُلا کر اُن کی آتش انتقام تیز کرتا..

''بدر کے کولہو سے اس کے اپنے اقارب کا خون باہر آ رہا ہے..آؤ بدر کے واقعات پر روئیں اور آہ و بکا کریں وہاں بہترین لوگ اپنے ہی حوض کے گرد قتل کر دیئے گئے..ایسا بھی ہو ہی جایا کرتا ہے بادشاہ بھی کبھی بچھڑ ہی جایا کرتے ہیں..''

مدینہ واپس آ کر وہ مسلمان خواتین کے بارے میں نام لے لے کر فحش شعر کہتا اور دشنام کرتا..چنانچہ رسول اللہؐ نے فرمایا ''کون ہے جو کعب بن اشرف کی خبر لینے کی ہامی بھرتا ہے..''

حضرت محمد بن مسلمہ نے کہا ''آپ کی خاطر میں یہ کام کرنے کو تیار ہوں..میں اسے قتل کر دوں گا..''

''اگر تم ایسا کر سکو تو کر گزرو..'' رسول اللہؐ نے فرمایا..

''ہمیں اجازت دیں کہ ہم اُس سے کچھ حیلے بہانے کی باتیں کریں..''

فرمایا..''جو مناسب سمجھو کرو..''

مسلمہ کے ہمراہ ابو نائلہ بھی تھے جو کعب کے دودھ شریک بھائی تھے اس لیے وہ اُن پر مکمل اعتماد کرتا تھا..

آسمان پر چودھویں کا چاند روشن تھا..کعب بن اشرف کے قلعہ کے نیچے پہنچ کر ابو نائلہ نے اُسے آواز دی تو کعب کی نوبیاہتا بیوی نے اسے روکا..''اس وقت کہاں جا رہے ہو..جنگجو آدمی کے بہت دشمن ہوتے ہیں اسے رات کے وقت باہر نہیں جانا چاہیے..''

کعب نے اپنی بیوی سے کہا ''ابو نائلہ میرا بھائی ہے اُس نے مجھ سے آنے کا وعدہ کیا ہوا ہے..'' اور قلعہ سے باہر آ گیا..

ابو نائلہ نے کعب کے سر کو ہاتھ لگا کر پیار سے کہا ''کعب تو نے یہ کیسی خوشبو لگا رکھی ہے کہ رات بھی معطر ہو رہی ہے..'' کعب خوش ہو گیا کہ بھائی تعریف کر رہا ہے..ابو نائلہ نے اُسے بالوں سے پکڑ کر قابو کیا اور مسلمہ نے اس کے پیٹ میں چھری گھونپ دی اور اُس کا سر کاٹ کر ساتھ لے لیا..

اگلی صبح یہودیوں نے رسول اللہؐ سے شکایت کی ''ہمارا سردار کعب رات اپنے گھر سے نکلا تو اسے بغیر جرم کے دھوکے سے قتل کر دیا گیا..''

فرمایا: "اگر وہ بھی دیگر یہودیوں کی مانند عہد پر قائم رہتا تو نہ مارا جاتا.. اُس نے ہمیں اذیت پہنچائی اور ہمارے خلاف اشعار لکھے تھے.."

ایک بار رسول اللہؐ مقتولین کی دیت کے بارے میں مشورہ کرنے کے لیے بنونضیر کے قلعے میں تشریف لائے جب کہ اُن کے ہمراہ دس صحابہ کرام تھے جن میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ بن خطاب، حضرت علیؓ بن ابی طالب' حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ شامل تھے۔ حضورؐ ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے.. یہودیوں کو اپنے سردار کعب کا قتل یاد آ گیا..

حُیّی بن اخطب نے کہا "ایسا موقع پھر نہیں ملے گا' مکان کے اوپر سے پتھر گرا کر محمدؐ کو ختم کردو.."

عمر بن حجاش نے کہا' "یہ کام میں کرتا ہوں.. مکان کے اوپر سے میں محمدؐ کے اوپر پتھر گرا دیتا ہوں.."

اس سے پیشتر کہ وہ ایسا کرتے رسول اللہؐ اُن کے منصوبے سے آگاہ ہو گئے اور اپنے صحابہؓ سے کچھ کہے بغیر اُٹھ کر چلے گئے..

رسول اللہؐ نے بنونضیر کو پیغام بھیجا کہ تم نے اُس عہد کو توڑ دیا ہے جو تم نے کر رکھا تھا. تم اس شہر اور علاقے سے دس روز کے اندر نکل جاؤ..

جواب آیا "ہم اپنے اموال کبھی نہ چھوڑیں گے آپ سے جو ہو سکتا ہے کر لیں.. ہمارے پاس ایک سال کی خوراک اور بستی میں پانی کے کنویں موجود ہیں.."

بنونضیر کے قلعے کا محاصرہ شروع ہو گیا.. کمان حضرت ابوبکر صدیقؓ کو سونپی گئی.. فجر کی نماز کے لیے اذان حضرت بلالؓ نے دی اور انہوں نے حضورؐ کا خیمہ نصب کیا.. یہودیوں کے تیر خیمے تک آتے اُس میں چھید کرتے تھے' چنانچہ رسول اللہؐ نے اُسے پیچھے نصب کرنے کا حکم دیا.. جب آپؐ نے دیکھا کہ یہودی ہتھیار ڈالنے والے نہیں اور قلعے سے باہر آ کر مقابلہ نہیں کریں گے تو آپؐ نے اُن کے کھجوروں کے باغ کاٹ دینے کا حکم دیا..

بنونضیر نے احتجاج کیا' "آپؐ ہمارے پھل دار درخت کیوں کٹوا رہے ہیں؟ آپ تو زمین پر فساد پھیلانے سے منع کرتے تھے.."

اور وہ درست بھی کہتے تھے کہ رسول اللہؐ ہمیشہ جنگ کے دوران عورتوں اور بچوں کے قتل اور درختوں کو کاٹنے سے منع فرماتے تھے..

فرمایا' "تاکہ تمہاری آنکھیں کھل سکیں.. ورنہ تم جنگ کے شعلے بھڑکا کر اُس میں اپنی قوم کو دھکا کر

وسیلہ سے باز آ جاؤ.."

روایت کے مطابق یہودیوں نے کہا' "اے محمدؐ آپ تو دوسروں کو فساد کرنے سے منع کرتے تھے' پھر خود ہی ہمارے ہرے بھرے پودے کاٹ کر جلانا کہاں کا انصاف ہے.."

اس پر یہ آیات نازل ہوئیں..

"کھجوروں کے درخت جو تم نے کاٹ ڈالے یا اُن کو ہاتھ نہ لگایا اور بدستور اُن کو جڑ سمیت کھڑا رہنے دیا تو خدا ہی کے حکم سے تھا اور خدا کو منظور تھا کہ نافرمانوں کو رسوا کرے.."

یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور رسول اللہؐ نے نہ صرف اُن کی جاں بخشی کر دی بلکہ ایک اونٹ پر ہر خاندان جتنا سامان لے جا سکتا تھا' لے جانے کی اجازت دے دی..

بنونضیر کے شکست خوردہ مدینہ سے نکلے تو کچھ خیبر کے نزدیک آباد ہو گئے اور کچھ ملک شام کی جانب چلے گئے..

بنونضیر کے اسی قلعے اور بستی کے حوالے سے مزید آیات بھی نازل ہوئیں جن میں سورۂ حشر کی کچھ آیات بھی شامل ہیں..

چودہ سو برس بعد آج ایک حدت بھری دوپہر میں.. جب کہ شاہراہ کے قریب ایک کار کھڑی تھی جس میں میری بیوی اور فقیر محمد میرے منتظر تھے اور مولا بخش مجھ پر نظر رکھتا تھا.. میں بنونضیر کے اُسی قلعے کے کھنڈروں میں موجود تھا جس کے حوالے قرآن پاک میں آئے تھے اور اس کے نواح میں اور پتھروں کے ڈھیروں تلے جو زمین تھی اُس کے اندر وہ تیر پوشیدہ تھے جو حضورؐ کے خیمے میں چھید کرتے تھے اور وہ تلواریں اور بھالے موجود تھے جو بنونضیر کے کسی کام نہ آتے تھے..

اور یہاں ایک کنواں بھی تھا جس کے بارے میں بنونضیر نے حضورؐ کو پیغام بھیجا تھا کہ سال بھر کی خوراک کے علاوہ ہمارے پاس پانی بھی ہے..

اور دائیں جانب نشیب میں ایک ہرا بھرا کھجوروں کا ایک وسیع خوش نظر باغ بھی تھا اور غالب امکان تھا کہ وہی تھا جس کے چند درخت مسلمانوں نے کاٹ کر جلا دیے تھے اور چند جڑوں سمیت رہنے دیے تھے کہ اس قلعے کی بلندی سے یہ باغ پھیلا نظر آتا تھا. اس کے سوا دوسری جانب چند مکانوں کی قربت میں کھجور کے کچھ درخت سایہ کر رہے تھے.. تو باغ یہی ہو سکتا تھا..

میں کھنڈر سے نکل کر اس باغ میں اترنا چاہتا تھا لیکن مولا بخش نے سختی سے منع کر دیا' "سائیں

اس کا مالک بہت غصے والا ہے.. نیچے نہ جاؤ..''

یہودیوں نے جو کچھ بھی چھوڑا تھا اس کے لیے سوائے ایک شب خون کے مسلمانوں نے نہ قتال کیا تھا نہ گھوڑے دوڑائے تھے نہ تلواریں اور نیزے چلائے تھے اس لیے یہ مالِ غنیمت نہ تھا. اللہ اور اُس کے رسول کی ملکیت تھا.. رسولؐ نے انصار کے مشورے سے وہ باغات اور زمینیں مہاجرین میں تقسیم کر دیے..

انہی مہاجرین کی آل اولاد میں سے یہ غصیلا شیخ بھی ہو سکتا تھا..

اگرچہ میں اس باغ پر حقِ شفعہ کرنے کی قانونی پوزیشن میں تھا کہ میرے رسولؐ نے کھجوروں کا یہ باغ تمہارے اجداد کو عطا کیا تھا تو مجھے اتنا تو حق ہے کہ چند لمحے اس میں گزار سکوں.. اُن درختوں کے قریب ہو سکوں جن کا قرآن میں ذکر آیا ہے.. لیکن میں ایک غصیلے شیخ سے.. جو کہیں نظر تو نہ آتا تھا صرف اُس کی دہشت مولا بخش کو محسوس ہوتی تھی.. اُس شیخ سے کیا بحث کرتا کہ اُس کے اجداد مہاجرین میں سے تھے اور مکہ کے تھے اور وہ ابھی تک کھوروں تھے..

''میں نیچے نہیں جاتا مولا بخش.. آپ کچھ غم نہ کرو..''

''آپ کا تو کچھ غم نہیں سائیں.. پر جو بابا فقیر ہے وہ کہتا ہے کہ مجھے بہت پیاس لگی ہے..''

''تو اس قلعے کے نیچے جو بستی نظر آتی ہے وہاں سے اُسے پانی لا دو کہ بنو نضیر کے قلعے کا یہ کنواں تو پتھروں سے بھرا ہوا ہے..''

''سائیں وہ پانی نہیں پیتا.. بابا فقیر صرف سیون اپ پیتا ہے اور وہ بھی امریکی ٹین والا.. تو میں اُس کا کچھ بندوبست کرتا ہوں پر نیچے کھجوروں کے باغ میں نہ اُتر جانا.. وہ شیخ بہت غصے والا ہے..''

مولا بخش چلا گیا..

اسلام کے اوّلین ایام کی تاریخ.. مسمار شدہ دیواریں.. سیاہ پتھر.. اینٹ روڑے.. اور ایک گرم دوپہر..

بنو نضیر کے اس قلعے کے کھنڈروں نے مجھ میں چودہ سو برس پیشتر کی حیرت جگائی.. کہ کیا یہ اب بھی موجود ہے..

کیا یہ وہی باغ ہے جس کے تذکرے ہماری کتاب میں ہیں..

جہاں ہماری نگاہ کھڑی ہے.. یہ مقام وہ مقام بھی ہو سکتا ہے جہاں تیروں سے چھلنی حضورؐ کا خیمہ ایستادہ تھا..

اور یہیں کہیں [illegible] اس کے نواح میں.. جس کے ساتھ [illegible] لگا کر

حضورؐ بیٹھے تھے..

تو کیوں نہ ہر پتھر کو ہاتھوں سے چھو لیا جائے..

کچھ حرج نہیں..

کوئی تنبیہ کرنے والا بھی تو آس پاس موجود نہیں تو کیوں نہ کچھ شرک کر لیا جائے..

اور میں نے بہت شرک کیا..

''بنو قریضہ کے آثار.. حضرت لبابہ کی پشیمانی''

''سائیں یہ بنو قریضہ کا علاقہ ہے..''

''بنو قریضہ؟''

''یہودی تھے سائیں.. بہت طاقتور تھے..''

وہاں جدھر مولا بخش بریک پر پاؤں رکھے بغیر گزرتا جاتا تھا وہاں کوئی آثار تو نہ تھے.. ایک دیوار کے عقب میں کھجوروں کے چند بوٹے تھے جو بنو قریضہ کے اگرچہ کمتر لیکن طاقتور قبیلے کی اجڑتی نشانیاں تھیں.. یہاں بھی ترکوں نے ایک مسجد بنائی تھی جو اہلِ نظر نے ڈھا دی تھی' بھلا یہودیوں کی نشانیاں کیا رکھنی..

''جہاں حضرت لبابہ آئے تھے؟''

''اللہ بھلا کرے'' فقیر بابا خوش ہو گئے.. ''جی ہاں.. جہاں لبابہ یہودیوں کو سمجھانے آئے تھے اور انہیں اشارے سے بتا دیا کہ تم چاہے ہتھیار ڈال دو تمہیں قتل کر دیا جائے گا.. اس راز کو افشا کر دینے پر اتنے شرمندہ ہوئے کہ اپنے آپ کو مسجد نبویؐ کے ایک ستون سے باندھ دیا کہ جب تک معافی نہیں ملے گی.. یونہی بندھا رہوں گا.. انہیں صرف نماز کے اوقات میں کھولا جاتا تھا.. پھر حضورؐ نے اُن کی معافی کی خوشخبری دی اور اُن کی رسیاں اپنے ہاتھوں سے کھولیں..''

مسجد نبویؐ میں میں نے اُس ستون کی شناخت کی تھی اور اُس کی قربت میں نفل ادا کیے تھے اور حضرت لبابہ کی پشیمانی محسوس کی تھی.

''بنو قریضہ کی بستی مدینہ کے جنوب میں مہرور کے قریب تھی.. عربی میں قریضہ اُس درخت کو کہتے ہیں جو کہ خاص طور پر چمڑہ رنگنے کے کام آتا ہے.. بنو قریضہ کا پیشہ باغبانی کے علاوہ جوتے بنانا اور بیچنا تھا.. یعنی موچی تھا اور اسی لیے دیگر یہودی انہیں حقیر جانتے تھے..''

یہاں مجھے تقریباً پینتالیس برس کا ایک حوالہ.. بنو قریضہ کا نام سن کر یاد آیا..

انگلستان میں میرا ایک یہودی ہم جماعت ہوا کرتا تھا.. وہ اتنا زیرک اور وسیع علم رکھنے والا شخص تھا کہ ہم سب مسلمان اُس سے عاجز آ جاتے تھے.. بحث نہیں کر سکتے تھے.. اور مجھے یاد ہے کہ وہ مدینہ کے یہودی قبائل کا ذکر کرتے ہوئے بنو قریضہ کے دردناک انجام کا حوالہ دیا کرتا تھا.. اور کہا کرتا تھا کہ:

یاد رکھو! مدینہ دراصل ہم یہودیوں کا یثرب تھا جہاں سے تم نے ہمیں نکال دیا.. اور یاد رکھو! ایک روز ہم وہاں واپس جائیں گے.. اور ہم سب پاکستانی' سوڈانی اور عرب اشتعال میں آ جاتے تھے کہ یہ کیا بکواس کر رہا ہے..

لیکن اب اتنے برس بعد میں سوچتا ہوں کہ ہماری جو حالت ہے اگر اسرائیل تہیہ کر لے تو اُس کی راہ میں کوئی رکاوٹ ہے؟.. ہم زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ اپنے غم و غصے کا اظہار کریں گے.. احتجاج کریں گے.. جلوس نکالیں گے.. کچھ غیر ملکی اداروں اور ریستورانوں کی عمارتیں جلا دیں گے.. صدمے میں آ کر چند سو افراد خودکشی کریں گے.. اس کے سوا اور کیا کریں گے؟

وہی کچھ کریں گے جو بیت المقدس کے چھن جانے پر کر رہے ہیں.. اور کیا کریں گے؟..

بنو نضیر کا مسئلہ تو حل ہو گیا تھا.. بنو قریضہ کا معاملہ ابھی باقی تھا..

اللہ کے رسولؐ نے مدینہ میں اپنا نائب نابینا حضرت ابن ام مکتوم کو مقرر فرمایا.. جھنڈا حضرت علیؓ کو دیا اور انہیں ایک دستے کے ساتھ بنو قریضہ کی بستی کی طرف روانہ کر دیا..

رسولؐ اللہ خود بنو قریضہ کے قلعے کی دیواروں کے نیچے گئے اور انہیں پکارا..

''اے ابوالقاسم کیا چاہتے ہو؟'' بنو قریضہ کے سردار نے فصیل پر سے پوچھا اور حضورؐ کی مصالحت آمیز گفتگو کے باوجود کہا ''ابوالقاسم آپ اِدھر اُدھر کی فضول باتیں نہ کریں.. ہم آپ کے سامنے جھکنے والے نہیں..''

جب محاصرہ طویل ہو گیا اور بنو قریضہ کی مدد کو اور کوئی قبیلہ نہ پہنچا تو انہوں نے بنو نضیر والی شرائط پر مدینہ چھوڑ دینے کی اجازت چاہی.. یہ درخواست مسترد کر دی گئی اور حضورؐ نے فرمایا.. تمہیں غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنا ہوں گے..

اسی موقع پر ابولبابہ نے اپنے ہاتھ سے اپنے حلق کی طرف اشارہ کر کے اور اُس پر انگلیاں

پھیر کر یہودیوں کو بتایا تھا کہ انہیں ہر حال میں قتل کر دیا جائے گا..

بنو قریظہ نے ہتھیار ڈال دیئے تو جنگ کے قوانین کے مطابق اُن کے اجتماعی قتل کا فیصلہ صادر کر دیا گیا.. رسولؐ اللہ کے حکم پر مدینہ کے بازار میں لمبے اور گہرے گڑھے کھدوائے گئے' یہودی مردوں کو ٹولیوں کی صورت میں لایا جاتا تھا اور ان گڑھوں کے کنارے بٹھا کر ان کی گردنیں اڑا دی جاتی تھیں..

اُن کے بچوں اور عورتوں کو غلام بنا کر فروخت کر دیا گیا..

بنو قریظہ کے کتنے افراد کو قتل کر دیا گیا؟ اس بارے میں اختلاف ہے.. یہ تعداد ساڑھے چار سو سے نو سو تک بتائی گئی ہے.. زمانہ جدید کی تحقیق کے مطابق بنو قریظہ کے سب مردوں کو بلا امتیاز قتل نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی اُن کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر فروخت کیا گیا تھا.. جب کہ بعض اس بنا پر اس تحقیق کو قبول کرنے سے انکاری ہیں کہ قدیم ماخذ اور صحیح اسناد کے ساتھ بیان کی گئی روایات یہودیوں کے قتل کی تصدیق کرتی ہیں..

البتہ یہ مستند ہے کہ بنو قریظہ نے نہایت دلاوری سے موت کا سامنا کیا..

ایک یہودی بوڑھے زبیر کا ثابت بن قیس پر ایک احسان تھا جس کے بدلے میں ثابت نے رسول علیہ ﷺ سے اُس کی جاں بخشی کی سفارش کی جو قبول کر لی گئی.. زبیر نے اپنے بڑھاپے کا حوالہ دیا کہ میں اس عمر میں اپنے بیوی بچوں کے بغیر کیسے جیوں گا.. انہیں بھی آزاد کر دیا گیا اور اُس کی جائیداد بھی واپس کر دی گئی.. اس آزادی کے بعد جب زبیر کے دریافت کرنے پر اُسے یہ معلوم ہوا کہ اُس کے قبیلے کے تمام دوست اور سردار قتل ہو چکے ہیں تو اُس نے ثابت سے کہا "تو میرے احسان کے بدلے مجھے میری قوم سے ملا دے واللہ اُن کے بغیر جینے کا کچھ لطف نہیں.. میں اپنے ساتھیوں سے مل جانے کا آرزو مند ہوں اور اتنی تاخیر بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ جتنے وقت میں پانی سے لبریز ڈول سے پیالہ بھرا جاتا ہے" ثابت کو یہ درخواست قبول کرنی پڑی اور اسے قتل کر دیا..

اسی طرح بنو قریظہ کی ایک خاتون حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی اور خوب ہنس رہی تھی اور جب اُس کے قتل کی باری آئی کہ اُس نے چھت سے چکی کا ایک پاٹ گرا کر حضرت خلاد بن سوید کو شہید کیا تھا اور اُسے پکارا گیا تو وہ ہنس کر بولی "خدا کی قسم میں موجود ہوں.."

بقول ہیکل اُس نے نہایت دلاوری سے جان دی اور حضرت عائشہؓ نے فرمایا "واللہ میں اُس عورت کو نہیں بھلا سکتی جو قتل میں خوش و خرم آئی اور ہنستے ہوئے اپنی گردن جلاد کے آگے رکھ دی.."

بنو قریظہ کے تمام مردوں کا اجتماعی قتل اور عورتوں اور بچوں کو فروخت کر دینے والا معاملہ ایک

عرصے سے اختلافی چلا آتا ہے..

ابن کثیر کے مطابق بنو قریظہ نے زبردست لڑائی کے بعد ہتھیار ڈالے تھے اور نہایت شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا.. حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ کی قیادت میں جب حملہ کیا گیا تو بنو قریظہ نے بڑی جی داری سے مزاحمت کی تھی اور اُن کے سردار بہت بے خوفی اور بہادری سے لڑے تھے.. اور صرف ہتھیار نہ ڈالنے والوں کو قتل کیا گیا تھا.. برکات احمد نے بھی بنو قریظہ کے مردوں کے قتل کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ مدینہ اُن زمانوں میں چھوٹا سا شہر تھا اور اس کے ایک بازار میں اتنے آدمیوں کو قتل کر کے دبانے کے لیے گڑھے کھودنے کی گنجائش ہی نہ تھی.. وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول اللہ جیسے نفیس طبیعت کے انسان آبادی کے اندر اتنے آدمیوں کو قتل کر کے دبانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے..

میں بھی اپنی طبیعت کو ابن کثیر اور برکات احمد کی تحقیق کے قریب پاتا ہوں..

ہم بنو قریظہ کی بستی کے آثار.. کھجور کے چند درخت.. وہاں ٹھہرے نہیں' گزر گئے.. البتہ تاریخی اختلافات وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں..

''کھجوروں کے جُھنڈ میں پوشیدہ مسجد رانونہ کے کھنڈر.. جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں''

ہم ایک سپاٹ سی..ویران.. بے روح اور ٹریفک سے عاری..دھوپ بھری..معاف کیجیے گا مدینے کی کوئی بھی سڑک بے روح کیسے ہو سکتی ہے..لیکن دھوپ بھری سپاٹ اور ٹریفک سے عاری تو ہو سکتی ہے تو ہم اُس پر جا رہے تھے..بنونضیر اور بنوقریظہ کی برباد بستیوں کے بعد ہم اُس پر سفر کر رہے تھے جب بابا فقیر نے اسپورٹڈ سیون اپ سے مخمور ہو کر ایک بے سُرا اور لمبا ڈکار لیا اور بڑبڑایا ''مولا بخش..رُکو..دائیں ہاتھ موڑ لو..''

دائیں ہاتھ پر شاہراہ کے ساتھ ایک دھوپ میں جلتا چٹیل میدان تھا..اور اُس میں کوئی راستہ نہ تھا..

''کیوں موڑ لوں؟'' مولا بخش نے بیزاری سے کہا..

بابا فقیر نے بھی برابر کی بیزاری سے جواب دیا ''میں جو کہتا ہوں کہ موڑ لو..''

''وہاں ہے کیا؟'' مولا بخش نے کار آہستہ کر دی..

''اُدھر میدان کے آگے کھجوروں کا جو باغ نظر آ رہا ہے وہاں کچھ دکھانا ہے صاحب کو..''

''اُدھر ہے کیا فقیر بابا..'' میں نے پُر اشتیاق ہو کر پوچھا..مجھ میں وہی بے قراری بھر گئی جو نہ قرطبہ میں چین لینے دیتی تھی..اور نہ غرناطہ اور دمشق میں میرا دامن چھوڑتی تھی کہ..اُدھر ہے کیا..کونسا کھنڈر ہے..یہ شکستہ محراب کن زمانوں کی ہے..یہ جو دور کھلا ہے اس کے پار کیا ہے..راکھ کریدتے جاؤ جستجو کرتے جاؤ شاید کوئی ٹھیکری مل جائے..کوئی سکہ برآمد ہو جائے..تو جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ شہر سب کے سب تو مدینے کے بھری کو بیلیں ہیں تو یہاں کوئی بھی کہہ دے کہ وہاں کچھ ہے تو بے قرار کیا کرے..یہی پوچھے کہ اُدھر ہے کیا بابا؟

''مسجد..رانونہ..نونہ..نونہ..'' فقیر پوپلے منہ سے نونہ نونہ دہراتا گیا..

''بابا ذرا منہ دبا کر پھر سے بولو کون سی مسجد؟''

اُس نے پھر وہی کچھ نونہ نونہ کہا..

بہت بعد میں وطن واپس جب آیا تو حضورؐ کی حیات کے اوراق میں ایک لفظ ''رانونا'' یکدم میرے سامنے نمایاں ہوا..اُس سمندر کی سطح پر ایک بادبانی کشتی تیرتی تھی اور اُس کے بادبان پر ''رانونا'' لکھا ہوا تھا..میں بتا نہیں سکتا کہ یکدم رانونا کا حوالہ دریافت کر کے میری کیا حالت ہوئی..میں اپنی سٹڈی سے اُٹھ کر کچن میں گیا جہاں میمونہ دال چاول بنانے میں مصروف تھی اور میں نے کہا ''میمونہ..تمہیں یاد ہے بابا فقیر ہمیں ایک مسجد کے کھنڈر تک لے گیا تھا جس کا نام وہ نونہ نونہ بتاتا تھا..وہ رانونا ہے..جہاں حضورؐ نے مدینے میں آمد پر پہلی نماز جمعہ ادا کی تھی..مارٹن لنگز نے اس کا حوالہ دیا ہے..''

لیکن اُس لمحے میں اس کی اہمیت سے آگاہ نہ تھا جب بابا فقیر نونہ نونہ بڑبڑا رہا تھا..

''تو وہاں کیا ہوا تھا؟''

''ہونا کیا ہے؟'' بابا فقیر جھلا گیا..کیونکہ وہ مولا بخش کے ساتھ بحث مباحثے سے عاجز آ گیا تھا اور شاید اُسے پھر سے ایک سیون اپ کی طلب ہو رہی تھی..

''یہاں نونہ نونہ میں حضورؐ نے دعا مانگی تھی اور کہا تھا کہ جو شخص اس مسجد میں دعا مانگے گا اُس کی دعا قبول ہوگی..''

مولا بخش نے کار آہستہ تو کر دی تھی لیکن اُسے روک دینے یا موڑ دینے کا اُس کا چنداں ارادہ نہ تھا..''سائیں ہم بھی تو برسوں سے مدینے میں ہیں..درجنوں نہیں سینکڑوں بار ادھر سے گزرے ہیں تو میں بتاتا ہوں کہ ادھر صرف کھجوروں کا باغ ہے کوئی مسجد وغیرہ نہیں..ہوتی تو مجھے معلوم نہ ہوتا..''

''کیوں بابا فقیر؟''

وہ کچھ پژمردہ سا ہو کر بولا: ''ہاں..نہیں ہے..بہت برس پہلے جب ادھر آیا تھا تو باغ میں مسجد کے کھنڈر تھے..شاید نہیں ہیں..بھولتا ہوں..ٹھیک ہے آگے چلو..''

میں تو جستجو کی کنڈی میں پھنس چکا تھا..میں مولا بخش کو آگے جانے دیتا تھا..''ذرا چیک کر لینے میں کیا حرج ہے مولا...''

''صاحب اندر کچھ بھی نہیں ہے..میں ادھر آ تار دیتا ہوں..''

''ہے..'' بابا فقیر پھر اشتعال میں آ گیا..

''مولا بخش.. آپ ادھر اس چٹیل میدان میں گاڑی اُتار کر کھجوروں کے باغ کے قریب لے جاؤ.. دیکھ لیتے ہیں کہ کچھ ہے کہ نہیں.. نہ ہوگا تو نہ سہی..''

مولا بخش نے بادل نخواستہ کار شاہراہ سے اُتاری. چٹیل میدان میں وہ دھچکے کھاتی چلی اور کھجوروں کے اُس باغ کے قریب جا رکی.. جو چاروں اور سے آہنی کھمبوں میں تنی ہوئی جالیوں کے اندر محفوظ تھا اور اُس کا واحد پھاٹک مقفل تھا..

میں نے آہنی جالیوں کو تھام کر.. اور اُن میں دوپہر کی حدت بہت تھی.. باغ کے اندر جھانکا.. شاید مولا بخش درست کہتا تھا.. اندر مختلف قامتوں کے درختوں کا ایک گھنا باغ تو تھا.. کچھ رہائشی کوٹھڑیاں تھیں اور چند مزدور اُن درختوں تلے کام کر رہے تھے.. اور کچھ نہ تھا..

مولا بخش حسب عادت مجھ پر نظر رکھنے کی خاطر میرے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا..

میمونہ اور بابا فقیر دھوپ سے بچاؤ کے لیے کار میں آرام سے تھے..

مولا بخش آگے ہوا اور آہنی جالی سے ناک لگا کر باغ کے اندرون پر ایک نظر کی.. اور پھر کھجوروں کے درختوں تلے کام میں مصروف مزدوروں کو مخاطب کر کے سندھی زبان میں ایک ہانک لگائی..

دو تین نوجوان مزدور اُس کی ہانک سن کر کمربستہ ہوئے اور آہنی جالی کے جانب جس کے ساتھ ناکیں چپکائے ہم دونوں اندر جھانکتے تھے.. چلتے آ گئے..

مولا بخش نے نہایت بے تکلفی سے جو کہ اُس کی خاصیت تھی سندھی میں اُن سے کچھ راز و نیاز کیے.. کچھ سوال جواب کیے اور وہ مزدور ایک سندھی بھائی کی آمد سے اپنے اُس سوہنے سندھ کی باس محسوس کرنے لگے۔ جسے وہ پاپی پیٹ کی خاطر چھوڑ کر اس بستی میں آ گئے تھے.. بے شک وہ بستی مدینہ تھی پر سندھ نہ تھی.. جب اُن کی باہمی گفتگو اختتام کو پہنچی تو مولا بخش میری جانب دیکھ کر مسکرایا ''بڑا کائیاں فقیر ہے سائیں جو کہتا تھا سچ کہتا تھا.. یہ سندھی بھائی بتاتے ہیں کہ باغ کے اندر چھپی ہوئی ایک مسجد ہے.. اُس کے کھنڈر ہیں.. آپ لوگ زیارت کرنا چاہتے ہو تو ہم پھاٹک کھول دیتے ہیں.. ہمارا شیخ کسی کام کے سلسلے میں مدینے گیا ہوا ہے.. اگر وہ واپس آ گیا تو بہت ناراض ہوگا.. آپ لوگ جلدی سے زیارت کر لو.. بلکہ کار اندر لے آؤ..''

مزدوروں نے قفل کھول کر پھاٹک وا کر دیا..

بابا فقیر کار میں ہی براجمان رہا.. [illegible]

مولا بخش سندھی بھائیوں کے بال بچوں اور والدین کی خیریت دریافت کرنے میں مگن ہو گیا

اور میں میمونہ کے ہمراہ مزدوروں کی کوٹھڑیوں سے پرے.. دھوپ میں سوکھتی کھجوروں سے پرے باغ کے اندرون میں چلا گیا..

وہاں کھجوروں کے تناور بھی.. بلند قامت اور ٹھنگنے بھی.. گھنے اور چھدرے بھی درختوں کے درمیان.. پوشیدہ.. روپوش.. ایک سکوت بھری خاموشی میں ہوا کا چلن موقوف تھا' صرف دھوپ درختوں میں سے اُترتی تھی.. وہاں ایک مختصر کھنڈر کے آثار تھے..

بکھرے ہوئے پتھر گواہی دیتے تھے کہ عمارت قدیم تھی..

ایک بڑے کمرے جتنا کھنڈر ہو چکا رقبہ تھا.. اور دو تین دیواریں ابھی جوں کی توں کھڑی تھیں.. لیکن ہمارے قد سے اونچی نہ تھیں.. اُن کے درمیان چٹائیوں پر بچھائی ہوئی کھجوریں دھوپ میں سوکھتی تھیں.. اور اس کھنڈر کے مسجد ہونے کی گواہی ایک مسمار ہو چکی لیکن اب بھی اپنی محرابی ساخت نمایاں کرتی محراب موجود تھی..

میں نے اور میمونہ نے آپس میں کچھ گفتگو نہ کی کہ اس غیر معروف کھنڈر نے ہماری گویائی چھین لی تھی.. بابا فقیر کے اس بیان نے گویائی چھین لی تھی کہ حضورؐ نے یہاں کبھی دعا مانگی تھی اور کہا تھا کہ یہاں پر دُعا قبول ہوتی ہے..

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں..

حضورؐ نے یقیناً اسی محراب کے مقام پر نماز پڑھائی ہوگی.. دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے ہوں گے..

ہم دونوں نے اپنی نظروں سے جائزہ لیا کہ ہم کہاں دو نفل پڑھنے کے لیے کھڑے ہو سکتے ہیں.. لیکن وہاں پتھر بکھرے ہوئے تھے اور سوکھتی کھجوریں محراب تک جاتی تھیں.. شیخ کے وارد ہو جانے کا بھی خوف تھا چنانچہ ہم نے اس کی ایک دیوار کے پتھروں پر ہاتھ رکھ کر دو ہیں کھڑے کھڑے پھر سے وہی کچھ مانگا جو ہم مانگتے چلے آئے تھے..

ہم دونوں تنہا تھے..

''قبا' شہر مدینہ سے باہر چھ میل پر ایک علیحدہ بستی ہے.. رسول اللہؐ اپنے رفیق سفر ابوبکرؓ کی معیت میں قبا تشریف لائے اور یہاں چار روز قیام کیا اور اس وقفہ قیام میں یہاں ایک مسجد تعمیر فرمائی۔''

''جمعہ کا دن تھا.. رسول اللہؐ نے اُس مسجد میں جو وادیٔ رانونا میں تھی

نمازِ جمعہ پڑھائی.." (ہیکل)

"رسول اللہؐ بہ مقام قباؑ.. عمرو بن عوف کے محلے میں دو.. چہار اور پنج شنبہ تشریف فرما رہے اور اُن کی مسجد کی بنیاد ڈالی.. جمعہ کی نماز آپ نے اس مسجد میں ادا فرمائی جو وادیٔ رانونا کے درمیان ہے.. جمعہ کی یہ پہلی نماز تھی جو مدینہ میں آپ نے ادا فرمائی.. وادیٔ رانونا مدینہ منورہ کی ایک وادی ہے جو وادیٔ بطحان میں آملتی ہے.."
(ابن ہشام)..

"جمعہ کی صبح کو وہ قباء سے باہر نکلے.. اور دوپہر کے وقت وہ اپنے ساتھیوں سمیت وادیٔ رانونا میں نماز کے لیے ٹھہرے.. وہاں قبیلہ خزرج اور بنی سالم کے لوگ اُن کے منتظر تھے.. یہ پہلی نماز جمعہ تھی جو انہوں نے اُس وطن میں پڑھی جو اب اُن کا گھر تھا.. اُن کے کچھ عزیز بنی نجار قبیلے سے تھے اور بنو امر اُن کے ہمراہ قباء سے چلے تھے.. یوں اُن کی کل تعداد سو کے لگ بھگ تھی.. نماز کے بعد رسول اللہؐ قصویٰ پر سوار ہوئے اور ابوبکر کے ہمراہ مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے.." (مارٹن لنگز)

رانونا کے مندرجہ بالا جتنے حوالے ہیں یہ سب کے سب وطن واپسی پر میں نے دریافت کیے لیکن اُس لمحے جب میں کھجوروں کے جھنڈ کے درمیان میں بکھرے ہوئے پتھروں کو چھوتا تھا تو قطعی طور پر اُن کی تاریخی اہمیت سے آگاہ نہ تھا.. بابا فقیر نے بس اتنی خبر کی تھی کہ حضورؐ نے بھی یہاں دعا کی تھی اور یہاں جو بھی دعا مانگے وہ قبول ہو جاتی ہے.. تب نہیں واپس آ کر میں بابا فقیر کا شکرگزار رہا کہ وہ مجھے ایسے مقام تک لے گیا جہاں کم ہی لوگ گئے ہوں گے اور جس کا کوئی تذکرہ میں نے موجودہ دور کی کسی کتاب میں نہیں پڑھا تھا..

یعنی سو کے لگ بھگ لوگ قباء سے چلے آتے ہیں بنو امر اور بنو نجار کے.. اور اُن کے آگے قصویٰ ہے جو پھن پھن کرتی چلی جاتی ہے.. اور اُس پر سوار جن اُس شہر کو بڑھتے ہیں جس نے اُن کے [illegible] سے مدینۃ النبیؐ ہو جانا تھا اور راستے میں رانونا کی وادی ہے تو وہ نماز جمعہ کے لیے وہاں

ٹھہر جاتے ہیں.. جہاں مسمار شدہ محراب کے آثار تھے وہیں قصویٰ کا سوار کھڑا ہوا ہوگا.. کیا اُن زمانوں میں بھی اس مسجد کے آس پاس کھجوروں کا باغ ہوگا.. یہ عین ممکن ہے کیونکہ کھجوروں کے پودے نئی زمین میں دیر سے جڑ پکڑتے ہیں اور پھر یہ ضروری نہیں کہ وہ اُس زمین کو پسند کریں اور خوب پھلیں اور بہترین نسل کا پھل پیدا کریں.. تو جس مقام پر کھجوروں کے درخت کامیاب ہو جاتے ہیں.. اُن کے پودے زمین سے خوش ہو کر خوب پھلتے پھولتے ہیں تو پھر وہ باغ نسل در نسل چلتے رہتے ہیں.. بستیوں کے مقام ضرورت کے تحت بدل جاتے ہیں لیکن کھجور کے کامیاب باغوں کو کبھی نہیں کاٹا جاتا.. جیسے سلمان فارسی کے باغ کے شجر تب تک ویسے ہی پھلتے پھولتے چلے آئے.. اُسی زمین میں جسے سلمان سینچا کرتے تھے جب تک کہ شرک کے خوف نے انہیں جڑ سے نہ اکھاڑ پھینکا گیا.. مدینے میں بھی جتنے کھجوروں کے باغ ہیں اُن میں سے بیشتر عہدِ نبویؐ میں بھی موجود تھے..

چنانچہ رانونا مسجد کے کھنڈر بھی کھجوروں کے جس وسیع باغ کے اندر موجود تھے اُنہی زمانوں کا تھا جب قصویٰ کا سوار اپنے یارِ غار ابوبکر کے ہمراہ اُن کے سائے میں رکا تھا.. اور مدینے کے نواح میں پہلی نماز جمعہ ادا کی تھی..

"یہاں لوگ آتے ہیں؟" فیاض نام کا ایک سندھی نوجوان تھا جو چٹائیوں پر کھجوریں پھیلا رہا تھا میں نے اُس سے دریافت کیا..

"نہیں سائیں.." وہ مسکرانے لگا.. "اِدھر کون آتا ہے.. آپ تو مولا بخش کے ساتھ اِدھر آ گیا ورنہ ہم پھاٹک نہیں کھولتے.. ہمارا شیخ ذرا غصّے کا برا ہے.. آپ بھی ذرا جلدی سے دیکھو اور چلے جاؤ.. آپ مہمان ہیں پر سائیں ہم مجبور لوگ ہیں.. پیٹ پالنے کے لیے شیخ کا غصہ سہتے ہیں.."

"یہ مسجد نونہ نونہ ہے کیا ہے؟"

"نہیں معلوم سائیں.. اس جگہ پر کچھ ہے تو سہی.. ہم اس کھنڈر کے پتھر نہیں ہٹاتے.."

"لوگ زیارت کے لیے نہیں آتے؟"

"نہیں سائیں.."

نہ صرف مسجد کے کھنڈر میں بلکہ کھجور کے درختوں کی گھناوٹ کے نیچے بھی ڈھیروں کھجوریں سوکھ رہی تھیں..

بیشتر درخت تو قد آور تھے جیسے کھجور کے درخت ہوتے ہیں.. اونچے اور پہنچ سے باہر.. لیکن

یہاں کچھ نہایت بھلے لگتے مختصر قد کے درخت بھی تھے..

کھجور کی کوئی منی ایچر نسل تھی کہ آپ ہاتھ بڑھا کر کھجوروں کے زرد گچھے توڑ سکتے تھے.. یہ پام کے ننھے پودوں کی مانند تھے..

باغ کے باہر ہم جس تپتی دوپہر کو چھوڑ آئے تھے.. اُس میں دوبارہ چلے جانے اور جھلنے کو جی نہ چاہتا تھا..

گھنے چھتریں بنتے دوپہر کی تمازت کو اوپر ہی اوپر برداشت کرتے اُس کی دھوپ کو ہم تک نہ آنے دیتے تھے..

البتہ مسجد رانونا کی ڈھے چکی دیواریں اور محراب کے آثار دھوپ میں روشن تھے..

اُس بے نام بے چہرہ غصیلے شیخ کے آنے کا وقت ہو رہا تھا کیونکہ سندھی مزدوروں کے چہروں پر پریشانی کی گھڑی ٹک ٹک کرتی جاتی تھی..

ہمیں آج جو بھی شیخ ملتا تھا غصیلا شیخ ہی ملتا تھا..

ہم اُس کنج رانونا سے نکل آئے..

نکلے تو فیاض اور اُس کے دو ساتھی بھی ہمارے ہمراہ نکل آئے.. وہ مسجد رانونا کے گرد پھیلے ہوئے کھجوروں کے باغ میں سے اتاری گئی کھجوروں سے بھری تین پوٹلیاں بھی لے آئے.. ہمارے لیے.. کہ سائیں آپ ہمارے مہمان ہیں..

فیاض نے ہمیں آگاہ کیا کہ..

ایک پوٹلی میں ''امبر'' قسم کی کھجوریں ہیں..

دوسری میں قلمی کھجوریں تھیں جو بھاری اور میٹھی ہوتی ہیں اور انہیں عرف عام میں گلے والی کھجوریں بھی کہا جاتا ہے..

اور تیسری پوٹلی میں کون سی کھجوریں تھیں؟ حضورؐ کے دہن مبارک میں گھل جانے والی اُن کی من پسند اجوئی کھجوریں تھیں..

ہم نے کار کا ٹرنک کھول کر فیاض سے کہا کہ وہ ان پوٹلیوں کو اس میں رکھ دے کیونکہ اندر جگہ نہیں تھی.. تو اُس نے اُن میں سے ایک پوٹلی الگ کر کے میمونہ سے کہا ''بیگم صاحبہ ان کھجوروں کو اپنی گود میں رکھ لیں..''

شاید وہ اجوئی کی پوٹلی تھی یا کوئی اور وجہ تھی..

میمونہ نے وہ پوٹلی تھامی تو اُس کے چہرے کا رنگ کچھ اور ہو گیا اور پھر اُس نے اُس

پوٹلی کو اپنے سینے سے ایسے لگا لیا جیسے کسی اولاد کو ایک مدت کے وچھوڑے کے بعد گلے لگاتے ہیں.. اور مدینہ کے قیام کے دوران مجال ہے جو اُس نے اس پوٹلی کو اپنے سے جدا کیا ہو.. اپنی گرفت ڈھیلی کی ہو..

میں نے سبب پوچھا تو کہنے لگی ''جب اُس سندھی مزدور نے دو پوٹلیاں تو اطمینان سے ٹرنک میں رکھ دیں لیکن اس پوٹلی کو تھامے ہوئے میرے پاس آیا کہ بیگم صاحبہ اسے اپنی گود میں رکھ لیں تو میں جان گئی تھی کہ یہ عام نہیں.. کسی اور مرتبے کی کھجوریں ہیں.. اور مجھے خیال آیا کہ یہ سندھی مزدور کسی نہ کسی بھید سے آگاہ ہے.. کیا پتہ مسجد رانونا کے گرد جو باغ ہے اُس میں کوئی ایک ایسا درخت ہو جو حضورؐ نے اپنے ہاتھوں سے لگایا ہو اور یہ اُس کی نسل کے کسی درخت کی کھجوریں ہوں..''

عجیب ضعیف الاعتقاد بیگم تھی..

اُس نے زندگی بھر مجھے ایسے نہیں سنبھالا تھا جس چاہت سے وہ اُن کھجوروں کی پوٹلی سنبھالتی تھی..

کھجوروں کے اس باغ کو مقامی لوگ ''باغ ترکی'' بھی کہتے ہیں.. کیوں کہتے ہیں؟ یہ میں نہیں جانتا..

”جو تُو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا.. بیئرِ غرص کے کنویں کے پانیوں پر حضورؐ کے ہونٹ اور میری آنکھیں“

اب جو سفر شروع ہوا ہے تو بابا فقیر ایک جیتا ہوا کھلاڑی تھا جو ایک چشمِ حقارت سے ہارے ہوئے مولا بخش کو دیکھتا تھا کہ.. میں نہ کہتا تھا اُس باغ کے اندر ایک کھنڈر ہے.. تو نہ تو نہ.. بلکہ وہ ہم پر بھی مکمل طور پر حاوی ہو چکا تھا اور ہم اُس کی مرعوبیت کے تابع ہو کر ذرا جان کی امان پا کر پوچھتے تھے.. بابا فقیر اب کہاں جائیں گے..

تو وہ رعونت سے بولا اور عصا کار کے فرش پر کھٹکھٹا کر بولا ”کنویں پر جائیں گے“

”کون سے کنویں پر؟“

”آپ صبر نہیں کرتے تارڑ صاحب.. بات پوری نہیں سنتے اور بول پڑتے ہو.. اِدھر مدینہ شریف میں حضورؐ کے وقتوں میں بہت سے کنویں تھے.. مکّہ تو نہیں تھا مدینہ تھا.. اور سنو کہ اُن کنووں میں اب تک میٹھا اور ٹھنڈا پانی ہے..“

”اچھا..“ میں پھر زُود ہو گیا.. ”حضورؐ کے وقتوں کے کنویں ہیں اور چودہ سو برس گزر جانے کے بعد بھی اُن میں اب تک.. پانی کیسے ہو سکتے ہیں..“

اس بار بابا فقیر نے مجھے بے صبری کا طعنہ نہ دیا اور اطمینان سے کیونکہ وہ جیتا ہوا تھا کہنے لگا ”دیکھو.. اُدھر ہمارے پنجاب میں جدھر بھی کنواں کھودو پانی نکل آتا ہے.. پانچ پانیوں میں سے کسی ایک کا پانی نکل آتا ہے پر اِدھر مدینے میں بے شک برکت ہے لیکن آس پاس تو صحرا ہے اور پیاس ہے تو اِدھر ہر جگہ پانی نہیں نکلتا.. اِدھر کے لوگ صرف اُس مقام پر کنواں کھودتے تھے جہاں سے پانی رستا تھا.. مٹی یا

ریت گیلی رہتی تھی..“

”بابا فقیر.. پانی کیسے رستا تھا.. مٹی کیسے گیلی ہوتی تھی..“ میں نے ذرا عاجزی بھی اختیار کر لی کہ اس کے پاس ایک خزانہ تھا..

”اِدھر مدینے میں قدرتی طور پر.. زیرِ زمین.. چٹانوں اور ریت کے اندر جہاں کہیں پانی کا ذخیرہ ہوتا تھا تو اوپر کی زمین گیلی رہتی تھی اُس میں سے پانی رستا رہتا تھا تو اہلِ مدینہ صرف وہاں کنواں کھودتے تھے.. اس لیے تب مدینے میں کل پندرہ بیس کنویں ہوں گے.. ان کا پانی کبھی خشک نہیں ہوتا تھا کہ زیرِ زمین یہ جہاں کہیں سے بھی آتا تھا اس کی سپلائی جاری رہتی تھی.. جیسے زمزم کا کنواں ہے.. اسی لیے نبی پاکؐ کے زمانے میں جتنے بھی کنویں تھے.. اُن میں سے جتنے باقی ہیں ان کا پانی ابھی تک چل رہا ہے..“

اس موقع پر اگرچہ ڈرتے ڈرتے اپنی ہاری ہوئی عزتِ نفس کی کچھ بحالی کے لیے مولا بخش نے ہمیں بتایا کہ اِدھر ایک کنواں ایسا تھا جہاں حضورؐ پاک آیا کرتے تھے اور لوگ تبرک کے طور پر اُس کا پانی گھر لے جاتے تھے چنانچہ سعودیوں نے اسے شرک قرار دے کر اُسے پاٹ دیا.. مٹی اور پتھروں سے بند کر دیا اور اس کے باوجود اس کا پانی سطح کو گیلا کرنے لگا اور پھوٹنے لگا تو پھر وہاں سیمنٹ اور بجری کی تہہ جما کر بند کیا گیا.. ورنہ وہ تو بند نہ ہوتا تھا.. بابا فقیر درست کہتا ہے کہ اِدھر ایک بار کنواں کھودو تو وہ ہمیشہ کے لیے چالو ہو گیا سائیں..

”لیکن ہم کس کنویں پر جا رہے ہیں؟“

”صبر نہیں کرتے..“ بابا فقیر نے صرف اتنا کہا..

یہ ایک اور تقریباً ویران علاقہ تھا..

بہت آباد بھی آبادی والا نہ تھا.. شاہراہ بھی ویران تھی.. دھوپ کی وجہ سے شاید.. یا اِدھر آنے والے لوگ کم تھے کیونکہ یہ شہر کی گہما گہمی سے دور تھا..

”روکو..“ بابا فقیر نے کہا..

اور اس بار مولا بخش نے کچھ تعرض نہ کیا اور کار فوراً روک دی..

دائیں جانب شاہراہ سے ذرا ہٹ کر ایک تین چار منزلہ سرکاری سی عمارت تھی اور ہم کار سے اُتر کر اس عمارت کے قریب ہو گئے.. آس پاس کسی کنویں کے کچھ آثار نہ تھے.. نہ کہیں بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی آواز تھی اور نہ کہیں رہٹ کے چلنے کا کوئی متواتر ترنم تھا اور نہ ہی پانی کی شڑاپ اور کوئی

سرگوشی تھی جو ہمیں خبر کرتی کہ ادھر آ جاؤ..

تو اُس لمحے مجبوراً کار میں استراحت فرماتا بابا فقیر عصا ٹیکتا ہوا اور بڑبڑاتا ہوا آ گیا..

دھوپ کی تیزی میں کمی نہیں آئی تھی..

اکتوبر کے اوائل تھے اور پھر بھی زبان سوکھتی تھی.. شدید گرمیوں میں.. جون جولائی میں تو یہاں زبان پر کانٹے اُگ آتے ہوں گے.. مدینے کے موسم اتنے بھی خوشگوار نہیں رہتے..

اُس سرکاری عمارت کے پہلو میں ایک چھپر سا تھا.. جس پر کاٹھ کباڑ جمع تھا اور اُس کے نیچے ایک دیوار تھی جو نیم گولائی کا تاثر دیتی تھی..

''کنواں ادھر ہے صاحب..''

''کدھر بابا فقیر؟''

''یہ جو چھپر ہے اس کے نیچے کنواں ہے.. وہ جو گول سی دیوار ہے وہ کنویں کا حصہ ہے.. پہلے کنواں دکھائی دیتا تھا پھر اس پر یہ ٹین کا چھپر پر ڈال کر بند کر دیا گیا.. ابھی پچھلے سال میں ادھر آیا تھا تو دیوار میں ایک روزن تھا جس میں جھانک کر اس کے اندر دیکھا جا سکتا تھا پھر اُسے بند کر دیا گیا کہ لوگ جھانکتے تھے..''

''کیوں جھانکتے تھے بابا؟''

''روایت ہے کہ جب حضورؐ مدینے سے قباء کی بستی کو جاتے تھے یا وہاں سے لوٹتے تھے تو یہ کنواں درمیان میں پڑتا تھا اور وہ سستانے کی خاطر یہاں رکتے تھے.. منڈیر پر آرام کرتے تھے.. اس کا پانی پی کر تازہ دم ہوتے تھے اور پھر سفر اختیار کرتے تھے..''

بابا فقیر میری نظروں میں مزید معتبر ہو گیا..

لیکن کنویں تو بہت تھے تو یہ کون سا والا کنواں ہے..

مجھے اب بھول رہا تھا کہ سیرت النبیؐ کی کون سی کتاب میں میں نے ایک ایسے کنویں کا ذکر پڑھا تھا جس کی منڈیر پر بیٹھ کر حضورؐ اپنے پاؤں اُس میں لٹکا کر ٹھنڈک محسوس کرتے تھے.. یعنی کنویں کے پانی اتنے بلند ہوتے تھے کہ اُن کے پاؤں چھوتے تھے.. ایک اور کنویں کے بارے میں بھی درج ہے کہ اُس کا پانی کڑوا بدمزہ ہوا تو حضورؐ نے چلو میں پانی بھر کر اُسے منہ میں ڈالا اور پھر کلی کر کے اُسے کنویں کو بخش دیا تو اُس کے پانی ہمیشہ کے لیے میٹھے ہو گئے..

ایک اور روایت کے مطابق حضورؐ نے وصیت کی کہ اُن کے وصال پر اُنہیں فلاں کنویں کے پانیوں سے غسل دیا جائے اور حضرت علیؓ اسی کنویں سے پانی لے کر آئے اور حضورؐ کے

جسد مبارک کو نہلایا..

تو یہ کون سا کنواں تھا؟

اسے میری لاپروائی خیال کر لیجیے یا اسے ایک جانا بوجھا عمل سمجھ لیجیے کہ میں نے سیرت النبیؐ کی متعدد کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے نوٹس تیار نہ کیے تھے' کیونکہ میں اس تحریر کو تحقیق کے حوالوں سے بوجھل نہیں کرنا چاہتا تھا اور صرف محسوسات اور جذبوں کو بیان کرنا چاہتا تھا' ورنہ میں اس کنویں کو فوری طور پر جان جاتا.. بہرحال اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ حضورؐ کا گزر ادھر سے ہوتا تھا وہ بہرطور یہاں رکتے تھے.. اُن دنوں مدینہ اور قباء کے درمیان ایک نیم صحرائی کیفیت ہوا کرتی تھی اور وہ جو چوڑے شانوں والے تھے اور جن کی بھنویں گھنی اور آپس میں ملی ہوئی تھیں اور چلتے تھے تو تیز.. جیسے اُترائی اُترتے ہوئے چلتے تھے اور جن کی پگڑی میں سے اُن کے گیسو سیاہ دکھائی دیتے تھے تو وہ.. یہاں کچھ دیر قیام کرتے تھے.. اور اُس سامنے والے چھپر تلے.. جو پوشیدہ کنواں ہے اُس کے پانیوں سے پیاس بجھاتے تھے.. جو ایک کھڑکی کھلی تھی اُس کنویں میں جھانکنے کے لیے تو وہ بھی بند کر دی گئی تھی.. تو اُس کا نظارہ کیسے ہو.. حالانکہ میں تو کوئی ایسا عقیدت مند نہ تھا.. حضورؐ کی یاد میں رونے دھونے والا نہ تھا' بھی کبھار مسکرانے والا تھا.. اور شرک کرنے والا تو ہرگز نہ بلکہ شک کرنے والا تھا تو اس کے باوجود یہ کھڑکی کیوں بند کر دی گئی تھی..

میں اس چھپر اور اینٹوں کی نیم گولائی کے قریب ہو کر اُس دھوپ میں کھڑا رہا.. باقی سب لوگ کار میں منتظر تھے.. سوچتا رہا کہ کیا کروں.. ان اینٹوں کو چھو کر اطمینان حاصل کر لوں جن کے اندر جانے کوئی کنواں ہے بھی یا نہیں... یہ کیسی دیوار گریہ ہے کہ اس کے اندر جو کچھ ہے میں اس میں جھانک بھی نہیں سکتا..

میں اسی ادھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ شاہراہ پر سے ایک پرانی کار اتری اور اُس چھپر سے ملحقہ سرکاری عمارت کے قریب آن رکی.. کار میں سے پاکستانی شباہت کے دو نوجوان اُترے.. اُنہوں نے مجھ پر ایک سرسری نگاہ کی اور مجھے پہچان کر میرے پاس چلے آئے.. اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے کہ کب آئے کیسے آئے اور یہ برابر میں ایک پاکستانی سکول کی عمارت ہے جہاں ہم پڑھاتے ہیں تو آئیے چائے کا ایک کپ ہو جائے.. اور اس دوران اُنہوں نے ایک بار بھی اُس چھپر کی جانب نگاہ نہ کی تو میں نے دھوپ میں کھڑے جس قدر ممکن تھا خوشدلی سے اُن کے سوالوں کے جواب دیے اور پھر اپنی آمد کا مقصد بیان کیا..

''اچھا تو یہ کنواں؟'' وہ دراچونکے..

"جی ہاں .حضورؐ کے زمانے کا ہے.."

"جی .شاید.."

"شنید ہے کہ دیوار میں تھوڑی سی جگہ ہوا کرتی تھی جس میں سے جھانک کر اس کنویں کو دیکھا جاسکتا تھا.اور اب وہاں اینٹیں چن دی گئی ہیں.."

"ہاں جی.." ایک نوجوان بولا.. "تارڑ صاحب لوگ اس میں جھانک کر پتہ نہیں کیا کیا پڑھتے رہتے تھے اور شرک کے مرتکب ہوتے تھے اس لیے.."

"بھائی میں تو کوئی راسخ العقیدہ قسم کا بندہ نہیں ہوں.محض تاریخی تجسس کا مارا ہوا بے ضرر شخص ہوں..بس ایک نظر اس کنویں میں جھانک کر کچھ پرانے زمانوں کی ٹھنڈک محسوس کرنا چاہتا تھا.قبا جاتے ہوئے صاحب یہاں رکتے تھے اس کے پانی پیتے تھے تو.محض تاریخی تجسس.."

"اب تو یہ ممکن نہیں رہا.."

"جی.تو پھر اس کے باہر جو گولائی ہے وہ بھی کسی قدیم دیوار کی لگتی ہے تو اسے ہی قربت سے دیکھ لیتے ہیں.."

ان نوجوانوں نے آپس میں کچھ کھسر پھسر کی..اگر وہ مدینے کے ایک پاکستانی سکول میں پڑھاتے تھے تو یقیناً حکومت کے تمام اقدامات کے آگے سر جھکاتے تھے اور شاید عقیدے میں بھی اُس کی پیروی کرتے تھے..

"ادھر آئیے.." دوسرے نے سر جھٹک کر اشارہ کیا..

ویسے اُن دونوں کو پہلے پہل تو مجھ سے ملنے کا چاؤ تھا لیکن اب دھوپ کی تیزی اُن کے چاؤ کو نڈھال کرتی تھی اور وہ جلد از جلد مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے..

کنویں کے یہ آثار ایک دیوار سے منسلک تھے..اس کی گولائی کو وہ چھپّر ڈھکتا تھا جس پر کچھ کاٹھ کباڑ پڑا تھا..

قریب ہی ایک چھوٹا سا پتھر تھا جسے ایک نوجوان نے اُٹھایا اور کنویں کی دیوار کے ساتھ رکھ دیا

"آپ اس پر چڑھ جائیں..دیوار اور چھپّر کے درمیان میں تھوڑی سی جگہ ہے آپ ذرا کوشش کر کے اُس میں سے نیچے جھانک سکتے ہیں.."

میں جان گیا کہ وہ پتھر یونہی بے مقصد اِدھر نہیں پڑا ہوا تھا.شاید یہی نوجوان اُس کی مدد سے اوپر ہو کر کنویں میں جھانکتے ہوں گے اور انہوں نے آپس میں کھسر پھسر اسی لیے کی کہ اس شخص کو اس راز میں شامل کیا جائے یا نہیں..

میں نے اُس پتھر کو حجرِ اسود کے تقدس سے دیکھا..مجھے وہ بہت قیمتی لگا..

میں دیوار کو تھام کر اُس پر چڑھا تو جہاں تک میری آنکھیں پہنچیں وہاں واقعی ایک شگاف تھا..

میں نے ذرا احتیاط سے اپنا سر اس شگاف کے اندر کیا..

میرا سارا بدن تو باہر کی دھوپ میں تھا لیکن گردن تک جو میرا چہرہ تھا وہ شگاف کے اندر کی نیم تاریکی میں چلا گیا.جیسے مسجد قرطبہ میں داخل ہونے پر روشنی کا واحد منبع اُس کا پھاٹک بند ہو گیا تھا اور میں اس ہجوم تخیل میں یکدم نابینا ہو گیا تھا کہ آنکھیں صحن نارنجستان کی دھوپ کے بعد مسجد کی نیم تاریکی سے آشنا ہونے سے جھجکتی تھیں..ایسے مدینے کی تیز دھوپ کی چکاچوند کے بعد آنکھیں یکدم اس شگاف کے اندر جو اندھیرا تھا اُس میں کھلیں تو بنا کچھ دیکھے کھلی رہیں اور پھر کچھ ساعتوں کے گزرنے سے انہیں عادت ہوئی اور کچھ کچھ نظر آنے لگا..

کنویں کی گولائی کو ڈھانکنے والا چھپّر بہت خستہ تھا اور اس میں سے دھوپ کی چند کرنیں..دیوار اور چھپّر کے درمیان جو رخنے تھے اُن میں سے داخل ہوتی تھیں لیکن اندر کی تاریکی پر اُن کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا..

کنویں کا وجود جہاں سے میں اُسے دیکھتا تھا تقریباً پانچ چھ فٹ نیچے تھا یعنی سطح زمین کے قریب..وہ گولائی جو باہر سے نظر آ رہی تھی کنویں کی نہ تھی بلکہ اس کے گرد جو حفاظتی دیوار تھی اُس کی تھی..

کنویں کی منڈیریں چوڑی تھیں..مستطیل پتھروں سے تعمیر شدہ' جو گیلے تو نہ تھے لیکن کہیں گہرائی میں سے جو نمی سرایت کرتی اوپر آتی تھی وہ اُن پر اثر کرتی تھی..منڈیر اتنی چوڑی تھی کہ اس پر آسانی سے بیٹھا جاسکتا تھا..پتھروں کی ٹھنڈک محسوس کرتے ہوئے کنویں میں ٹانگیں لٹکا کر لطف اُٹھایا جاسکتا تھا..میں باہر کی دھوپ میں رکھے پتھر پر اپنے آپ کو سنبھالے اُس مختصر شگاف میں جو ایک پتھریلا پھندہ تھا اُس میں اپنی گردن ڈالے اندر مزید سے مزید جھانکنا چاہتا تھا اور مجھے لگتا ہے کہ اُس لمحے میری گردن کچھ زیادہ ہی لمبی ہو گئی تھی کہ میں کنویں کے کائی زدہ نیم سیاہ مستطیل پتھروں کی گولائی کی گہرائی میں اپنی آنکھیں اُتارتا چلا جاتا تھا..بے شک میں یہاں رہ جاؤں لیکن میری آنکھیں اس کی تہہ تک اُتر جائیں وہاں تک جہاں اس کے پانی ہیں..اگر ہیں تو..اور اُن پانیوں میں میری دو آنکھیں سیاہ تتلیوں کی مانند تیریں..بے شک یہ عمر رسیدہ اور پژمردہ ہیں..ان کے پروں کے رنگ پھیکے پڑ چکے ہیں لیکن جب ان کو یہ احساس ہو گا کہ وہ کس پانی پر تیرتی ہیں..جس پر شاید بابا کے لب تیرے تھے..اُن کے سانسوں کی گرمی تیری تھی تو یہ تو تیز اور رنگ رنگیلی ہو جائیں گی..اس کھنڈرے کے رنگ کی جو خانہ کعبہ کے سیاہ غلاف

پر براجمان تھا.. وہاں اُس کے پروں تلے خدا کا گھر تھا اور یہاں ان کے پروں تلے اُس کے رسولؐ کے لب تیرے تھے.. اب اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ ان ہر دو میں سے زیادہ قسمت والا کون ہے.. وہ کبوتر یا میری آنکھوں کی دو تتلیاں..

بے شک میری گردن لمبی ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود میں کنویں کے پاتال تک نہیں دیکھ سکتا تھا..

میری نظروں کے سامنے کنویں کی پتھریلی گولائی کا جو حصہ تھا وہ چند میٹر نیچے تک ہی دکھائی دیتا تھا.. اور نیم تاریکی میں ہی نظر آتا تھا..

اس حصے کے پتھر بھی جسامت میں خاصے بڑے تھے اور جہاں جہاں وہ آپس میں جڑے تھے وہاں وہاں سے اُن میں کچھ پودے اور پتے پھوٹتے تھے.. جیسے ہمارے ہاں پرانے کنووں کی اینٹوں کے درمیان میں سے پیپل کے پتے پھوٹتے ہیں.. ہری گھاس کی ایک دو لڑیاں لٹکتی تھیں.. اور ان کی نمود گواہی دیتی تھی کہ پاتال میں کیسی نمی ہے جو ان کو پہنچتی ہے..

اُس لمحے ایک نامعلوم سی ٹھنڈک سے شرابور ہوا.. نہایت مدھم اور ہلکی جو کبھی محسوس ہو جاتی اور کبھی واہمہ لگتی اوپر مجھ تک آئی اور میری لمبی گردن کے آگے اشتیاق سے بے وقوف ہوتا جو چہرہ تھا اُسے چھوتی خبر کر گئی کہ کنواں ابھی تک نہیں سوکھا.. اس کی تہہ میں پانی ہیں جو تمہیں یہاں سے نظر نہیں آ سکتے..

اب میں اُس خبر کرتی ہوا کو کیسے آگاہ کرتا کہ تم اُس پانی پر تیرتی جو سیاہ تتلیاں دیکھ کر آئی ہو وہ میری آنکھیں ہیں..

اُس مقام اور اُس لمحے میں جب میرا پورا بدن 2002ء کی دھوپ میں تھا اور میرا چہرہ سن ہجری کے پہلے سال میں تھا.. تصور کے بلیک بک سیاہ ہرن بے قابو ہوئے جاتے تھے.. قلانچیں بھرتے ہوئے اُس منڈیر کے پاس جا کر اپنی ہرن آنکھیں قصویٰ کے اُس سوار پر دھرتے تھے جو قباء کے راستے پر کچھ دیر ستانے کی خاطر دو گھونٹ پانی پینے کی خاطر وہاں بیٹھا ہوا تھا.. انہیں اپنی آنکھوں پر.. اپنی چشمِ آہو پر ناز تھا تو اُس مسافر کی آنکھیں دیکھ کر شرمندہ ہوتے تھے.. اپنے بدن کی ملاحت اور خوبصورتی پر فخر تھا تو اُس کے بدن کو دیکھ کر نادم ہوتے تھے.. تھوتھنیاں اُٹھائے اُسے حیرت سے دیکھتے تھے..

صاحب اس کنویں سے پانی کیسے پیتے ہوں گے؟

یقیناً اُس زمانے میں اس پر ایک چرخی آویزاں ہو گی جس پر ایک رسی لپٹی ہو گی جس کے آخر میں چمڑے کا ایک بوکا ہو گا اور ہمارے صاحب چرخی ڈھیلی کر کے بوکے کو پانیوں میں ڈبوتے ہوں گے اور پھر اُسے گھما کر اوپر لاتے ہوں گے اور پھر پانی پیتے ہوں گے..

بابو جی منڈیر پر بیٹھے ذرا جھک کر اپنی دونوں ہتھیلیوں کو دعا کے انداز میں جوڑ کر ان میں پانی بھر لیتے ہوں گے.. میں نے ایسے کنویں دیکھے ہیں جن کے پانی برسات کے دنوں میں کناروں تک آ جاتے تھے.. ویسے بے شک اس کنویں کے پانی پاتال میں ہوتے.. اس کے باوجود اگر وہ چاہتے تو پانی تہہ کی تاریکیوں میں سے اُبل کر اتنی بلندی پر آ جاتے کہ دھوپ سے روشن ہو جاتے اور وہ ہاتھ بڑھا کر اپنی پیاس بجھا لیتے.. اگر وہ انسانوں کے ساتھ ایسا کر سکتے تھے تو پانیوں کی تو کچھ حیثیت نہ تھی..

میں دیکھ تو نہ سکتا تھا.. لیکن جانتا تھا کہ آنکھوں کی سیاہ تتلیوں کا تہہ میں موجود پانیوں پر تیرتے دل نہ بھرتا تھا.. اگر اُن کا اختیار ہوتا تو وہ وہیں رہ جاتیں.. میں انہیں وہیں رہ جانے دیتا تو عمر بھر دیکھتا کیسے اس لیے میں نے انہیں واپس بلا لیا.. وہ پھڑپھڑا کر پھر سے میرے چہرے کا ایک حصہ بن گئیں لیکن اُن کے مہین پاؤں اور پروں پر جو ذرہ بوندیں تھیں اُس پانی کی جس میں تیر کر وہ آئی تھیں اور جس میں بابا کے ہاتھ تیرے تھے انہوں نے میرے چہرے کو بھی نم کر دیا.. میرا اُجڑا ہوا روپ رنگ رنگیلا ہو گیا..

میں نے ایک گہرا سانس اُس نیم تاریک فضا میں سے کشید کیا اور اس کشید کا خمار عمر بھر کے لیے کافی تھا اور اپنے چہرے کو مجبوراً بابا کے زمانوں سے جدا کر کے اُس شگاف میں سے نکال کر لمحہ موجود کی کڑی دھوپ میں لے آیا..

اس کنویں کا نام "بیئرِ غرس" یا "بیئرِ غرص" بتایا گیا..

اور اس "بیئرِ غرس" کے پانیوں کی پیاس اب تک ہے..

”برادر بلال مسجد قباء میں رسولؐ کی باتیں کرتے ہیں“

ظہر کا وقت ہوا تو ہم مسجد قباء کے آس پاس تھے.....

مسجد کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دائیں جانب ایک چار دیواری کے اندر ادھر اُدھر کچھ پتھر بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور یہ قباء کا قدیم قبرستان ہے.. جانے اس میں کون کون سے حضورؐ کی قربت سے آشنا لوگ.. اُن لوگوں میں سے کوئی جنہوں نے قباء میں ورود پر قصوئی کے سوار کے آگے اپنی آنکھیں بچھائی تھیں.. جو بیتابی سے اُدھر گئے تھے جدھر خبر تھی کہ مدینے کا مسافر ایک شجر تلے آرام کرتا ہے اور یہ نہ جانتے تھے کہ سائے تلے جو دو مسافر ہیں اُن میں سے کون سا محمدؐ ہے.. اور جب ایک مسافر دھوپ میں آیا تو دوسرے مسافر نے اُٹھ کر اُس پر اپنی چادر تان دی.. تو انہوں نے جانا کہ یہ محمدؐ ہیں اور جو سایہ کرتے ہیں وہ اُن کے یار ابوبکر ہیں.. اُن میں سے کچھ لوگ قباء کے اس قبرستان میں ہوں گے..

میں بیان کر چکا ہوں کہ مسجد قباء کی بیرونی دیوار پر ایک تختی آویزاں ہے جس پر یہ حدیث کندہ ہے کہ یہاں دو نفل پڑھنے کا ثواب ایک عمرے کے برابر ہے..

پورے سعودی عرب میں شاید یہ واحد تختی ہے جس پر رسول اللہؐ کی ایک حدیث درج ہے..

ایک دوست جو دین کو سمجھتے ہیں اُنہوں نے اس حدیث کا جواز بتایا کہ مدینے سے بہت سے لوگ حضورؐ سے گلا کرتے تھے کہ چاہتے ہوئے بھی ہم مکہ تک کا طویل اور پر خطر سفر اختیار نہیں کر سکتے.. چاہت رکھتے ہوئے بھی عمرہ کرنے سے قاصر ہیں تو حضورؐ نے اُن کے لیے یہ آسانی پیدا کر دی..

صرف اسی معاملے میں نہیں بلکہ صاحب نے تو ہر معاملے میں اتنی آسانیاں عطا کر دیں کہ گنہگار سے گنہگار شخص بھی آسانی سے آتشِ جہنم سے بچ سکتا ہے.. یہ تو صرف کج کلاہ اور پر خشونت لبے لبادوں والے ہیں جو زندگی بھر میں اگر ایک نماز بھی قضا ہو جائے تو آپ کو جہنم میں دھکیل دیتے ہیں..

مسجد قباء میں داخل ہو کر میمونہ عورتوں کے لیے مخصوص حصے میں چلی گئی تھی..

نماز کے بعد میں نفل ادا کرنے کی خاطر مسجد قباء کے اس منبر کے قریب چلا گیا جس کے بارے میں مجھے اب جا کر علم ہوا تھا کہ یہ مسجد نبویؐ سے یہاں لایا گیا تھا اور منبر رسولؐ ہے.. یہ مسجد قباء کے حصے میں یوں آیا کہ مسجد نبویؐ کے لیے ایک نیا منبر تخلیق کر لیا گیا تھا..

یہ سادہ اور سنگِ مرمر کی سفیدی میں ڈھلا منبر تھا، سجدہ کرتے ہوئے سنگِ مرمر کی تختی نرمی میں بدل جاتی تھی..

مسجد قباء میں ظہر کی وہ نماز اور متعدد نوافل میری یاد میں اتنے واضح نہیں ہیں جتنا واضح وہ سیاہ فام.. براق لباس میں لپٹا وہ امام ہے جس نے نماز پڑھائی..

نماز سے فارغ ہو کر اس نے رُخ ہماری جانب کیا اور آلتی پالتی مار کر ہم سے باتیں کرنے لگا..

بہت مدھم اور شائستہ.. نرم ترین لہجے میں.. اُس ٹھنڈک کی طرح آسودگی دینے والے لہجے میں جو بیئر غرس میں جھانکتے ہوئے میں نے محسوس کی تھی وہ ہم سے.. اُن چند لوگوں سے جو نماز کے بعد وہیں بیٹھے رہے تھے باتیں کرنے لگا..

اور باتیں بھی اُسی ٹھنڈک کے بارے میں کرنے لگا..

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُس نے جان لیا ہے کہ یہ جو سامنے بیٹھا ہوا شخص ہے اس کی دونوں آنکھیں ایسی سیاہ تتلیاں ہوئی تھیں.. اُن پانیوں پر تیری تھیں جن میں حضورؐ کے لب تیرے تھے تو وہ مجھ سے ہی مخاطب تھا.

میں مبہوت ہوا سنتا رہا.. اگرچہ زبان عربی تھی لیکن اس کے باوجود کہیں کہیں کوئی آشنا لفظ ایسا آ جاتا کہ میں مفہوم کا اندازہ لگا لیتا..

اتنے پیار سے.. اتنی آشتی اور امن سے.. اتنے بزرگ ٹھہراؤ سے وہ سیاہ فام.. حضرت بلالؓ کا بھائی نہایت دھیرج سے حضورؐ کی باتیں کرتا تھا.. اور مجھے وہ سعودی نوجوان یاد آتا تھا جو خانہ کعبہ کی جانب ہاتھ اٹھا کر یوں قرأت کرتا تھا جیسے براہ راست اللہ سے مخاطب ہو.. ایسے یہ پر اثر بزرگ یوں باتیں کرتا تھا جیسے حضورؐ موجود ہوں اور وہ مؤدب ہو کر ایک گہرے عشق میں مبتلا اُن کی موجودگی کے تاثرات ہم تک پہنچاتا تھا.. اور مجھے چیختے چلاتے ڈراتے دھمکاتے اپنے وہ خطیب یاد آئے جو بدگمان کرتے ہیں بلکہ بے ایمان کر دیتے ہیں..

وہ حضورؐ کی حیات کے شب و روز یوں ہمارے سامنے بیان کر رہا تھا جیسے آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہو.. اور اس کی تاثیر بھی آنکھوں کی تتلیوں پر اثر کرتی ان کے پر گیلے کرتی تھی..

''آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے...

فارس کا سلمان''

فارس کے سلمان کا باغ..

ایک چٹیل اور گرد آلود بے روح قطعہ زمین.. جہاں ایک پتہ بھی نہ تھا. ایک بوٹا بھی نہ تھا.. اور یہاں چیر دیں چتوں کے ہجوم تھے.. ہجوم نخل تھے.. انہیں سینچنے کے لیے ایک کنواں تھا اور سلمان فارسی تھے..

اصفہان کے ایک گاؤں کے رہنے والے آتش پرست ماں باپ کے بیٹے. حق کی تلاش میں شام گئے عیسائیت اختیار کی.. پھر ایک پیغمبر کی آمد کی نوید ملی تو سرزمین عرب کی جانب چل دیے.. غلام بنا دیئے گئے.. قبا میں حضورؐ سے ملاقات کرنے والوں میں سے تھے اور پھر ہمیشہ کے لیے اُن کے ہو گئے..

مارٹن لنگز ابو بکر سراج الدین اُن کی حیات کی تفصیل بیان کرتے ہیں..

''پیغمبر کو قبا میں خوش آمدید کہنے والے بہت سے لوگ آئے جن میں مدینے کے یہودی بھی شامل تھے جو نیک ارادوں سے نہیں' تجسس کی خاطر آئے.. لیکن دوسری یا تیسری شب ایک ایسا شخص آیا جس کی وضع قطع دوسروں سے سراسر مختلف تھی.. صاف ظاہر ہوتا تھا کہ نہ وہ عرب ہے اور نہ یہودی.. سلمان اس کا نام تھا.. وہ اصفہان کے قریب ایک گاؤں جے میں ایرانی آتش پرست والدین کے گھر پیدا ہوا، نوجوانی میں ہی اس نے عیسائیت اختیار کر لی اور شام چلا گیا.. وہاں اُس نے ایک صوفی بزرگ بشپ کی صحبت اختیار کی' جس نے بستر مرگ پر اُسے وصیت کی کہ وہ اب موصل کے صوفی بشپ کے پاس چلا جائے.. سلمان نے وہاں سے شمالی عراق کی جانب رخ کیا.. جہاں وہ مختلف عیسائی راہبوں کی رفاقت میں رہا اور ان میں سے آخری والے نے بھی اپنے بستر مرگ پر اُسے بتایا کہ یہی وہ زمانہ ہے جب ایک پیغمبر کا

ظہور ہوگا.. وہ ابراہیم کے دین کے ساتھ بھیجا جائے گا اور اس کا ظہور عرب میں ہوگا.. جہاں وہ اپنے گھر سے ہجرت کرے گا ایک ایسی بستی کی جانب جو دو آتش فشانی خطوں کے درمیان واقع ہوگی اور وہاں کھجوروں کے باغ ہوں گے.. اُس کی کچھ نشانیاں عیاں ہوں گی.. وہ تحفے کے طور پر پیش کی گئی خوراک تو کھائے گا لیکن خیرات قبول نہیں کرے گا.. اور اُس کے کندھوں کے درمیان پیغمبری کی مہر ہوگی.''

سلمان نے اُس پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کر لیا اور قبیلہ کلب کے سوداگروں کو کچھ رقم ادا کر کے اُن کے ہمراہ عرب کی مسافت اختیار کی.. لیکن جونہی وہ بحیرۂ احمر کے شمال میں خلیج عقبہ کے قریب وادی القراء میں پہنچے تو ان سوداگروں نے سلمان کو غلام کے طور پر ایک یہودی کے ہاتھوں فروخت کر دیا.. کچھ عرصہ بعد اس یہودی نے سلمان کو مدینے کے بنو قریظہ قبیلے کے ایک عزیز کے پاس بیچ دیا.. اور جونہی سلمان نے مدینے پر نظر کی تو وہ جان گیا کہ وہ پیغمبر ہجرت کر کے اسی مقام پر آئے گا..

سلمان کے نئے مالک کا ایک عزیز جو قبا میں رہتا تھا' رسول اللہؐ کی آمد کی خبر کرنے کے لیے مدینے پہنچا. سلمان کا مالک اُس لمبے کھجور کے ایک درخت تلے بیٹھا تھا اور سلمان اُس درخت پر چڑھ کر کام کر رہا تھا' جب اُس نے قبا کے یہودی کو یہ کہتے ہوئے سنا' ایک شخص مکہ سے آیا ہے اور بہت سے لوگوں کو وہ کہتے ہیں کہ وہ ایک پیغمبر ہے..'' یہ خبر سن کر سلمان کا پورا بدن کانپنے لگا اور اُسے خدشہ ہوا کہ وہ درخت سے گر جائے گا.. اُس شام کچھ بچی کھچی خوراک لے کر وہ قبا کی جانب روانہ ہوگیا' جہاں اُس نے پیغمبر کو اپنے متعدد رفیقوں کے ہمراہ بیٹھا ہوا پایا. جن میں سے کچھ پرانے اور کچھ نئے تھے.. اگرچہ سلمان قائل ہو چکا تھا لیکن پھر بھی اُس نے اُن کی خدمت میں کچھ خوراک پیش کی' یہ کہتے ہوئے کہ یہ صدقے کے طور پر ہے.. پیغمبرؐ نے اپنے رفیقوں سے کہا کہ وہ کھا لیں' لیکن اُس نے خود اس خوراک کو ہاتھ نہ لگایا. سلمان کی تمنا تھی کہ وہ کسی دن مہر رسالتؐ بھی دیکھ لے گا. لیکن پیغمبر کی محفل میں رہنا اور انہیں باتیں کرتے ہوئے سننا ہی پہلی ملاقات کے لیے کافی تھا.. سلمان پُرمسرت اور شکرگزار مدینے واپس چلا گیا.''

اور پھر فارس کے یہی سلمان پیغمبرؐ کو ایک خندق کھودنے کا مشورہ دیتے ہیں اور مدینے کو بچا لیتے ہیں..

انہیں یہ باغ اسی پیغمبر نے عطا کیا تھا جس کی تلاش میں وہ عمر بھر سرگرداں رہے.. غلام بنائے گئے.. بہت مدت نہیں ہوئی جب اس قطعہ زمین پر جو اب ویران تھا. ایک پتے ایک بوٹے کے بغیر.. یہاں کھجور کے وہ درخت موجود تھے جو سلمان کا باغ تھے اور پھر انہیں نابود کر دیا گیا..

البتہ کنواں باقی تھا.. لیکن اُس کے دن بھی پورے ہونے کو آ رہے تھے.. وہ سلمان کی یادوں کا آخری مہمان تھا اور چند روزہ تھا.. رخصت ہوا چاہتا تھا..

جہاں ہماری کار کھڑی تھی.. اُس کے دائیں جانب وہ باغ ہوا کرتا تھا.. اور بائیں ہاتھ پر کسی سکول کی نئی عمارت کا ڈھانچا بلند ہو رہا تھا.. اس کے گرد آہنی جالیوں کا حفاظتی جنگلہ تھا.. اور اس کے اندر وہ دور سے نظر نہ آتا تھا' قریب آنے پر لوہے کے شہتیروں.. سیمنٹ اور سلاخوں کے درمیان قید وہ کنواں نظر آ جاتا تھا.. عمارت کے مکمل ہونے پر اسے اوجھل ہو جانا تھا.. اُسے برقرار رکھنے کا کوئی موہوم سا ارادہ بھی ہوتا تو اُسے عمارت کے رقبے میں شامل ہی نہ کیا جاتا.. اگرچہ ابھی یہی تاثر دیا جا رہا تھا کہ یہ عمارت کے اندر محفوظ رہ جائے گا.. لیکن امکان نہ تھا.. کہ جس پیغمبر کی تلاش میں وہ آتش پرستی اور عیسائیت کے راستوں پر در بدر ہوتا غلامی کی اذیت سہتا بالآخر قبا میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو اس پیغمبر کی نشانیاں اگر اس لائق نہ تھیں کہ انہیں سنبھالا جاتا تو سلمان ایک عامیانہ سے محاورے کے مطابق کس باغ کی مولی تھا.. اُس کے باغ کی کیا حیثیت تھی..

وہ کنواں جتنا بھی نظر آیا.. عمارتی سامان کے درمیان میں جتنا بھی نظر آیا تو مجھے وہ بیئرِ غرس جیسا ہی نظر آیا.. وہی طرزِ تعمیر.. ویسے ہی بڑے بڑے مستطیل سیاہ ہوتے پتھر.. البتہ ان پتھروں کی درزوں میں سے نہ گھاس نکلتی تھی اور نہ کوئی اور نمود ظاہر ہوتی تھی.. شاید اس کی تہہ میں پانی نہ رہے تھے.. اُس کا گھیر بھی بیئرِ غرس جتنا ہی تھا.. اس کی چرخی گھما کر فارس کے سلمان اپنا باغ سینچنے کے لیے پانی تو نکالتے ہی ہوں گے لیکن یہ بھی تو ناممکنات میں سے ہے کہ حضورؐ اپنے اس دور دراز کے شہروں سے آئے ہوئے غیر ملکی صحابی سے ملنے یہاں اکثر نہ آتے ہوں گے اور اس کنویں سے اپنی پیاس نہ بجھاتے ہوں گے۔

لگتا ہے کہ جس جس کنویں نے حضورؐ کی پیاس بجھائی اُسے اس جرم میں بجھا دیا گیا یا بجھا دیا جانے والا ہے.. چاہے وہ بیئرِ عثمان ہو یا بیئرِ غرس یا پھر سلمان فارسی کا کنواں ہو..

کنویں سے پرے کچھ خالی زمین دکھائی دے رہی تھی جس کی جانب یہ نئی عمارت ہولے ہولے بڑھ رہی تھی.. مولا بخش کا کہنا تھا کہ وہاں اس کنویں کی قربت میں اُس کی آنکھوں دیکھے کھجور کے دو درخت ہوا کرتے تھے جو سلمان فارسی کے باغ میں سے تھے اور روایت تھی کہ وہ حضورؐ کے ہاتھوں کے لگائے ہوئے تھے.. اور اُن کی نسل کا تسلسل چلا آتا تھا.. ان دو شجروں سے اُترنے والی کھجوریں مدینہ کی کھجور مارکیٹ میں تین ریال فی کھجور کے حساب سے فروخت ہوتی تھیں تو اس بدعت کے خاتمے کے لیے ان دو درختوں کو کاٹ دیا گیا.. لیکن لوگ پھر بھی بدعت پسندی سے باز نہ آئے اور اُن کے سوکھے

ہوئے تنوں سے لکڑی حاصل کر کے اُن سے تسبیح کے منکے تراشنے لگے.. چنانچہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے.. کچھ اہلِ مدینہ کے پاس ان درختوں کی کھجوروں کی گٹھلیاں موجود ہیں انہیں وہ بطور تبرک رکھتے ہیں.. بدعت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے..

کہا جاتا ہے کہ طائف کی اس مسجد کی مانند جہاں حضورؐ پر پتھر برسائے گئے تھے سلمان فارسی کا باغ بھی جلا دیا گیا تھا..

شاید اس لیے کہ کبھی وہ آتش پرست تھا.. تو اس کے باغ کو جلا ہی دینا چاہیے تھا..

اس شہرِ سنگ دل کو جلا دینا چاہیے..
اور پھر اس کی خاک کو اُڑا دینا چاہیے..

اُن کے لیے جنہوں نے اسے جلایا یہ باغ سنگ دل ہی تھا.. اور ہم ڈھلتی دھوپ میں اُس چٹیل میدان سے اُڑتی ہوئی خاک کو آنکھوں میں اُتارتے تھے..

چاہت تھی کہ اس کی راکھ کو بھی کریدتے..
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہو گا..

راکھ میں سے کریدتے کوئی ایسا درخت بھی نمودار ہو جاتا جس کے تنے سے لپٹ کر ایک غلام نے نیچے سے ایک آواز سنی تھی کہ وہ قبا میں پہنچ گیا ہے اور اس خبر سے اس کا ایرانی بدن کپکپانے لگا تھا.. اُسے خدشہ ہوا کہ وہ کھجور کے درخت سے گر جائے گا..

تب وہ نہ گرا..
اب اُسے گرا دیا گیا..

''سلمان فارسی کی خندق..
اور بابا نے جہاں خیمہ لگایا تھا''

سلمان فارسی کے باغ سے اُس کے مشورے سے کھودی ہوئی خندق کے مقام تک جانا ایک قدرتی سفر تھا۔۔

اگرچہ نہ اُس کا باغ رہا تھا اور نہ اُس کی خندق کا کوئی نشان باقی تھا۔۔

اس خندق کو کھودنے کے دوران غربت اور فاقہ کشی کے دوران ایک صحابی نے شکایت کی کہ اے اللہ کے رسولؐ یہ دیکھئے' میں نے پیٹ پر پتھر باندھ رکھا ہے تو حضورؐ نے کہا' تم دیکھو کہ میرے پیٹ پر ایک نہیں دو پتھر ہیں تاکہ بھوک کے عذاب کو سہہ سکوں۔۔

جابر بن عبداللہ نے آپؐ کی یہ حالت دیکھی تو ایک بکری ذبح کی اور بیوی سے کہا ''تم جو پیس کر روٹیاں تیار کرلینا۔۔ میں رسول اللہؐ کو دعوت دے رہا ہوں۔''

''کھانا کتنا ہے جو آپؐ نے تیار کروایا ہے؟'' رسول اللہؐ نے دریافت کیا۔۔

جابر نے عرض کیا ''ایک چھوٹی سی بکری کا گوشت ہے اور جو کی روٹیاں ہیں۔۔''

اُن کی بیوی نے دیکھا کہ رسول اللہؐ اپنے ہمراہ بہت سے انصار اور مہاجرین کو بھی لا رہے ہیں۔۔ آج تو رسوائی ہو جائے گی۔ اُس نے سوچا' کھانا تو بہت کم ہے۔

رسول اللہؐ نے گوشت کے برتن سامنے رکھے اور بسم اللہ پڑھ کر اپنے دست مبارک سے گوشت اور روٹیاں تقسیم کرنے لگے۔۔

کل صحابہ اور ساتھیوں نے جی بھر کے کھایا مگر ہانڈی میں گوشت پھر بھی بھرا ہوا تھا۔۔

''اب تم خود کھاؤ اور پڑوسیوں کو بھی بھیجو۔'' رسول اللہؐ نے کہا۔۔

عین اس مقام پر جہاں جابر بن عبداللہ کا گھر تھا' وہاں اب ایک شاندار پٹرول پمپ تعمیر کردیا گیا ہے شاہانہ کاروں کے ٹینک بھرے جاتے ہیں' برگر اور فرنچ فرائز میسر ہیں۔۔

کسی شخص کو اس زندگی میں اور کیا چاہیے۔۔ بکری کا گوشت اور جو کی روٹی یا برگر اور فرنچ فرائز۔ ایک صحابی کا مکان جہاں حضورؐ نے کھانا تناول فرمایا تھا' یا ایک پٹرول پمپ۔۔ یقیناً ایک پٹرول پمپ۔۔

وہی مقام تھا سات مسجدوں والا۔۔ جنگ خندق کے دوران جہاں صحابہ کرامؓ رسول اللہؐ اور اُن کے عزیز و اقارب خیمہ زن ہوئے تھے عین اُن جگہوں پر چھوٹی چھوٹی مسجدیں تعمیر کی گئی تھیں۔۔ جو اب مسمار کی جا رہی تھیں اور اُن کی جگہ ایک عظیم الشان مسجد اُس چٹانوں سے بھری بلندی کے دامن میں تعمیر کی جا رہی تھی جس کے آس پاس یہ سات مسجدیں ہوا کرتی تھیں۔۔

حج کے بعد جب یہاں آئے تھے تو یونہی متاسف ہو کر چلے گئے تھے۔۔

مسجد فاطمہ تب مقفل تھی اور اب بھی تھی' البتہ ہم اس بارے میں جانے کیوں لاعلم رہے کہ چٹان کے دامن میں چند سیڑھیوں طے کرنے کے بعد جو چھوٹی سی مسجد نظر آتی تھی وہ سلمان فارسی کی خیمہ گاہ تھی۔۔ اور اُس سے اوپر وہاں۔۔ جہاں سے یہ سارا علاقہ جنگ خندق کا علاقہ۔۔ قدموں کے سامنے بچھا نظر آتا ہے جیسے ایک طائر اُس پر نظر کرتا ہے تو وہاں جو مسجد فتح تھی وہ اُس مقام پر تھی جہاں حضورؐ نے اپنا خیمہ نصب کیا تھا۔۔

میں جنگ خندق کو حج کے سفرنامے میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں اب میں سلمان فارسی اور رسول ﷺ کے خیموں کے قریب جاتا ہوں۔۔

پہلے اُس کبھی آتش پرست اور کبھی صلیب پرست کے خیمے کی جانب جاتا ہوں جو اللہ پرست ہوا۔۔ اور جس کا آتش زدہ باغ ہم دیکھ کر آئے تھے۔۔ جو حضورؐ کے ظہور کی خبر سن کر کھجور کے درخت سے گرنے والا ہو گیا تھا۔۔

وہاں تک۔۔ پہاڑ میں کھدی ہوئی۔۔ دھوپ میں جھلستی سیڑھیاں جا رہی تھیں اور ہم دونوں بار بار سانس درست کرنے کے لیے رُکتے۔۔ میں اور میمونہ۔ پسینہ پونچھتے سلمان فارسی کے پاس ہو گئے۔۔

مسجد بہت مختصر۔۔ ایک نشان کے طور پر کہ یہاں خندق کھودنے کا مشورہ دے کر نبیؐ کی بستی کو بچانے والے فارس کے سلمان نے خیمہ لگایا تھا۔۔

ایک کمرے کے سائز کی چھوٹی سی مسجد اور ایک مختصر صحن۔

بہت بے آباد۔۔ ویران۔۔ دیواروں پر مارکر اور پینٹ سے زائرین نے اپنے نام لکھے ہوئے۔۔ اور اُس کی حیات بھی لگتا تھا کہ چند روزہ ہے۔۔ جب دامن میں تعمیر ہونے والی شاندار مسجد مکمل ہو

جائے گی تو اس مقام کا جواز باقی نہ رہے گا.. چونکہ وہ بھی آتش پرست رہا تھا تو اس کی خیمہ گاہ کے مقام کے نشان کو بھی راکھ کر دیا جائے گا..

میمونہ باہر صحن میں نفل ادا کرنے میں مصروف تھی..

اور میں مسجد کی زبوں حالی کے اندر تنہا سلمان فارسی سے پوچھ رہا تھا کہ اے سلمان کیا آتش پرست ہونے کے باعث تم میں وہ کیسی آگ بھڑکی کہ تم نے اپنے ماں باپ اور وطن کو ترک کیا.. کبھی راہبوں کے خادم ہوئے اور کبھی یہودیوں کے غلام ہوئے صرف اس لیے کہ میرے بابا کو پاسکو.. اصحاب صفہ کے تھڑے پر اپنا مقام بنا سکو اور پُرشکوہ اور صاحب اقتدار ہستیوں کی نسبت ایوب انصاری' ابوذر غفاری' عبیدہ بن الجراح' عبداللہ بن مسعود' عبداللہ بن عمر اور حلیمہ سعدیہ کی مانند میرے دل میں بھی مقام بنا لو.. تم کیسے نصیب والے تھے کہ تم جس کی کھوج میں تھے اُسے قباء میں اپنے سامنے حاصل کر لیا.. اور میں کیا نصیب لے کر آیا ہوں کہ میرے دل کی بدگمانیاں نہیں جاتیں.. میں اگر تیری طرح ایک آتش پرست پیدا ہوتا تو شاید میں بھی تجھ ایسے نصیب والا ہو جاتا..

مسجد سلمان فارسی سے آگے بلکہ چٹان کی بلندی پر اس سلمان کے آقا نے اپنا خیمہ لگایا تھا اور یہاں میں نے ایک ہلکی سی خوشی ایک بے نام سا فخر محسوس کیا کہ مجھے ایک خلش کا جواز مل گیا تھا..

حضرت عمر فاروقؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی جنگ خندق کے دوران خیمہ گاہیں اس چٹان کے قدموں میں کیوں ہیں.. اور ان سے ذرا بلندی پر سلمان فارسی کا خیمہ کیوں تھا.. حضورؐ کے خیمے کے راستے میں اور اُن سے قریب تر کیوں تھا.. شاید اس لیے کہ اس جنگ کی حکمت عملی سلمان فارسی کے ذہن کی تخلیق تھی اور انہیں ہی سپہ سالار کے قریب تر ہونا چاہیے تھا..

مسجد فتح تک جاتی ہوئی بہت سی سیڑھیاں تھیں اور وہ سب کی سب دھوپ میں سلگتی تھیں..

"مجھ میں سکت نہیں.. آپ ہو آیئے." میمونہ نے کہا.

"اوپر حضورؐ کی خیمہ گاہ ہے."

"مجھ میں ہمت نہیں." اور وہ نیچے اتر گئی..

ہمت تو مجھ میں بھی نہیں تھی لیکن اوپر سے بلاوے میں بہت شدت تھی.. بابا خیمہ زن تھے..

میں اپنے آپ کو اپنے سانس کو سنبھالتا دھوپ کی شدت برداشت کرتا آہستہ آہستہ بلند ہو گیا.. یہ خیال کرتے ہوئے کہ اُن زمانوں میں تو یہ سیڑھیاں نہ تھیں تو بابا کیسی مشقت سے اوپر پہنچتے ہوں گے لیکن پھر جبل نور کی بلندی پر غارِ حرا کا خیال آیا کہ کوہ پیما لوگ تو وہاں تک بھی جا پہنچتے تھے تو اس چڑھائی کو کہاں خاطر میں لاتے ہوں گے..

میں اُس ٹیلے پر پہنچ ہی گیا جہاں مسجد فتح بلندی کی دھوپ میں سلگتی تھی..

جہاں سرکار کے خیمے کی میخیں چٹانوں میں پیوست تھیں..

اس مقام پر مسجد فتح تھی.. یہاں ہوا تیز تھی.. یہ بھی مختصر تھی اور جب میں وہاں پہنچا تو صد شکر کہ ویران تھی..

دائیں جانب مدینے کے شہری آبادیوں میں یہ چٹانیں اُترتی تھیں اور بائیں ہاتھ کہیں نشیب میں عبداللہ بن جابر کے گھر پر قابض وہ پٹرول پمپ تھا اور بچی کھچی مسجدیں تھیں.. ٹریفک کا شور مدھم ہو چکا تھا کہیں پیچھے رہ گیا تھا.. اس بلندی سے کہ یہ مقام ایسا تھا نشیب میں پھیلا ہوا پورا علاقہ اور دائیں جانب سلع نامی چٹانیں نظر آ رہی تھیں..

تو یہاں بھی میرے تصور کی کھڈی پر ایک ہی خیال کھٹ کھٹ کرتا رہا کہ بھلا بابا کا خیمہ جو یہاں نصب تھا' کیسا تھا' وہ خیمہ جو انہوں نے چھن چھن کرتی قصوئی سے اتر کر جبل رحمت میں اپنے سامنے پایا تھا تو وہ تو اونٹ کے سیاہ بالوں سے بنا ہوا تھا.. تو کیا یہاں بھی وہی خیمہ تھا.. میری کوہ نوردیوں کے ساتھی خیموں ایسا شوخ اور بھڑکیلے رنگوں کا تو نہ ہوگا تو کیسا ہوگا.. ظاہر ہے اُس کے پردے اس منظر پر کھلتے ہوں گے جس میں بہت نیچے بل کھاتی سلمان کی خندق دکھائی دیتی ہوگی.. اور اس کے پار دس ہزار قریش کا غضب آلود لشکر.. ہزاروں سانڈنیاں.. گھوڑے.. تلواریں.. نیزے اور بھالے دھوپ میں چمکتے دکھائی دیتے ہوں گے..

جیسے میں کوہ نوردی کی اذیت کے دن کے آخر میں اپنے پورٹروں سے کہتا تھا کہ میرا خیمہ ایسے مقام پر نصب کرنا جہاں سے "منظر" دکھائی دیتا ہو.. ایسے بابا نے بھی ہدایت کی ہوگی کہ میرا خیمہ ایسے مقام پر لگانا جہاں سے "منظر" نظر آتا ہو..

ویسے یہ بھی عین ممکن ہے کہ بابا نے صحابہ کو تکلیف دینا گوارا نہ کیا ہو اور اپنے ہاتھوں سے خیمے کی میخیں ٹھوکی ہوں.. اُس کی خطا میں کسی ہوں کہ وہ اپنے کام اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے.. اپنے کرتے کے پیوند خود لگاتے تھے.. اپنے جوتے خود گانٹھتے تھے اور اُن میں میخیں لگاتے تھے تو یہی قرین از قیاس ہے کہ انہوں نے اس مقام پر کسی کی مدد طلب نہ کی تھی اور اپنے خیمے کی میخیں اپنے ہاتھوں سے ٹھوکی ہوں گی..

ایک کوہ نورد کسی دوسرے پر انحصار نہیں کرتا..

میخیں اُس کے جوتے کی ہوں یا خیمے کی اپنے ہاتھوں سے ٹھوکتا ہے..

میں مسجد فتح کی مکمل تنہائی میں داخل ہوا..

بہت معمولی.. بہت ویران.. دیواروں پر زائرین کی بدتمیزیاں اُن کے ناموں کی صورت میں.. ایک دو جائے نماز.. باہر صحن میں دھوپ کی تیزی..!

اس مختصر مسجد میں وہ مقام تھا جہاں حضورؐ کا خیمہ نصب تھا..

میں ہوتا تو خواہ مخواہ کوئی میخ اکھاڑ کر کہتا' بابا یہ میخ کس نے گاڑی تھی.. اس نے تو ذرا سی ہوا کے چلتے ہی اکھڑ جانا تھا.. میں گاڑ دوں.. یہ طنابیں قدرے ڈھیلی ہیں انہیں کس دیتا ہوں.. میں یہیں آس پاس بیٹھا رہتا ہوں خیمے کی کوئی پرابلم ہو تو مجھے بلا لیجیے گا.. میں بہت ایکسپرٹ ہوں خیمے لگانے کا..

مسجد فتح کے فرش پر سجدہ کرتے ہوئے میں نے بابا کی موجودگی محسوس کی.. گویا وہ وہاں تھے.. جہاں وہ بہت راتیں سوئے تھے یا جاگتے ہی رہے تھے اور اُن کے خیمے کے پردوں کے پار جو منظر تھا اس میں خندق کے پار قریش کے غضب ناک لشکر کے الاؤ جلتے تھے..

اور وہ ذرا نشیب میں مقیم سلمان فارسی کو آواز دیتے تھے کہ اے سلمان تمہیں یقین ہے کہ قریش اس خندق کے پار نہیں آئیں گے..

اور سلمان کہتے ہیں.. میں تیرے لیے یونہی دربدر تو نہیں ہوا.. تیرے عشق میں آتش پرستی ترک کر کے یونہی غلام تو نہیں ہو گیا.. تیری آمد کی خبر سن کر کھجور کے درخت پر چڑھے کام کرتے کیا یونہی مسرت سے بے اختیار ہو کر کانپنے تو نہیں لگا تھا.. جو قریش اس خندق کے پار آ جائیں گے..

''تیراندازوں کا ٹیلہ اور جس گڑھے میں حضورؐ گرے تھے.. عشق پر پلستر نہیں کیا جا سکتا''

جیسے میں پھر مدینے میں تھا..

ایسے میں پھر اُحد میں تھا..

اگرچہ میں جنگ اُحد کو نہایت تفصیل سے بیان کر چکا ہوں پھر بھی اُحد کی تیز ہوا میں کچھ پھڑپھڑاتی ہوئی آوازیں بار بار سنائی دیتی جاتی تھیں..

''ہماری طرف دیکھو ہم زہرہ اور مشتری کی کوکھ سے پیدا ہونے والیاں ہیں..'' ہندہ اور قریش کی عورتیں اپنے مردوں کو مسلمانوں سے جنگ بدر کا انتقام لینے کے لیے ابھار رہی تھیں..

''مجھے تمہاری شکست کا خطرہ ہے..'' رسول اللہؐ اپنی رائے کو پھر دوہرا رہے ہیں..

''کسی نبی کی شایاں نہیں کہ وہ زرہ بکتر پہن لینے کے بعد دشمن کا مقابلہ کیے بغیر زرہ اتار دے..''

''کون ہے جو یہ تلوار لے کر اس کا حق ادا کرے..''

جبیر اپنے غلام سے کہہ رہا ہے..'' اے وحشی.. اگر تو میرے چچا طعمہ کے بدلے میں محمدؐ کے چچا حمزہ کو قتل کر دے گا تو میری طرف سے تو آزاد ہو گا''

وحشی کہہ رہا ہے ''اب حمزہ میری طرف لپکے.. لیکن وہ شکستہ ہو چکے تھے.. زمین پر گر پڑے.. میں نے انہیں اسی حالت میں چھوڑ دیا تا آنکہ وہ جاں بحق ہو گئے..''

صفیہ اپنے حقیقی بھائی حمزہ کو دیکھنے کے لیے اُحد میں پھرتی تھیں..

رسول اللہؐ حضرت حمزہ کی لاش پر کھڑے ہو کر کہہ رہے ہیں'' مجھے کبھی اتنا غم اور صدمہ نہیں پہنچا جتنا تیری شہادت سے پہنچا ہے..''

"لیکن حمزہ پر رونے والی عورتیں نہیں ہیں.."

انصار اپنی عورتوں سے کہہ رہے ہیں.. "جاؤ اور رسول اللہ ﷺ کے چچا پر نوحہ کرو"

اُحد حمزہ کے سوا کیا ہے.. محض ایک خشک پہاڑ..

اس خشک پہاڑ کے دامن میں چونکہ حمزہ دفن ہیں اس لیے وہ پہاڑ بھی معتبر ہو گیا.. امیر الشہداء اُسی مقام پر دفن ہیں جہاں وحشی نے انہیں شہید کر دیا.. حفاظتی شیشے کی اوٹ سے چار دیواری کے اندر جو چند پتھر پڑے تھے میں نے اُن پر نگاہ کرتے ہوئے حضرت حمزہؓ کے لیے فاتحہ پڑھی اور مڑ کر اس ٹیلے کی جانب دیکھا جو اُحد کے میدان میں ابھرا ہوا تھا' اور آج بھی ایرانی زائرین کے سیاہ لبادے اُس کی بلندی پر پھڑ پھڑاتے تھے..

"شیخ صاحب.. اس ٹیلے کی بھی کوئی تاریخی اہمیت ہے یا لوگ یونہی عقیدت کی خاطر اس کی بلندی تک جاتے ہیں.."

"یہ وہی ٹیلہ ہے تارڑ صاحب.." شیخ صاحب نے فاتحہ سے فارغ ہو کر مڑ کر دیکھا "جس کی وجہ سے یہ جنگ ہاری گئی تھی.. تیر اندازوں کا ٹیلہ.."

میرے لیے یہ ایک خبر تھی.. پچھلی مرتبہ جب مولا بخش کے ہمراہ اُحد آیا تھا تو میں ہرگز آگاہ نہ ہوا کہ یہی وہ ٹیلہ ہے جس نے اس جنگ کا فیصلہ کیا تھا.. جہاں تیر اندازوں کو تعینات کیا گیا تھا.. اور تب میں حیرت میں مبتلا ہوتا تھا کہ آخر زائرین اس کے اوپر کیوں جا رہے ہیں..

اب میں نے بھی اوپر جانا تھا..

اس کی بلندی کچھ زیادہ نہ تھی..

باغِ جناح کی کسی پہاڑی سے نصف کے قریب ہو گی..

البتہ اس کی چوٹی پر پہنچ کر احساس ہوتا تھا کہ اس کی اونچائی اتنی کم بھی نہیں کیونکہ وہاں کھڑے ہو کر دائیں ہاتھ پر مدینے کی بستیاں نظر آ رہی تھیں اور ان سے پرے وہ پہاڑی سلسلے جو اس بستی کے داخلے پر واقع تھے' اور بائیں جانب اس ٹیلے کے نیچے حضرت حمزہؓ کے مزار کے آثار تھے.. پھر کچھ خالی زمین تھی اور اس سے آگے ایک بے ترتیب آبادی شروع ہو جاتی تھی جو جبلِ اُحد کی چٹیل بلندی کے ہی جا رکتی تھی.. اُحد کے سلسلے کے آخری حصوں کے قریب ہم سے چار پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر کھجوروں کے نہایت گھنے باغ ایک وسیع علاقے پر چھائے ہوئے تھے..

"وہاں سیاحوں کے لیے ایک پارک اور دیگر عمارتیں تعمیر کی جا رہی ہیں اُن باغوں کے جھنڈ میں.." شیخ صاحب نے اُدھر اشارہ کیا..

"یعنی جنگِ اُحد کے حوالے سے کوئی تھیم پارک بنایا جا رہا ہے؟" میں نے پوچھا..

"نہیں.. تاریخ کا کوئی حوالہ نہیں.. ایک تفریحی پارک ہو گا.."

تاریخ سے یاد آیا کہ شیخ صدیق تاریخ کے حوالے سے ہی میرے ہمراہ تھے.. مدینہ میں ڈپٹی ڈائریکٹر حج تھے اور بہت "تاریخی" تھے یعنی تاریخ سے بے حد شغف رکھتے تھے.. سلجوق نے ان سے درخواست کی تھی کہ اباجی کو بھی یہی عارضہ لاحق ہے تو ان کا کچھ دوا دارو کریں..

چنانچہ وہ میرا دوا دارو کرنے کی خاطر مجھے اُحد لے آئے تھے.. میری تمنا بھی یہی تھی کہ اُحد کو از سرِ نو تاریخی تناظر میں دیکھا جائے.. یعنی تاریخی مقامات کی نشاندہی کی جائے.. اور وہ ہو رہی تھی..

کچھ زائر ٹیلے پر نفل ادا کر رہے تھے..

ہوا تیز تھی اور اُحد کے بیچ کچھ میدان میں جو مٹی تھی اس کے ذروں کو فضا میں اڑاتی تھی.. اسی فضا میں جس میں ایرانی زائرین کے سیاہ لبادے اور ماضی کی آوازیں پھڑ پھڑاتی تھیں..

"تم نے کسی بھی حالت میں اس ٹیلے کو نہیں چھوڑنا چاہے ہم جنگ جیت بھی جائیں تب بھی نہیں.."

شیخ صاحب کے سامنے جیسے ایک نقشہ کھلا تھا.. وہ جنگ کو میرے سامنے زندہ اور متحرک کرنے لگے.. "قریش اوپر سے مدینے کے اوپر سے اس میں داخل ہوئے بغیر اس سامنے والے میدان کے قریب خیمہ زن ہوئے تھے.. اور حضورؐ اپنی سپاہ کے ہمراہ اِدھر سے بستی کی جانب سے تشریف لائے تھے اور سب سے پہلا کام یہی کیا تھا کہ ماہر تیر اندازوں کو خود اس ٹیلے پر قریش کی جانب رخ کیے ہوئے متعین کیا تھا.."

"یعنی حضورؐ بھی اس ٹیلے پر چڑھے تھے.."

"جی ہاں.. ایسا ہی ہوا ہو گا.."

اگر ایسا ہوا تھا تو وہ کہاں کھڑے ہوں گے.. یہیں کہیں میرے آس پاس انہی سنگریزوں پر.. اور اسی منظر کو دیکھتے ہوئے جو میری نظروں کے سامنے پھیلا ہوا تھا.. اور انہیں علم نہ تھا کہ ٹیلے کے عین نیچے اس کھلی جگہ پر ابھی تھوڑی دیر کے بعد ان کے چچا حمزہ حبشی کے بھالے کا شکار ہو کر دم توڑ رہے ہوں گے اور ہندہ ان کے اعضاء کاٹ کر ان کا ہار اپنے گلے میں ڈال کر اُحد کی ایک چٹان پر کھڑی ہو کر چیخ رہی ہو گی..

"آج جنگِ اُحد میں ہم نے جنگِ بدر کا بدلہ اُتار دیا.. بس میں ساری عمر وحشی کی شکر گزار رہوں گی یہاں تک کہ میری ہڈیاں قبر میں نہ گل جائیں.."

"یہ تصور کسی حد تک باطل ہے کہ سب کے سب تیر انداز اس ٹیلے کو چھوڑ کر صرف مالِ غنیمت حاصل کرنے کی خاطر اتر گئے تھے.. نہیں.. اُن میں سے کچھ وہیں ڈٹے رہے.. انہوں نے ٹیلہ چھوڑنے سے انکار کر دیا کہ ان سے یہی کہا گیا تھا.. وہ سب کے سب بعد میں مدافعت کرتے شہید ہو گئے..... خالد بن ولید براہِ راست ادھر نہیں آئے تھے بلکہ اپنے گھڑ سواروں سمیت جبلِ اُحد کے عقب میں روپوش ہوئے اور پھر اس ٹیلے کے پیچھے نمودار ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہو گئے.."

جیتی ہوئی جنگ ہار میں بدل گئی..

"اس ٹیلے کی بلندی کچھ زیادہ نہیں.."

"چودہ سو برس گزر چکے ہیں.. اور ان برسوں میں جتنی ہوائیں چلی ہیں اور طوفان اٹھے ہیں ان کے باعث اس کی بلندی کسی حد تک ان دنوں کی نسبت کم ہو چکی ہے.."

یہاں بھی وہی خیال آیا کہ آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں..

لیکن صرف ایک پتھر اٹھانے سے اس ٹیلے کی بلندی میں کمی آتی تھی جو مجھے گوارہ نہ تھا..

"اگر آپ نیچے دیکھیں.. جدھر سے ہم آئے ہیں اس کی دوسری جانب جہاں سے ٹیلا شروع ہوتا ہے وہاں ایک چھوٹی سی دیوار ہوا کرتی تھی.. اب بھی چند اینٹیں موجود ہیں.. مجھے معلوم نہیں کہ ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟"

وہ چند اینٹیں.. موجود تھیں اور بہت قدیم زمانوں کی لگتی تھیں..

"عتبہ کے پتھر سے رسولؐ کا ہونٹ کٹ گیا.. اور دائیں طرف کا نیچے کا دانت ٹوٹ گیا.. ابن قمیہ کے وار سے خود کی کڑیاں رسولؐ کے رخساروں میں دھنس گئیں.. آپ کی پیشانی پر وار کر کے عبداللہ بن شہاب نے اسے خون آلود کر دیا.. آپ اپنے بچاؤ کی خاطر ایک گڑھے میں کود گئے.. یا نڈھال ہو کر گر گئے.. یہ گڑھے ابو عامر نے مسلمانوں کو زک پہنچانے کے لیے کھودے تھے.."

"شیخ صاحب.. میں نے بہت سوں سے دریافت کیا ہے اور آپ سے بھی پوچھتا ہوں کہ کیا آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہؐ زخمی ہو کر کہاں.. یہاں اُحد کے میدان میں کس مقام پر ایک گڑھے میں گرے تھے؟"

"ہاں.. میں جانتا ہوں.."

"تو مجھے وہاں لے چلیے.."

"میں جتنا جانتا ہوں اس کے مطابق.. ذرا امیر حمزہ کے مزار سے پرے جبلِ اُحد کے دامن

تک پھیلی ہوئی آبادی کی جانب غور سے دیکھیے.. تو وہاں اُحد کے پہاڑ کے عین نیچے وہ گڑھا ہے.. جس میں حضورؐ گرے تھے.."

"تو چلیے.."

میرے ذہن میں ساخت کی کچھ بڑی خرابی ہے جس کے باعث میں معتدل نہیں رہتا میں تاریخ کے بڑے بڑے اہم اور شاندار واقعات سے بے اثر رہتا ہوں اور کسی ایک چھوٹے اور معمولی واقعے کا مجھ پر اثر ہو جاتا ہے.. جنگِ اُحد میں حمزہؓ کی شہادت.. ابو دجانہ کا اکڑ کر چلنا.. رسولؐ کے لیے ام عمارہ کا درجنوں زخم سہنا.. تیر اندازوں کا ٹیلہ چھوڑنا سب اپنی جگہ لیکن بابا کا زخمی ہو کر ایک گڑھے میں گر جانا ان سب پر فوقیت لے جاتا ہے.. تو اس "تو چلیے" میں اسی دماغی خلل کی اثر اندازی کی بے تابی تھی.

"چلتے ہیں" شیخ صاحب نے اطمینان سے کہا "لیکن اس ٹیلے سے اترنے سے پیشتر میں ایک اور اہم مقام کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں.. جو یہیں سے ہو سکتی ہے.. جہاں آبادی جبلِ اُحد کے دامن میں جا کر رکتی ہے اور پہاڑ بلند ہوتا ہے.. تو وہاں ذرا غور سے دیکھیے.."

میں جتنے غور سے دیکھ سکتا تھا دیکھتا رہا..

"دامن سے ذرا اوپر اُحد کی چٹانوں میں آپ کو کوئی کھوہ نظر آتی ہے.."

"نہیں نظر آتی.."

"ایک سیاہ دھبہ نظر آتا ہے؟"

"ہاں وہ کچھ کچھ نظر آتا ہے.. کیا ہے؟"

"روایت ہے کہ جب صحابہ کرامؓ نے حضورؐ کو اس گڑھے میں سے نکالا.. تو ذرا بلندی پر لے گئے.. اور اس کھوہ میں لے گئے.. شاید ابو عبیدہ نے اسی کھوہ میں ان کے رخساروں میں کھبی ہوئی کڑیاں دانتوں سے نکالی تھیں.."

یک نہ شد.. دو شد..

دماغی خلل اندازی کی اب تو حد ہی ہو گئی. "شیخ صاحب.. وقت ضائع نہ کیجیے.. مجھے لے چلیے.. ویسے آپ اس کھوہ کے اندر گئے ہیں؟"

"نہیں.. وہاں دامن میں عام طور پر پولیس کے ایک دو سپاہی تعینات ہوتے ہیں جو کسی کو اوپر نہیں جانے دیتے.. میں بھی نہیں گیا"

"پھر بھی لے چلیے.."

ہم دونوں ٹیلے سے اترے..

اس سے پیشتر "ہم دونوں" سے مراد ہوتی تھی میں اور میمونہ.. تو میمونہ کہاں تھی..

اس نے کہا تھا کہ میں تو مدینے میں صرف اس لیے آئی ہوں کہ مسجد نبویؐ میں کچھ وقت گزار سکوں.. روضۂ رسولؐ کے آس پاس منڈلاتی رہوں.. آپ ہو آیئے جدھر بھی آپ نے تاریخ کے لیے ہونا ہے..

چنانچہ ہم دونوں.. یعنی میں اور شیخ صاحب ٹیلے سے اترے.. ان کی کار میں سوار ہوئے اور جبلِ اُحد کے سائے میں پھیلتی ہوئی بے ترتیب بستی میں چلے گئے.. جیسے ایسی بستیاں ہوا کرتی ہیں.. گلیوں میں فٹ بال کھیلتے بچے.. بے مقصد گھومتے نوجوان.. بند دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھے ہوئے بوڑھے اور کھڑکیوں میں سے جھانکتی عورتیں.. اور وہ سب ہماری کار کی جانب متوجہ ہو جاتے تھے کہ یہ کس سلسلے میں ادھر نکل آئے ہیں.. شاید بھٹک گئے ہیں.. امیر حمزہ کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر واپس مدینے کیوں نہیں چلے گئے..

شیخ صاحب صرف ایک بار بھٹکے.. یکدم اپنے سامنے اُحد کی چٹانوں کو پایا اور پھر بیک گیئر لگا کر راہِ راست پر آ گئے.. ویسے وہ اپنے راستے جانتے تھے..

بستی جہاں ختم جاتی تھی.. رُک جاتی تھی.. جہاں سے اُحد کے سلسلے کا آغاز ہو جاتا تھا وہاں شیخ صاحب نے کار روک دی..

کچھ اہلِ اُحد نے ہم دونوں پر تشویش کی نگاہیں ڈالیں کہ یہ یہاں کیا کر رہے ہیں اور پھر اگلے لمحے ہم سے غافل ہو گئے.. اور ہم ان کی غفلت کے شکر گزار ہوئے.. جہاں سے اُحد کے پہاڑ کا آغاز ہوتا تھا' وہاں ایک چٹان.. مختصر جسامت کی ایک عام کمرے کے حجم جتنی ساکت تھی.. شیخ صاحب مجھے اس کے قریب لے گئے اسے اور اس کے دامن کو غور سے دیکھا اور پھر تاسف سے بولے "پچھلی بار جب میں یہاں آیا تھا تو اس چٹان کے نیچے ایک چھوٹا سا گڑھا موجود تھا.. زیادہ گہرا نہیں تھا.. اس میں گرا تو نہیں جا سکتا تھا لیکن وہ موجود تھا.."

جہاں وہ گڑھا.. یا اس کی نشانی کچھ عرصہ پہلے موجود تھی.. وہ نشانی پُر ہو چکی تھی.. اسے سیمنٹ اور بجری سے پاٹ دیا گیا تھا.. وہاں صرف ایک ناہموار سطح تھی.. اور تازہ تازہ پُر کی ہوئی.. سیمنٹ شدہ..

شیخ صاحب یوں شرمندہ ہوئے جیسے انہوں نے ذاتی طور پر اس گڑھے کو بھر کر اس پر پلستر کر دیا ہو جس میں بابا زخمی ہو کر گر گئے تھے "یہاں بھی کبھی کبھی کوئی زائر آ جاتا تھا اور گریہ کرتا تھا حضورؐ کے زخموں اور دانتوں کے شہید ہونے کی یاد میں.. تو شاید اس لیے اسے انہی دنوں نابود کر دیا گیا ہے.."

"حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے یارِ غار کی جانب دوڑے.. باقی صحابہ بھی "چڑیوں کی مانند" اُڑتے رسول اللہؐ کی گرد جمع ہو گئے.. حضرت علیؓ نے جھک کر ان کا ہاتھ تھاما.. طلحہ بن عبید اللہ نے سہارا دے کر آپ کو اٹھایا اور سیدھا کھڑا کر دیا.. مالک بن سنان نے آپؐ کے چہرے سے خون چوس چوس کر تھوکا.."

وہ گڑھا.. یا جہاں اُس کے ہونے کا امکان تھا.. چودہ سو برس تک موجود رہا اور اب جا کر وہ شرک کی زد میں آیا اور سیمنٹ اور بجری سے بھر کر پختہ اور ہموار کر دیا گیا.. جو نے نوازی حضرت علیؓ، ابوبکر صدیقؓ.. عبیداللہ بن جراح اپنے رسولؐ کی اُلفت میں کرتے تھے.. وہ نے نوازی اس گڑھے کے کچھ کام نہ آئی..

اس گڑھے میں بابا کا جو خون گرا تھا.. شاید دانت بھی گرے تھے.. وہ سب دفن کر کے اُن پر سیمنٹ کا پلستر کر دیا گیا تا کہ شرک کا قلع قمع کر دیا جائے..

پر شرک یوں تو نابود ہونے سے رہا..

عشق تو موجود رہتا ہے.. اس پر پلستر نہیں ہو سکتا..

وہ موجود رہتا ہے..

''اندر... اندر میرے رسولؐ کی خوشبو ہے''

بستی اُحد کے پہاڑ کے قریب ہوتے ہی تھم گئی تھی..

پہلو میں جو چھوٹی سی سڑک تھی اُسے بھی اُحد کی چٹانوں نے روک لیا تھا.

اور ہماری کار بھی جہاں سڑک کا اختتام ہو رہا تھا وہاں رُکی ہوئی تھی..

سیمنٹ شدہ گڑھے سے ذرا آگے ہم ہوئے. اُحد کے دامن میں کھڑے ہو کر اوپر دیکھا.. سطح زمین سے تقریباً چالیس پچاس فٹ کی اونچائی پر اُحد کی اونچی نیچی چٹانوں میں ایک کھوہ کی تاریکی صاف دکھائی دے رہی تھی..

حضورؐ نے فرمایا ''اُحد جنت کا پہاڑ ہے اور میں اسے پسند کرتا ہوں.''

اسی پہاڑ کی اس کھوہ نے اُن کو پناہ دی تھی..

''تارڑ صاحب.. ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی.'' شیخ صاحب نے ہمارے قدموں سے شروع ہو کر بلندی پر کھوہ تک جانے والی چڑھائی کو ایک نظر دیکھا اور پھر آس پاس بہت احتیاط سے نظر کی۔ ''میں جتنی بار بھی یہاں آیا ہوں.. یہاں اس مقام پر.. ایک یا کبھی دو سپاہی موجود ہوتے ہیں تاکہ کوئی اوپر نہ جا سکے.. آج پہلی بار یہاں کوئی نہیں.''

''اس کا مطلب ہے کہ ہم اوپر جانے کا سوچ سکتے ہیں.''

''نہیں.. اس کی ہرگز اجازت نہیں.. کوئی نہ کوئی شخص آس پاس ہو گا جو ہمیں روک دے گا.''

''کوئی روک دے گا تو رُک جائیں گے شیخ صاحب.. کہہ دیں گے کہ ہم تو یونہی کوہ پیمائی کر رہے تھے ہمیں کیا پتہ کہ اوپر کوئی کھوہ ہے. اور اگر ہے تو ہم نے اس کھوہ سے کیا لینا دینا.''

شیخ صاحب جانتے تھے کہ میں اتنا نادان نہیں ہوں اور خوب جانتے تھے کہ دماغ پر اثر ہو چکا ہے اور میں بہانے تراش رہا ہوں..

چونکہ میں نے ابھی تک اس کھوہ سے نظر ہٹائی نہ تھی.. منہ اٹھائے ایک دماغی مریض کی مانند

اسے تکتا چلا جا رہا تھا اس لیے جب اس کے سیاہ دہانے میں سے دو تین لوگ برآمد ہو کر نیچے اترنے لگے تو انہیں دیکھ کر میرا رنگ بدلا اور چونکہ میں ایک دماغی مریض تھا اس لیے یک لخت مسکرانے لگا.. اور مسکراتا چلا گیا. شیخ صاحب مجھے اس کیفیت میں مبتلا دیکھ کر قدرے تشویش میں مبتلا ہوئے تو میں نے کہا ''یا شیخ اوپر برف پگھل گئی ہے.. دیوسائی کے راستے کھل گئے ہیں. قافلے بلندی سے آ رہے ہیں جس کا مطلب ہے ہم بھی اوپر جا سکتے ہیں.'' اتنی دیر میں وہ چند لوگ جو مقامی لگتے تھے ہمارے قریب ایک چٹان پر سے اترے اور آپس میں باتیں کرتے چلے گئے. ''آ جائیں شیخ جی.. کہیں پھر سے برف باری نہ شروع ہو جائے.. راستے مسدود نہ ہو جائیں.. کوئی روک نہ لے.''

سنگریزوں پر پاؤں پھسلتا تھا اس لیے کہ میرے پاؤں میں چپل تھی جوگرز نہ تھے.. شیخ صاحب نہایت تابعداری سے مجھے تھامنے سہارا دینے کی کوشش کرتے تھے.

چٹانیں ٹھوس نہ تھیں بلکہ کھردری اور تہہ در تہہ تھیں جیسے بڑی بڑی سلیٹوں کو جوڑ کر بنائی گئی ہوں. ان پر چڑھنا بھی آسان تھا کہ کھردری سطح پاؤں پکڑ لیتی تھی. شیخ صاحب نے ازراہ احتیاط اپنا دایاں ہاتھ مسلسل میری طرف بڑھا رکھا تھا تاکہ پھسلنے کی صورت میں وہ مجھے گرفت میں لے لیں.

''شیخ صاحب یہ چار گز کی چڑھائی تو کوئی بات نہیں. آپ فکر نہ کریں اور اپنے بازو کو تھوڑا آرام دیں.''

میں عرض کر چکا ہوں کہ کھوہ زیادہ اونچائی پر نہ تھی.. ایک صحت مند شخص آسانی سے سانس سنبھالتا چار پانچ منٹ میں وہاں پہنچ سکتا تھا.. اب چونکہ میری بدنی صحت بھی کچھ اچھی نہ تھی اور دماغی صحت بھی مشکوک ہو چکی تھی اس لیے میں دو چار قدم کے بعد رک جاتا تھا. ظاہر یہی کرتا تھا کہ سانس درست کرنا چاہتا ہوں لیکن ایسا نہیں تھا.. میں دل ہی دل میں حساب لگا رہا تھا کہ اگر یہ وہی کھوہ ہے تو صحابہ کرامؓ حضورؐ کو سہارا دیتے اسی راستے سے اوپر جا سکتے تھے.. اس کھوہ کا تذکرہ اگرچہ سیرت النبیؐ کی کسی کتاب میں براہ راست نہیں ملتا لیکن ہر سیرت نگار یہ لکھتا ہے کہ زخمی ہونے کے بعد صحابہؓ انہیں میدانِ جنگ سے ذرا اوپر لے گئے یا حضورؐ خود بلندی کی طرف چلے گئے..

''رسول اللہؐ لڑنے والوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے جبلِ اُحد کی بلندی کی طرف چلے تاکہ ذرا اونچائی تک پہنچ سکیں.''

''خالد بن ولید اُحد کی بلندی پر چڑھ گئے.. رسول اللہؐ نے دعا کی ''اے اللہ یہ ہم سے اوپر کی طرف سے نہ آنے پائیں. حضرت عمر فاروقؓ نے مہاجرین کی ایک جماعت کے ساتھ خالد بن ولید اور ابوسفیان کو پسپا کر دیا.'' (ڈوگر)

''ابو اسحٰق نے بیان کیا کہ رسول اللہؐ نے اٹھ کر (گڑھے میں سے) پہاڑ کی ایک چٹان پر چڑھنے کی کوشش کی' مگر معمر بھی تھے' آپؐ میں اس وقت ضعف و نقاہت بھی پیدا ہو گئی تھی نیز آپؐ نے دو زرہیں پہن رکھی تھیں' لہٰذا چڑھ نہ سکے.. طلحہ بن عبیداللہ آ کر نیچے بیٹھ گیا اور آپؐ نے اُن کی مدد سے چٹان پر چڑھ کر اپنے آپؐ کو سنبھال لیا۔'' (ہشام)

''آنحضرتؐ (کھائی میں سے نکل کر) اپنے اصحاب کے ساتھ اُحد پر تشریف لے گئے جہاں دشمنوں کے تعاقب سے قدرتی طور پر حفاظت حاصل تھی۔''

''اب وہ اُحد کے ایک بلند ٹیلے پر جا پہنچے جہاں رسول اللہؐ زخموں کی شدت سے بیٹھ کر نماز پڑھانے پر مجبور ہو گئے۔'' (ہیکل)

اگر اُحد کے میدان کے اُس حصے کا تعین کرنا مقصود ہو جہاں یہ جنگ لڑی گئی تو اس کی دو بڑی نشانیاں تیر اندازوں کا ٹیلہ اور حضرت حمزہؓ کا جائے شہادت ہے.. یہ مقام جہاں ہم تھے' یہاں سے بمشکل ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھے اور آبادی سے پرے صاف نظر آ رہے تھے.. مسلمان اپنے دفاع کی خاطر اگر اُحد کی گھاٹی میں چلے گئے تو نزدیک ترین گھاٹی یہی تھی جس میں سے ہم آئے تھے اور جہاں ہماری کار کھڑی تھی.. اور یہیں پر اس گڑھے کا تعین کیا گیا تھا جس میں حضورؐ گرے تھے.. اور وہاں سے نکلنے پر قدرتی طور پر انہوں نے اپنے بچاؤ کی خاطر پہاڑ پر چڑھنا تھا تو زخمی حالت میں دُور جا کر تو نہیں چڑھنا تھا قریب ترین جگہ سے اوپر جانا تھا.. گڑھے کے عین اوپر ایک چٹان بھی تھی.. شاید وہی جس پر حضورؐ نے چڑھنے کی کوشش فرمائی تھی..

اگر وہ اسی علاقے کے آس پاس تھے تو یہاں کچھ بلندی پر بس یہی ایک غار یا کھوہ موجود تھی.. یوں بھی مقامی روایت بھی یہی تھی اور اوپر وہاں تک جانے پر پابندی بھی اسی لیے لگائی گئی تھی کہ اس کی کوئی اہمیت تھی.. یہاں کچھ ثابت کرنا مقصود نہیں صرف جغرافیائی اور قدرتی عوامل کو پیشِ نظر رکھ کر.. اور تاریخی حوالوں میں بیان کردہ صورتِ حال کو سامنے رکھ کر کسی نتیجے پر پہنچنے کی سعی کرنا ہے.. اگر اس گڑھے کی کوئی اہمیت نہ ہوتی تو اُسے بھی پُر نہ کیا جاتا اور اگر اس کھوہ سے کچھ وابستہ نہ ہوتا تو اس تک جانے والا راستہ بند نہ کیا جاتا.. جبلِ اُحد کے دامن میں جو لوگ مدتوں سے رہتے ہیں وہ بھی اسی روایت پر یقین رکھتے ہیں..

تو یہ طے تھا کہ اگر حضورؐ جبلِ اُحد پر چڑھے تھے تو یہیں سے یا یہاں کے آس پاس سے ہی اوپر گئے تھے.. اور میدانِ اُحد میں جو دشمن اُن کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا اس کی نظروں کے سامنے بلندی پر کھڑے نہیں رہے ہوں گے بلکہ کہیں نہ کہیں اس کی نظروں سے اوجھل ہوئے تھے..

ذرا اوپر ہوئے تو کھوہ کی اہمیت کا ایک اور ثبوت سامنے پایا..

جہاں ہم سانس لینے کے لیے رکے تھے وہاں سے ہم ذرا سی اونچائی پر کھوہ کا دہانہ دیکھ سکتے تھے.. اور یہ بھی دیکھ سکتے تھے کہ وہ پہاڑ کے اندر ایک قدرتی غار نہیں ہے بلکہ حرا کی مانند بڑی بڑی چٹانوں کے کسی زلزلے کی وجہ سے گرنے سے وجود میں آئی ہے..

ایک اور ثبوت یہ تھا کہ ہمارا راستہ روکتی ہوئی ایک قدیم اور پتھریلی دیوار تقریباً دو میٹر اونچی ہمارے سامنے تھی.. جو صرف اس لیے تعمیر کی گئی تھی کہ اگر کوئی چوری چھپے بھی اوپر آ جاتا ہے تو اسے خود سے عبور نہ کر سکے اور کھوہ تک نہ پہنچ سکے..

اب کیا دیکھتے ہیں کہ دو تین خواتین نمودار ہوتی ہیں اور ان کے ہمراہ ایک چھوٹی سی بچی بھی ہے.. ہمیں دیکھ کر جھجکتی ہیں اور پھر اس دیوار سے چمٹ کر وہ ہم سے ہمارے قریب لینڈ کر جاتی ہیں.. بچی اترنے لگتی ہے تو پھسل کر گرنے لگتی ہے لیکن ہم اس کی مدد کے لیے چاہتے ہوئے بھی ہاتھ نہیں بڑھا سکتے کہ ہم غیر محرم ہیں.. یہ خاندان ہمیں کن انکھیوں سے دیکھتا نیچے اتر جاتا ہے..

ہم اس مخمصے میں ہیں کہ اس دیوار کو عبور کریں یا نہ کریں.. یہیں سے کھوہ کی قریب ترین زیارت کر کے پسپائی اختیار کریں یا نہ کریں.. اگر یہ خواتین وہاں تک ہو آئی تھیں اور یقیناً اس دیوار کو عبور کر کے ہی اوپر گئی تھیں تو ہم ایسا کریں یا نہ کریں تب ہم نے دیکھا کہ کھوہ میں سے ایک نہایت گورے چٹے.. پہلی نظر میں ہی پسند آ جانے والے بزرگ.. مجھ سے بھی بزرگ برآمد ہوتے ہیں ایک ڈھیلے چوغے میں نہایت گم.. کھوئے ہوئے.. چہرہ زرد جیسے کوئی عارضہ لاحق ہو.. کسی صدمے میں ہوں جیسے.. کھوہ سے اتر کر ہماری سطح پر آتے ہیں اور پھر آہستگی سے دیوار پر قدم رکھ کر اترتے ہیں ہم سے لاتعلق گزرنے لگتے ہیں تو شیخ صاحب جو عربی سے واقف ہیں انہیں سلام کرنے کے بعد پوچھتے ہیں ''آپ اُردن سے آئے ہیں؟'' کہ وہ اسی ملک کے باشندے لگتے تھے..

وہ سر ہلا کر کہتے ہیں ''نہیں.. میں سعودی ہوں..''

میرے اور شیخ صاحب کے لیے ان کا سعودی ہونا باعثِ حیرت تھا کہ ایسے مقامات پر سعودی ہرگز نہیں پائے جاتے.. وہ چاہیں تو بھی تعزیر کے خوف سے نہیں پائے جاتے کہ اس قسم کے مقامات کی زیارت کرنا ان کے نزدیک.. بلکہ حکومتِ وقت کے نزدیک بدعت ہے اور اسی لیے شیخ صاحب نے انہیں اُردنی سمجھا..

وہ اپنے آپ میں گم ہم سے لاتعلق.. انہوں نے ہماری جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا کہ یہ کون ہیں.. کیا ہیں.. پتھر ہیں یا انسان ہیں.. جانے کو تھے کہ شیخ صاحب نے نہایت نرم لہجے میں

استفسار کیا۔ "آپ کھوہ کے اندر گئے تھے؟"

انہوں نے سر ہلا دیا۔۔

"اندر کیا ہے؟"

"اندر۔۔" جیسے وہ ایک عالمِ خواب میں بولے۔۔ "اندر میرے رسولؐ کی خوشبو ہے۔۔" اور نیچے اتر گئے۔۔

میں یکدم پتھرا گیا۔ اُحد کے پتھروں کے درمیان ایک اور۔۔ اگرچہ ان کی نسبت ایک بے وقعت اور بیکار سا پتھر ہو گیا۔۔ وہ سب کے سب حیثیت والے۔۔ چشم دید گواہ۔ حمزہ کی ہلاکت کے۔۔ ابو دجانہ کی شجاعت کے۔۔ ام عمارہ کی دلاوری کے۔۔ حضرت علیؓ کی اس ڈھال کے جس میں وہ پانی بھر کر لائے تھے اور زخمی رسولؐ کے ہونٹوں سے لگاتے تھے۔۔ اور گواہ۔۔ رسولؐ کی شباہت کے۔۔ ان کے ماتھے سے رسنے والے خون اور رخساروں میں کھبی کڑیوں اور انہیں دانتوں سے کھینچنے والے ابو عبیدہ کے۔۔ اُحد کے ستر شہداء کے۔۔ وہ تو کیسے کیسے گواہ حیثیت والے تھے اس لیے اگر میں ان پتھروں کے درمیان ایک پتھر ہوا تو کیسا بیکار اور بے حیثیت پتھر ہوا۔

میں نے اس گفتگو کو حرف بہ حرف نقل کیا ہے۔۔

صدمے میں آئے ہوئے۔ اپنے آپ میں غرق سعودی نے یہی کہا تھا "اندر میرے رسولؐ کی خوشبو ہے۔" اور نیچے اتر گیا تھا۔۔

اور نہیں جانتا تھا کہ وہ کیسے مجھے پتھر کر گیا ہے۔۔

اس ایک فقرے سے میں ایسا جھنجھوڑا گیا جیسے سلمان فارسی کھجور کے درخت پر کام کرتے ہوئے جب نیچے قباء کے ایک یہودی کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ وہاں ایک شخص آیا ہے جو اپنے آپ کو پیغمبر کہتا ہے۔۔ تو وہ جھنجھوڑے جاتے ہیں اور بے اختیار کانپنے لگتے ہیں اور گرنے کو ہوتے ہیں۔۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چودہ سو برس گزرنے کے باوجود میرے حضورؐ کی خوشبو جبل اُحد کی ایک کھوہ میں اب تک موجود ہو۔۔

کیا یہ عقیدت کی کرشمہ سازی ہے۔۔ جان بوجھ کر کھایا جانے والا دھوکا ہے۔ عقل اور بوجھ سے ماورا کچھ اور ہے۔

میں ایسا جھنجھوڑا گیا کہ مجھ ناتواں شجر پر جتنے بھی گلے سڑے پھل تھے وہ ٹپ ٹپ گرنے لگے۔۔

میں جو شہرِ نبیؐ میں ہوں۔۔ اُحد کے ان پتھروں میں ہوں جن میں نبیؐ کا خون جذب ہوا تھا میں ان کی قسم کھا کر کہتا ہوں "کھوہ کے اندر میرے رسولؐ کی خوشبو ہے" سے بڑھ کر یا برابری کا بھی کوئی فقرہ ایسا اثر انگیز میں نے زندگی بھر نہ سنا اور نہ امکان ہے کہ کبھی سن پاؤں گا۔

یہاں پہنچ کر۔۔ اپنے سامنے ایک دیوار پا کر۔۔ اور اس کے پار اس کھوہ کو دیکھ کر جس کے اندر بھی جایا جا سکتا تھا اگر کوئی شخص آپ کو اپنے کندھوں پر سوار کر کے اس کے دہانے کے نزدیک لے جائے۔۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ یہ مصیبت اور مشکل کا کام ہے تو یہی کافی ہے کہ میں نے اس پناہ گاہ کو انتہائی قربت میں دیکھ لیا ہے۔۔

لیکن جب سعودی بزرگ نے یہ کہا کہ۔۔ کھوہ کے اندر میرے پیغمبرؐ کی خوشبو ہے۔۔ تو پھر پسپائی کی کچھ گنجائش باقی نہ رہی۔۔ بے شک میں معذور اور اپاہج ہوتا تب بھی کچھ گنجائش نہ ہوتی۔ اپنے آپ کو گھسیٹتا۔ اوندھے منہ گرتا۔ اپنے آپ کو زخمی کرتا۔ شاید وہیں اوندھا گرتا جہاں میرے بابا کا خون گرتا تھا۔۔ میں تو اس کھوہ تک پہنچتا جہاں میرے بابا کی خوشبو میری ہی منتظر تھی۔۔ بدھ بھکشو تو لہاسا تک یا کوہ کیلاش کے گرد ہاتھ پھیلائے زمین پر اوندھے ہو کر گھسٹتے ہوئے رینگ رینگ کر عقیدت کا سفر مکمل کر لیتے تھے تو میرے سامنے تو ایسے طویل اور کٹھن راستے نہ تھے۔۔ لب بام دو چار ہاتھ ہی تو تھا تو میں کیسے یہاں سے واپس چلا جاتا۔۔ اوندھے ہو کر گھسٹ گھسٹ کر بھی جانا ہوتا تو جاتا۔۔

صدیق شیخ صاحب بھی جیسی میری حالت اب ہے کبھی ایسی تو نہ تھی اس فقرے کی اثر انگیزی سے نہ صرف آبدیدہ تھا بلکہ مکمل طور پر چپ ہو چکے تھے۔۔

"شیخ صاحب۔۔ چلنا ہے ناں۔" یہ درخواست نہ تھی ایک عاجزانہ سی دھمکی تھی۔۔

"آیئے۔" انہوں نے میری بزرگی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کہا۔۔

"کیسے آیئے۔۔ اس دیوار کے پار کیسے جایئے۔۔ پہلے آپ دیوار چڑھیں اور پھر مجھے سہارا دے کر یوں اٹھائیں جیسے کوئی جہاں سے اٹھایا جاتا ہے۔۔"

چنانچہ انہوں نے میرے حکم کی تعمیل کی اور ہم دونوں دیوار کے دوسری جانب اتر گئے۔۔

دیوار اور کھوہ کے درمیان جو پتھر اور سنگریزے تھے ان میں بکریوں کی مینگنیوں کی بہتات تھی۔ کھوہ کے قریب ہوئے تو وہ عین سامنے نہ تھی بلکہ قدرے بلندی پر تقریباً ہماری پیشانیوں کی سطح پر واقع تھی۔۔ یہ مختصری دو چار فٹ کی چٹان پیمائی بھی میرے بس کی بات نہ تھی یہاں بھی بابا الطاف اشد ضروری تھی یہاں بھی شیخ صاحب نے آیئے کہا اور میں نے پیچھے ہٹ کر درخواست کی کہ نہیں پہلے آپ۔۔ اوپر چڑھیں اور پھر میری مدد فرمائیں۔۔ شیخ صاحب پتھروں میں پاؤں جما کر کھوہ کے دہانے پر جا بیٹھے۔۔ اور جھک کر ہاتھ بڑھا دیا۔ بھلا ایک ہاتھ سے اتنا بھاری بابا کیسے لفٹ کیا جا سکتا تھا اس لیے دونوں ہاتھوں سے گندم کی ایک بوری کی مانند مجھے اوپر گھسیٹ لیا گیا۔۔

میں نے کھوہ میں جھانکا۔۔ اندر بس اتنی جگہ تھی کہ صرف ایک شخص دونوں جانب کی چٹانوں کو

تھام کر کھڑا ہو سکتا تھا..

شیخ صاحب نے کرم کیا اور پھر ''آیئے'' کہا اور اس مرتبہ میں ان کا شکر گزار ہوا کہ وہ پہلے مجھے اندر جانے کا کہہ رہے ہیں..

میں دو قدم آگے ہوا تو روشنی یکدم کم ہو گئی. گھٹ گئی.. فرش بھی.. یعنی جہاں انسان کھڑا ہو سکتا تھا بس دو چار قدم کا ہی تھا اور اس کے آگے پتھروں کا ایک ڈھیر یوں اونچا ہوتا تھا کہ ذرا دور جا کر چھت سے جا لگتا تھا..

اور کھڑے ہونے کے لیے بھی ایک شخص کی گنجائش تھی.. پہلو بہ پہلو دو افراد کا کھڑا ہونا ممکن نہ تھا.. چٹانیں اس مختصر کھوہ کو بھینچ کر اس کا وجود ختم کرنے کے لیے قریب ہوتی جاتی تھیں..

شیخ صاحب میرے پیچھے کھڑے تھے اور دہانے میں سے جتنی بھی روشنی آ رہی تھی وہ بھی مزید گھٹ گئی تھی..

یہاں روپوش ہونے کے لیے تو کوئی کونہ کھدرا نہ تھا.. نیم تاریکی میں تنگ ہوتی چٹانوں کے سوا اور کچھ نہ تھا.. یا پتھروں کا ایک ڈھیر تھا.. اور تب مجھے دائیں ہاتھ پر جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے دو ہاتھ اوپر ایک خلاء سا دکھائی دیا.. چٹانوں میں قدرتی طور پر وجود میں آنے والی ایک ایسی گنجائش اور اتنی سی کہ اُس پر ایک شخص کھوہ میں پاؤں لٹکا کر آسانی سے بیٹھ سکتا تھا..

اس کھوہ میں اور کوئی جگہ نہ تھی سوائے اس چھوٹی سی پتھریلی نشست کے..

حضورؐ نے اگر اس کھوہ میں پناہ لی تھی تو اس پتھریلی قدرتی نشست کے سوا اور کوئی مقام نہ تھا جہاں وہ بیٹھ سکتے..

شیخ صاحب بھی مجھ سے اتفاق کرتے تھے.. یہی جگہ ہو سکتی تھی..

نیچے سے اُحد کے دامن میں پھیلی ہوئی بستی سے کوئی بھی اوپر اس جانب نہیں آ رہا تھا..

کھوہ میں ہم دونوں ہی تھے.. اور اسی سوچ میں تھے کہ اس پتھر پر چڑھ کر بیٹھنا چاہیے یا نہیں..

''آپ بیٹھیں گے شیخ صاحب..''

''نہیں جی..'' شیخ صاحب بھی میری طرح اس مقام کے رعب میں تھے.. ''آپ بیٹھیں..''

انہوں نے میرا ایک ہاتھ تھاما.. ہتھیلی میں نے کھوہ کی چھت پر جما کر اپنے آپ کو ذرا اوپر کیا اور اس قدرتی پتھریلی نشست پر جا بیٹھا.. بدن میں جو ایک خفیف سی لرزش تھی وہ جس کیف کو جنم دیتی تھی اس سے کسی اور کو آگاہ کرنا اور روشناس کروانا ممکن نہیں.. میری پشت کھوہ کی دیوار کے ساتھ لگی تھی..

اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ بائیں ہاتھ پر یہ غار تنگ ہوتی اوپر اٹھتی چھت سے جا ملتی تھی اور وہاں مکمل اندھیرا تھا.. اور دائیں جانب میرا پورا جسم چٹان کی اوٹ میں ہو چکا تھا ایسے کہ کھوہ کے دہانے پر بھی کھڑا کوئی شخص یہ نہیں جان سکتا تھا کہ اندر کوئی ہے.. کوئی روپوش ہے..

میں دیوار سے لگے کندھوں کو آگے کر کے.. جیسے جھانکتے ہیں ذرا آگے ہو کر جب اس اوٹ سے دائیں جانب نظر کرتا تھا تو کھوہ کے دہانے کے پیچھے اُحد کی بستی نظر آتی تھی جو ان دنوں جنگ کا میدان تھا.. مکان.. ٹیلی ویژن ایریل.. چھتوں پر سوکھتے کپڑے.. تنگ گلیاں اور ان سے پرے حضرت حمزہؓ کے مدفن کی چاردیواری دھوپ میں مدھم ہوتی دکھائی دیتی تھی.. چاردیواری سے آگے تیراندازوں کا ٹیلہ بلند تھا.. اور ٹیلے پر جو چند لوگ کھڑے تھے وہ تب تک پتھر کے لگتے تھے جب تک کہ تیز ہوا ان میں سے کسی ایک کے پیراہن کو فضا میں پھڑ پھڑاتی نہ تھی..

شیخ صاحب میرے گھٹنوں کی سطح پر تھے ''پوشیدگی کے لیے اس سے زیادہ مناسب مقام نہیں ہو سکتا تھا.. یہاں جہاں آپ بیٹھے ہیں یہاں کسی کی نظر نہیں جا سکتی تھی اور ذرا آگے ہو کر اُحد کے میدان میں برپا جنگ پر بھی نظر رکھی جا سکتی تھی..''

یہاں سے میدان کی سطح پر وہ چٹان بھی نظر آ رہی تھی جس کے دامن وہ گڑھا تھا.. تو یہ کڑیاں ملتی تھیں.. واقعات کی ترتیب یہی ممکن تھی..

اچانک عتبہ بن ابو وقاص اور ابن قمیہ نمودار ہوئے.. ان دونوں نے رسول اللہؐ کو قتل کرنے کی قسم کھائی تھی.. عتبہ کے پتھر سے رسولؐ کا ہونٹ کٹ گیا اور دائیں طرف کا نیچے کا دانت ٹوٹ گیا.. ابن قمیہ نے تلوار کا وار کیا جس کی شدت سے خود کی کڑیاں رسولؐ کے رخساروں میں دھنس گئیں.. آپ کی پیشانی عبداللہ بن شہاب کے وار سے زخم آلود ہوئی.. آپؐ یا تو زخموں کی شدت سے نڈھال ہو کر گڑھے میں گر گئے یا بچاؤ کی خاطر اس میں کود گئے.. امکان غالب ہے کہ گر گئے کیونکہ ابو عامر نے مسلمانوں کو ہلاک کرنے کی خاطر یہ گڑھے کھودے تھے اور ظاہر ہے انہیں مٹی اور پتھروں سے ایسے چھپایا ہوگا کہ وہ نظر نہ آئیں.. اسی لیے گرنے کا امکان زیادہ نظر آتا ہے..

حضرت علیؓ نے جھک کر رسول اللہؐ کا ہاتھ تھاما اور طلحہ بن عبیداللہ نے سہارا دے کر آپ کو اٹھایا اور سیدھا کھڑا کیا..

کیا اسی مقام پر حضورؐ کو گڑھے سے باہر نکال کر مالک بن سنان نے چہرے سے خون چوس چوس کر تھوکا نہیں.. نگل گئے.. اور کیا وہیں ابو عبیدہ بن الجراح نے اپنے دانتوں سے حضورؐ کے رخساروں میں دھنسی کڑیاں نکالی تھیں؟.. بے شک ایسا بھی ہو سکتا ہے لیکن عام طور پر ایسے مقام کو دشمن کے حملے کے

پیشِ نظر فوری طور پر چھوڑ کر زخمی کو پہلے کسی محفوظ مقام پر پہنچایا جاتا ہے اور پھر اس کی دیکھ بھال کی جاتی ہے.. اور اگر گڑھا وہاں تھا اور یہاں سے نظر آ رہا تھا اور صحابہ کرامؓ انہیں اُحد پہاڑ پر لے گئے تھے یا وہ ذرا بلندی پر چلے گئے تھے تو یہ "ذرا" بلندی یہی ہو سکتی ہے اور اس کھوہ کے سوا اور کوئی پناہ گاہ نہیں ہو سکتی اور بے شک ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ رسول اللہؐ کے زخمی چہرے سے خون اس کھوہ میں چوسا گیا تھا اور ابوعبیدہ نے بھی یہیں رسولؐ کے رخساروں کو بوسہ دینے کا مرتبہ حاصل کیا تھا. کھوہ کے باہر ذرا سی بلندی پر اُحد کے میدان میں اُنہی کو تلاش کرتے قریش کو وہ صاف نظر آ سکتے تھے.. اس لیے اس کھوہ میں ان کا پناہ لینا قدرتی بنتا تھا.. اور یہاں اس پتھریلی نشست کے سوا اور کوئی جگہ نہ تھی' جہاں وہ آرام کر سکتے اور جیسے شیخ صاحب کھڑے تھے صحابہ کرامؓ ان کے گھٹنوں کی سطح پر ہوتے.. اس صورت میں یہ خیال بھی دل کو دہلا دیتا ہے کہ اس کھوہ کے اندر یا باہر دہانے کے قریب کیسے کیسے نایاب لوگ کھڑے تھے.. یہ مستند تاریخ نہیں ہے.. محض میرے اندازے ہیں.. کچھ حساب کتاب ہے.. ہو سکتا ہے مقامی روایات درست نہ ہوں.. یہ گڑھا وہ نہ ہو.. یہ ذرا سی بلندی کہیں اور ہو.. اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گڑھا وہی ہے اور ذرا سی بلندی یہی ہے اور یہی کھوہ ہے جس میں صحابہ کرامؓ اپنے رسولؐ کو لے کر آئے تھے اور ان کی دیکھ بھال کی تھی کہ سارے اشاروں کے قدرتی رخ اسی جانب چلے آتے ہیں..

"جہاں میں ہوں.. اسی جانب" میں نے سوچا اور بدن کی لرزش میں اضافہ ہو گیا.. اور مجھے پہلی بار شدت سے احساس ہوا کہ مجھے اس نشست پر نہیں بیٹھنا چاہیے تھا..

غار کی چھت میں ایک چھوٹا سا شگاف تھا جس میں سے کچھ دھول اور چند کنکریاں گریں.. شاید اُحد پر ہوا تیز ہو چلی تھی..

میں دیوار سے ٹیک لگاتا تو دائیں جانب جو چٹانی پردہ تھا اس کی اوٹ میں ہو جاتا اور جب ذرا آگے ہو کر کھوہ کے باہر دیکھتا تو اُحد کی بستی پھیلتی ہوئی تیر اندازوں کے ٹیلے تک چلی جاتی جس پر چڑھنے والے زائرین اب حرکت کرتے دکھائی دے جاتے تھے.. لیکن اس کے سوا میں نے یہ بھی دیکھا کہ نیچے سے چند زائرین اوپر آ رہے ہیں.. ہماری تنہائی ختم ہونے کو تھی.. چودہ سو برس کی تنہائی کا صرف ایک لمحہ میری گرفت میں آیا تھا اور مجھے ہرا بھرا کر گیا تھا..

میں اس نشست سے جدا ہو کر اٹھنے کو تھا.. اوٹ کی چٹان کی سطح پر ہتھیلی جما کر اترنے کو تھا جب میرا ایک سانس تو ایک معمول کا سانس تھا اور دوسرے سانس میں ایک ہلکی سی مہک تیرتی آ گئی.. اتنی ہلکی کہ اس پر مہک ہونے کا گمان بھی گزرتا تھا.. جیسے ہار سنگھار کے پھول جب سرد سویر میں سورج کی پہلی کرنوں کی تاب نہ لا کر ڈنٹھلوں سے جدا ہو کر گرتے ہیں تو ان کی خوشبو کبھی ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی.. یا سرِ شام

پاتیا کے پھولوں میں سے جو باس اٹھتی ہے.. یا جیسے ایک تتلی آہستگی سے ایک رخسار پر اترتی ہے تو محسوس ہو بھی جاتا ہے اور نہیں بھی ہوتا.. ایسے یہ مہک ہلکی تھی.. لیکن تھی.. ایک عجب نا آشنا خوشبو کہیں آس پاس قیام کرتی تھی اور مجھے اپنے ہونے کی دبے پاؤں خبر دیتی تھی..

وہاں ایک ہلکی مہک تھی.. میں نے اوٹ کے پتھر کو سونگھا' کیا اس میں سے آ رہی ہے.. منہ اٹھا کر چھت کی جانب دیکھا.. کون سا پتھر مہک بار ہو رہا تھا.. از کجا ے آید ایں مہک دوست..

اندر میرے رسولؐ کی خوشبو تھی..

اس کی توجیہیں بہت ہو سکتی ہیں.. اور غالب امکان ہے کہ درست ہو سکتی ہیں.. یہ کسی زائر کے لبادے کا ساتھ چھوڑ کر یہاں رہ گئی تھی.. کسی عقیدت مند نے کسی معطر روئی کے گالے سے ان پتھروں کو چھوا ہو گا.. کوئی ایسی مہک نہیں ہے جو چودہ سو برس تک قائم رہے.. ہواؤں میں قیام کر جائے..

زائر کھوہ کے دہانے تک آ کر منتظر تھے..

وہ مہک ایسی تھی کہ میں اس سے شناسا نہ تھا.. میرے نتھنوں میں ایسی خوشبو نے میرے بدن کو اس میں بھگویا نہ تھا.. نہ تو اس میں مغرب کی خوشبوؤں کا کوئی شائبہ تھا اور نہ ہی یہ مشرقی' تیز اور دماغ کو بوجھل کر دینے والی تھی..

اگر میں آج تک ایسی مہک سے شناسا نہیں ہوا تھا تو اسے کیسے بیان کر سکتا تھا.. جیسے میں اپنے والد صاحب کا ململ کا کرتہ درست کرتے ہوئے ان کے شاندار مگر زوال پذیر بدن پر جھکتا تھا تو اس میں سے سادگی اور پاکیزگی کی حامل ایک مہک آتی تھی' شاید ویسی.. یا میری والدہ کے دوپٹے میں سے سوت' پسینے اور ممتا کی جو خوشبو صرف میرے لیے ہی تخلیق ہوتی جاتی تھی ویسی..

یہ سب کچھ بھی اس مہک میں تھا اور اس کے سوا کچھ اور بھی تھا..

کیا تھا.. کیا کہوں کہ کیا تھا..

مجھے کچھ غرض نہ تھی کہ یہ مہک کسی زائر کے لبادے کا ساتھ چھوڑ کر یہاں رہ گئی ہے یا کسی معطر روئی کے لمس سے وجود میں آئی ہے.. میرے لیے یہ میرے رسولؐ کی خوشبو تھی..

نہ شیخ صاحب نے کچھ ذکر کیا اور نہ ہی میں نے کچھ حیرت کا اظہار کیا لیکن اس کے باوجود ہم دونوں جانتے تھے کہ کیا گزر رہی ہے..

باہر منتظر زائرین اب صبر کا دامن چھوڑنے کو تھے.. وہ کھوہ کی نیم تاریکی میں کھڑے شیخ صاحب کو دیکھ رہے تھے کہ میں ان کی نظروں سے اوجھل تھا اور وہ بے چین ہو رہے تھے کہ آخر یہ ایک

شخص جو اندر کھڑا ہے تو دائیں جانب چہرہ کیے کس سے باتیں کر رہا ہے.. کسے دیکھتا ہے.. کیا یہ خود سے محوِ کلام ہے.. یہ باہر آئے گا تو ہم اندر جا سکیں گے..

وہ مہک ایسی نہ تھی کہ مسلسل سانس کا حصہ بنی رہتی.. ابھی کچھ بھی نہیں.... خالی ہوا ہے اور ابھی پھر سے وہ سانس میں سانس لیتی ہے.. میں نے ایک گہرا سانس بھرا.. اور اس مہک کو خوب محسوس کر کے اپنے اندر اتارا.. اور اترنے کا ارادہ کیا.. اس پتھریلی پوشیدہ نشست سے اٹھنے کے لیے دایاں ہاتھ پتھر کی اوٹ پر رکھا اور دوسرا ہاتھ بڑھا کر اپنے سامنے جھکی ہوئی چٹان پر ثبت کر کے اترنے کو تھا.. پھر ایک خیال آ گیا.. میں رک گیا' اترا نہیں' وہیں انہی جگہوں پر ہاتھ رکھے ٹھہر گیا.. کیونکہ ایک خوابیدہ خلیہ دماغ کا بیدار ہوا اور اس میں سے لمس کا ایک جھرنا بہنے لگا..

اس نشست پر چڑھ بیٹھنے کے تو دو چار طریقے ہو سکتے تھے لیکن یہاں سے نیچے اترنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہ تھا کہ انسان ایک ہاتھ سے اس چٹانی اوٹ پر ہتھیلی پھیلا کر اپنے آپ کو سہارا دے کر ذرا آگے لے جائے اور پھر دوسرا ہاتھ سامنے جو چٹان تھی اس پر جما کر نیچے اتر جائے.. اس کے سوا اور کوئی طریقہ ممکن ہی نہ تھا.. تو لمس کا ایک جھرنا یوں پھوٹا کہ حضورؐ نے اس پناہ گاہ سے اترتے ہوئے اپنی ہتھیلی بس یہیں رکھی ہو گی اور لامحالہ دوسرا ہاتھ اس چٹان پر رکھا ہو گا سہارے کے لیے.. میں ایک بار پھر پتھر ہو گیا.. اُسی حالت میں منجمد سا ہو گیا ایک ساکت تصویر ہو گیا.. اور میں پتھر ایسا ہوا اُسی حالت میں جیسے اس اوٹ سے ہتھیلی اٹھا لوں گا.. چٹان پر سے ہاتھ پرے کر لوں گا تو یہ کھوہ منہدم ہو جائے گی..

میں اُترنے والا تھا اور اُترنے کی حالت میں پتھر ہو گیا تھا تب شیخ صاحب کہنے لگے "کیا ہوا ہے؟"

میں نے اسی ساکت حالت میں انہیں اس کیفیت میں شامل کر لیا: "شیخ صاحب.. اگر اپنے بابا نے اسی کھوہ میں پناہ لی تھی اور یہیں بیٹھے تھے تو یہاں سے اترتے ہوئے انہوں نے یہیں ہتھیلی جمائی تھی.. یہیں.. جہاں میری ہتھیلی ہے.. اور اسی چٹان کا سہارا لیا ہو گا جسے میرا ہاتھ تھامتا ہے.. اسی طور ان کے پاؤں کھوہ کے فرش سے ذرا اونچے ہوں گے.. تو اترنے کے لیے.."

میں شاید کچھ دیر اسی حالتِ سکوت میں رہتا.. چودہ سو برس پیشتر کی ہاتھوں کی لکیروں پر اپنی ہتھیلی رکھ کر ان میں سے کسی ایک لکیر کو اپنی قسمت میں شامل کرنے کی آرزو کرتا تھا لیکن کھوہ کے باہر جو منتظر تھے وہ ناگواری کا اظہار کر رہے تھے اور میں نے اپنی ہتھیلی اور ہاتھ کو بمشکل الگ کیا.. لیکن الگ کرنے سے پیشتر نیچے اتر آیا.. باہر جو منتظر تھا انہوں نے یکدم ایک اور شخص کی موجودگی پر حیرت

کا اظہار کیا..

"شیخ صاحب.. آپ بھی تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جائیے.. میں آپ کا ہاتھ تھامتا ہوں"

"نہیں جی.." وہ عجیب سی حالت میں تھے "نہ.. آپ جانے کیسے بیٹھ گئے.. مجھ میں تو ہمت نہیں.." وہ آگے ہوئے.. اس پتھریلی نشست کو متعدد بوسے دیے اور پیچھے ہو گئے.. میں نے بھی رخصتی سے پیشتر کچھ دیر اپنے لب اس پتھریلی نشست پر ثبت رکھے.. دائیں بائیں جہاں بھی بابا کے ہاتھوں کے شائبے ہو سکتے تھے ان کو چوما.. بے شک شرک کا مرتکب ہوا.. پر عشق شرک کے بغیر عشق نہیں ہوتا..

کھوہ میں سے نکلنے سے پیشتر میں نے جب پیچھے مڑ کر اس کی تاریکی میں وہاں تک نظر کی جہاں چھت کی چٹانیں جھک کر اور فرش کے پتھر بلند ہو کر آپس میں ملتے تھے تو وہاں ان کے سنگم پر نہایت محفوظ.. کہ وہاں تک جایا نہ جا سکتا تھا.. وہاں میں نے دو بھڑکتی ہوئی آنکھیں دیکھیں.. گھپ اندھیرے میں ایک حیوانی چمک والی آنکھیں اور میں واقعی یکدم بہت ڈر گیا.. ایسے مقام پر ایسی اتفاقی آنکھیں.. یہ کیا تھا.. اور پھر ذرا غور کیا اس تاریکی کو عادت کر کے جانا کہ یہ ایک بلی ہے.. اور مجھے گھورتی جا رہی ہے.. جب ہم اس کھوہ میں داخل ہوئے تھے تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ وہاں نہیں تھی..

کہاں سے آ گئی ہے..

کس کی ہے؟..

بلیوں کے باپ کی تو نہیں.. کہ ابوہریرہ بھی اصحابِ صفہ کے تھڑے پر دن رات کرتے حضورؐ کو اپنے حجرے میں سے کمبل کے پردے میں سے باہر آتے اور پھر رات گئے لوٹتے ہمہ وقت اپنی نظر میں رکھتے تھے تو کیا پتہ ابوہریرہ کی بلیوں کی نسل میں سے یہ بلی بھی نظر رکھتی ہو کہ اس کے باپ کے محبوب جس کھوہ میں بھی پناہ لینے کے لیے آئے تھے تو اس کھوہ میں کون کون آتا ہو.. نظر رکھتی ہو..

"شیخ صاحب.. بلی.."

شیخ صاحب چونک گئے.. "کہاں؟"

"وہاں..." میں نے اشارہ کیا..

انہوں نے زیرِ لب کچھ پڑھا اور کہنے لگے "تارڑ صاحب اب یہاں سے نکل چلیں" لیکن وہ اس بلی کی وہاں موجودگی سے بے حد متاثر ہوئے تھے اور جب ہم دونوں کھوہ سے باہر آئے تو منتظر زائرین سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "ہریرہ... ہریرہ.."

اور انہوں نے جو منتظر تھے یہی سمجھا کہ ان صاحب کے ذہن میں کچھ فتور ہے جو ہریرہ ہریرہ کرتے باہر آ رہے ہیں.. بھلا ادھر ہریرہ کہاں سے آ گئی..

غار کے باہر کی ہوا سراسر خالی تھی.. اس میں کوئی مہک نہ تھی..

ہم دونوں اصحاب کہف میں سے تھے کہ جبل اُحد کی اس غار میں سے باہر آئے تو زمانے کی زد میں آ گئے.. چودہ سو برس پیشتر سوئے تھے تو اب کہیں جا کر بیدار ہوئے تھے اور باہر زمانہ بدل چکا تھا..

ان زائرین میں سے.. جو کھوہ کے اندر جانے کو تھے کسی نے بھی مجھ سے نہ پوچھا کہ اندر کیا ہے؟

اگر کوئی پوچھتا تو "اندر.." جیسے ایک عالم خواب میں... میں کہتا "اندر میرے رسولؐ کی خوشبو ہے.."

"جدہ میں ہونا بس ایسا ویسا ہی ہوتا ہے...

غارِ حرا پر اٹکی ہوئی سوئی "برسورے"

میں مدینے سے لوٹ آیا تھا اور جدہ میں تھا....

اور جدہ میں ہونا کیسا ہوتا ہے..

بس ایسا ویسا ہی ہوتا ہے..

جو ہونا ہوتا ہے وہ مدینے میں اور مکے میں ہونا ہوتا ہے.. جدہ میں کیا ہونا ہوتا ہے.. جدہ پہنچ کر میں نے اگرچہ منہ قبلہ کعبے شریف ہی رکھا.. عمرے کیے ثواب کمائے لیکن میرے ذہن کی کُند ہو چکی سوئی.. غارِ حرا.. کے ریکارڈ پر ہی اٹکی رہی..

ہاں پچھلے زمانوں میں ہم اتنی آسانی سے اپنے من پسند گیت اور غزلیں یوں ڈی وی ڈی میں ایک سی ڈی داخل کر کے اس کے ریموٹ پر ایک پورے ایک نمبر چھو کر ہمہ وقت نہیں سن سکتے تھے.. اس معصوم خواہش کے لیے ایک بھونپو والا.. گراموفون درکار ہوتا تھا' پھر ہم اپنا پسندیدہ اٹھہتر گردشوں والا سیاہ پلاسٹک کا توا یا ریکارڈ تلاش کرتے تھے جس پر ایک عدد ڈاگی بھونپو کے سامنے بیٹھا سہگل' کانن بالا یا خورشید کو کان کھڑے کیے ہوئے نہایت اشتیاق اور گہری توجہ سے سن رہا ہوتا تھا.. اس ریکارڈ کو گراموفون پر چڑھایا جاتا تھا اور پھر سوئیوں کی ڈبیا سے ایک نئی سوئی اس کے بازو میں فٹ کر کے اس کا پیچ کس کر اسے پلاسٹک کے گھومتے ہوئے ریکارڈ کے آغاز میں احتیاط سے رکھ دیتے تھے اور تب جا کر کہیں اس میں سے ایک گہری آواز "برسورے.." کی برآمد ہوتی تھی.. لیکن جب سوئی کند ہو جاتی تھی.. گھس جاتی تھی تو اپنی مرضی سے کہیں اٹک جاتی تھی اور "برسورے.. برسورے.. برسورے.." پڑی رہتی تھی.. کچھ اسی طور میری [illegible] کی سوئی "حرا.. حرا.. حرا.." پر اٹکی ہوئی تھی.. اس کا یہ مداوا ہو سکتا تھا کہ ذہن کی ڈبیا میں اس ہی ایک سوئی تھی جو کند ہو چکی تھی..

''میں غارِ حرا میں ایک رات گزارنا چاہتا ہوں..''

''نہیں ابو..'' سلجوق نے مسکرا کر ایک خاص بزرگانہ فکرمندی سے میری طرف دیکھا..

''لیکن بیٹے کیوں نہیں؟''

وہ حج کے زمانے تھے..

صلائے عام تھی یارانِ نکتہ داں کے لیے..اور نکتہ داں تقریباً پچیس لاکھ کے قریب تھے تو ان میں ایک نقطۂ یعنی میں کہاں شمار ہوتا تھا..کہاں دکھائی دے سکتا تھا..تو ہم غارِ حرا تک بھی انہی زمانوں میں گئے تھے..

اسی برس میں فروری کے مہینے میں ہی تو گئے تھے لیکن لگتا تھا کہ زمانے بیت چکے ہیں..

کعبہ کا سیاہ پوش مکعب..آنکھوں میں گھنی سبز باس بھرنے والا گنبد..اصحاب صفہ کا تھڑا..بس یہی تو چار خواہشیں تھیں جن پر دم نکلتا تھا..پہلی تین تو پوری ہو گئیں اور چوتھی دو چار ہاتھ رہ گئی..لب بام نہیں کہ ہم اوپر نہیں، بام سے نیچے صحن میں اترنا چاہتے تھے..

انہی زمانوں میں میرا بلند قامت بچہ سُمیر اور میں غارِ حرا کے بام پر..چھت پر نہایت آسودگی سے براجمان غار کے اندر نوافل ادا کرنے کے بعد جو مرد و زن اس ہجوم میں سے نکلنا چاہتے تھے ان کے بڑھتے ہوئے ہماری جانب بلند ہوتے ہاتھ تھام کر انہیں سہارا دے کر اوپر لاتے تھے اور محض یہی ثواب کمانے پر اکتفا کرتے تھے کہ جن پتھروں پر وہ اپنے ماتھے چھو کر آتے تھے ان تک ہماری رسائی ممکن نہ تھی..

جس صحن میں دس پندرہ لوگوں کی بھی گنجائش نہ تھی وہاں پچاس ساٹھ مرد و زن پیک ہوئے حرا کی غار کے اندر دو نفل ادا کرنے کے لالچ میں ٹھنسے پڑے تھے..

میں جونہی چھت سے ان کے اوپر کود پڑنے کا سوچتا تو سُمیر میری سوچ کو پڑھ لیتا اور میرا بازو تھام کر کہتا ''نہیں ابو..''

تو میری یہ چوتھی خواہش ادھوری رہ گئی اور دم نکلتا رہا..

یہ وہی لمحہ تھا جب میرے ذہن کی سوئی کُند ہو کر غارِ حرا پر اٹک گئی..میں نے سوچا کہ نہ میرا ارادہ تھا اور نہ ہی کوئی اتنی شدید خواہش تھی اور یونہی سبب بنتے گئے اور میں چلا آیا..اسے اگر بلاوے کا نام دیا جائے تو جس نے بلایا تھا وہ یقیناً کبھی نہ کبھی اپنی بلاوے کی فہرست پر نظرثانی تو کرے گا اور آگاہ ہو جائے گا کہ یہ جو عمر نے آنکھوں والا شخص ہے بحر الحمد کے بدن والا ہے اس کے ذہن کی سوئی کُند ہو کر اٹک گئی ہے..جو اس لمحے غارِ حرا کی چھت پر ایک تمنائے بیتاب کا مارا..چوتھی خواہش کی تکمیل نہ ہونے پر

اس کا دم نکلا ہے..صرف اقراء کے جہان کے پتھروں میں دو سانس لینا چاہتا ہے..دو نفل ادا کرنا چاہتا ہے تو اسے پھر سے بلا لیا جائے..اس کی تمنا پوری کر دی جائے..اس کے ذہن کی کُند سوئی کو اسی کی تمنا کی سان پر لگا کر تیز کر دیا جائے..تا کہ یہ اقراء کا گیت بغیر کسی اٹک کے سن لے..

اور جب مجھے قطر کے بین الاقوامی ایوارڈ سے نوازا گیا تو پہلا خیال نہ اعزاز کا آیا اور نہ انعامی رقم کا..بس نوازے جانے کا خیال آیا کہ بلاوے کی فہرست پر نظرثانی ہو گئی ہے..یہ ایوارڈ تو محض ایک بہانہ ہے..میں دن رات میمونہ کے ساتھ غارِ حرا تک پہنچنے اور وہاں نہ صرف دو نفل ادا کرنے کے بلکہ کچھ وقت گزارنے کے بارے میں باتیں کرنے لگا..

حج کے زمانے میں بہت لوگ ہوتے ہیں..اب کم لوگ ہوں گے..ہو سکتا ہے صحن میں صرف دس بارہ لوگ ہوں تو مجھے اندر جانے کا موقع مل جائے..ہو سکتا ہے وہ لوگ میرا کچھ لحاظ کریں اور میں کچھ دیر وہیں ٹھہرا رہوں..دو چار پتھروں کو ہاتھ لگا سکوں..دو چار سانس لے سکوں جہاں کچھ سانس ٹھہرے ہوئے ہیں ان سانسوں میں سانس لے سکوں..اور میمونہ نے جو عام طور پر مجھے دیوانہ جانتی ہے اس چوتھی خواہش کی تکمیل کی بے صبری کو قطعی طور پر دیوانگی نہ جانا اور مکمل طور پر مجھے سپورٹ کیا کہ ہاں تمہیں ہر صورت میں غارِ حرا تک اور اس کے اندر جانا چاہیے..

ایک روز میں نے استفسار کیا ''مونا بیگم..نہ تم نے میری اس دیوانگی کا ٹھٹھہ اڑایا ہے..نہ [illegible] مسکراہٹ سے میری دل شکنی کی ہے جو کہ تم اکثر کرتی ہو..تو اس بار ایسا کیوں ہے؟''

تو اس نے نہایت بردباری اور متانت سے جواب دیا ''تمہاری اکثر محبتیں اور جذبے عارضی ہوتے ہیں..تم یکدم کسی ایک منظر ایک کتاب یا ایک چہرے کے سحر میں گرفتار ہو کر مجھ بوجھ سے عاری ہو جاتے ہو اور میں انتظار کرتی ہوں اور وہ لمحہ آ جاتا ہے جب وہ سحر زائل ہو جاتا ہے اور تم پھر سے نارمل ہو جاتے ہو..جیسے وہ سحر کبھی تھا ہی نہیں..لیکن میں نے محسوس کر لیا ہے کہ یہ سحر عارضی نہیں..یہ ٹلنے والا نہیں..اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تمہاری یہ چوتھی خواہش پوری ہو جائے..اسی میں ہم دونوں کی بہتری ہے''

میمونہ مکمل طور پر میرا ساتھ دے رہی تھی..

لیکن میرے بچے میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے..

وہ بھی میرے ذہن میں جو عارضی فتور آتے تھے ان سے واقف تھے اور اسے ایک وقتی ابال سمجھ کر میری خواہش کے اظہار پر اگرچہ فکرمندی سے لیکن مسکراتے تھے...

تو جب میں نے مدینے سے واپسی پر...جدہ میں کچھ روز بسر کر کے ایک شام یہ کہا کہ میں

غار حرا میں ایک رات گزارنا چاہتا ہوں تو سلجوق نے ایک گہری بزرگانہ فکرمندی سے میری طرف دیکھا "نہیں ابو۔"

"لیکن بیٹے کیوں نہیں؟"

اس نے ڈائننگ ٹیبل پر سجی روز بخاری کے پلاؤ سے لبریز ڈش میرے آگے سرکاتے ہوئے کہا "ابو.. یہ بلخ اور بخارہ کے بکینوں کا روسٹ کردہ چکن ہے.. فی الحال اسے نوش فرمائیں.. نہایت خستہ اور پُر ذائقہ ہے.."

میرا کراؤن پرنس مجھے قطعی طور پر سنجیدگی سے نہیں لے رہا تھا..

میری اکلوتی بہو رابعہ نے جب میری اس تمنا کے بارے میں سنا تو اس کی سرسبز آنکھیں شرارت سے ہری بھری پھول جھڑیاں بکھیرنے لگیں "انکل.. میں ایک سعودی سکول میں انگلش پڑھاتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ تو وہاں گرفتار ہو جائیں گے.. سعودی شرطے آپ کو پکڑ کر لے جائیں گے اور پھر آپ بے شک دوہائی دیتے رہیں کہ میں ایک نائب قونصل کا باپ ہوں پھر بھی پکڑ کر لے جائیں گے اور انکل ہو سکتا ہے کہ وہ نہ صرف آپ کو گرفتار کر لیں بلکہ خوب خوب ماریں بھی.. ڈنڈوں کے ساتھ.."

اگرچہ میں ایک نہایت اُلفت بھرا سسر تھا لیکن مجھے شک ہوا کہ میری بہو کی دَر پردہ ایک تمنا تھی کہ مجھے خوب خوب زدوکوب کیا جائے اور وہ بھی ڈنڈوں کے ساتھ..

یہ طے تھا کہ کوئی بھی مجھے سنجیدگی سے نہیں لے رہا تھا اور ہر کوئی سوائے میمونہ کے مجھے ذہنی طور پر کھسکا ہوا سمجھ رہا تھا..

چنانچہ یہ معاملہ میں نے مؤخر کر دیا..

کسی اور دن پر اُٹھا دیا..

کوئی اور دن آیا تو میں نے پھر اپنا مدعا بیان کیا تو سلجوق مجھے سمجھانے لگا.. ایسے دن تھے جب میں اسے سمجھایا کرتا تھا اور اب ایسے وقت آ گئے تھے کہ وہ مجھے سمجھا رہا تھا' میرا بزرگ بن بیٹھا تھا "ابا.. اگر تو آپ نے غار حرا میں دو نفل ادا کرنے ہیں تو اس کا بندوبست آسانی سے ہو جائے گا.. لیکن یہ جو وہاں رات گزارنے کا آپ ارادہ کرتے ہیں تو یہ ممکن نظر نہیں آتا.. میں نے اس دوران ادھر اُدھر سے معلومات اکٹھی کی ہیں.. جدہ کے کچھ پرانے لوگوں سے پوچھا ہے.. قونصلیٹ میں جو قدیمی اور باخبر حضرات ہیں ان سے ذکر کیا ہے تو سب کا یہی کہنا ہے کہ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ کسی شخص نے غار حرا میں پوری رات گزاری ہو.. تو ابو پلیز.."

سلجوق نے آخر میں جو یہ "تو ابو پلیز" کہا تو گویا میرے دل میں چھید کر دیا.. اُس کے چہرے پر اپنے عمر رسیدہ باپ کے لیے ایسی محبت بھری پرچھائیاں سیاہ ہوئیں کہ میں نے فی الفور یہ ارادہ ترک کر دیا..

"ابو آپ جانتے ہیں کہ ان دنوں سعودیہ میں بہت پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے.... حکومت دہشت گردی سے اتنی دہشت زدہ ہو چکی ہے کہ اپنے پرائے کی تمیز نہیں کر سکتی.. اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ اگر آپ وہاں اوپر جاتے ہیں اور رات گزارنے کا قصد کرتے ہیں اور وہاں پولیس چیک کرنے کو آ جاتی ہے تو پھر آپ کی کون سنے گا.. میرا خیال ہی نہیں یقین ہے کہ وہاں سرے سے رات گزارنے کی اجازت ہی نہیں ورنہ کوئی ایک شخص تو ایسا مل جاتا.. میں یہاں بڑے بڑے سرپھرے حضرات کو جانتا ہوں لیکن ان میں سے کسی ایک نے یہ بھی نہیں کہا کہ ہاں میں نے سنا ہے کہ کبھی کوئی شخص وہاں رات بسر کر کے آیا ہے.. تو اگر اجازت ہی نہیں ہے تو.."

ظاہر ہے سلجوق سعودیہ کے تازہ ترین اور مخدوش حالات سے آگاہ تھا.. اور درست کہتا تھا.. یہ زمانے اچھے نہ تھے..

میں بجھ سا گیا.. وہ جو تمنا بے تاب ہوئی جاتی تھی اُس پر اوس پڑ گئی..

اگلے ایک دو روز میں میں کچھ سنبھل گیا اور مجھے احساس ہوا کہ یہ ایک بے جواز خواہش تھی اس لیے اس کا ادھورا رہ جانا ہی بہتر تھا.. چلیے فرض کر لیجیے کہ میں غار حرا میں ایک رات بسر کر بھی لیتا ہوں تو کیا ہو گا.. میں جیسا اُوت کا اُوت ہوں ایسا ہی رہوں گا.. میری اس خواہش میں نہ مذہبی جذبات کی شدت کا کچھ عمل دخل تھا نہ آخرت کی کچھ فکر تھی اور نہ ہی ثواب کا لپکا تھا تو میں نے وہاں جا کر کیا کرنا تھا.. اگر بابا کی الفت مجھے وہاں رات بسر کرنے پر اکساتی تھی تو کیا ان کی تلقین کا مجھ پہ کوئی اثر ہوا تھا.. جو وہ کہتے تھے کیا میں اُس پر عمل پیرا ہوا تھا.. نہیں ہوا تھا ناں تو پھر اس خواہش کا جواز سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ میں صرف ایک تجربے میں سے گزر کر اُسے بیان کرنا چاہتا تھا.. کسی طور ممتاز ہونا چاہتا تھا تو یہ کتنی بڑی خود غرضی تھی' نمود کی کیسی قابل مذمت آرزو تھی.. میرے پاس کوئی جواب نہ تھا سوائے اس کے کہ میرا جی چاہتا تھا.. کیوں جی چاہتا تھا؟ اس کا جواب تو جی ہی دے سکتا تھا اور وہ صرف یہ کہتا تھا کہ بس میں یہ چاہتا ہوں.. جیسے کوئی بچہ یکدم ضد کرنے لگے کہ ابو میں نے غبارہ لینا ہے اور رات کے اسی پہر لینا ہے.. ایسے ہی جی چاہنے لگتا تھا کہ میں نے بہر صورت جھیل کرومبر دیکھنی ہے.. سنو لیک تک جانا ہے.. اور [illegible] جانا ہے... بے سود اور بے جواز خواہشیں جو ایک آوارہ گرد ذہن کے خلیوں میں ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے جنم لیتی ہیں اور حواس پر سوار ہو جاتی ہیں.. ایسے شخص کا پاسبان عقل چونکہ پیدائشی مخبوط الحواس

ہوتا ہے اس لیے کبھی نہیں اکثر دل کو تنہا چھوڑ دیتا ہے چنانچہ دل.. دل مانی کرنے لگتا ہے.. میں مخمصے میں پڑ گیا.. بہت اُلجھ گیا.. ہزاروں خواہشیں بے جواز ہو سکتی تھیں لیکن غارِ حرا میں رات بسر کرنے کی خواہش ہرگز بے جواز نہیں ہو سکتی تھی.. جواز اگر میرے پاس نہ تھا تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ جواز نہ تھا.. وہ مقام بہ ذاتِ خود ایک جواز تھا اور اس نے میرے اندر یہ خواہش بھری تھی..

کبھی اس نتیجے پر پہنچتا کہ محض حج کے ہیجان نے مجھے وقتی طور پر یہ اشتعال دلایا ہے.. محض ایک اور تجربے میں سے گزرنے کی ہوس ہے.. جس کھوہ میں بابا راتیں بسر کرتے تھے تو اس کے پتھروں کو جی بھر کے وہاں وہاں چھونے کے لالچ میں گرفتار ہوں جہاں جہاں اُن کا لمس اثر انداز ہوا تھا.. سہارا لیتے.. اندر داخل ہوتے.. بیٹھتے.. لیٹتے ان کا بدن جن پتھروں سے مس ہوتا تھا میں بھی ان کو چھولوں.. یہ کیا خواہش ہوئی.. اور یہ خواہش تو چند لمحوں میں پوری ہو سکتی ہے تو پوری رات بسر کر کے وہاں کیا لینا ہے.. یہی کافی ہے کہ اس بار اس کے اندر دو نفل ادا کر لوں چند جتنے گہرے سانس میں لے سکتا ہوں اتنے.. یا ایک دو مزید بھی سانس لوں اور جبلِ نور سے اُتر آؤں..

میں نے اپنے حتمی فیصلے سے اپنی آل اولاد کو آگاہ کر دیا اور رات گزارنے کی خواہش سے دستبرداری کا بخوشی اعلان کر دیا..

سب کے چہروں پر اطمینان بھری مسکراہٹیں نمودار ہو گئیں سوائے میمونہ کے.. کہ وہ جانتی تھی کہ یہ بے شک کچھ بھی اعلان کرے اندر سے بے ایمان ہی رہے گا..

چنانچہ اُس شب اس دستبرداری کی خوشی میں ہم سلجوق کے ولا سے نکل کر فلسطین سٹریٹ پر آئے.. "مرچی ریستوران" میں میکسیکو کے تیز مرچوں والے پکوان اور پاپڑ کھائے.. اور جدّہ کی واحد تفریح گاہ جہلیا سٹریٹ میں بے مقصد گھومے.. چند سپر سٹورز اور شاپنگ مالز میں پیدل چل چل کر اپنے آپ کو بے وجہ تھکایا.. سمندر کے کنارے لمبی ڈرائیو کی..

جدّہ کے نواح میں ایک شاپنگ کامپلیکس کی پیشانی پر "حرا" کا نیون سائن روشن دیکھ کر میں نے سوچا غارِ حرا نہ سہی حرا کا شاپنگ کامپلیکس ہی سہی.. وہاں تو گھپ اندھیرا ہوگا اور یہاں برقی نور ہی نور تھا.. سٹورز.. شوروومز.. بناوٹی پھولوں کی دکانیں.. سوٹ کیس.. سٹاربک کافی.. جاپانی معجزوں کے انبار.. اور ان شوروومز میں ایسی ایسی کاریں بجی ہوتی جو یورپ اور امریکہ والے بھی نہیں دیکھ پاتے.. کہ وہ انہیں افورڈ نہیں کر سکتے.. اور محض سعودیوں کے لیے خیر سگالی کے جذبات رکھتے ہوئے ان کی محبت میں مارے ہوئے ان ماڈلوں کو ادھر روانہ کر دیتے ہیں.. اس حرا کمپلیکس میں یقیناً کروڑوں ڈالر کا ہمارے لیے سامانِ تعیش تھا جب کہ مقامیوں کے لیے محض سامانِ تفریح تھا.. کسی ایک کار کی قیمت اتنی تھی کہ حضورؐ کے

زمانے میں بس اتنی قیمت میں پورا حجاز خریدا جا سکتا تھا.. مکہ اور مدینہ سمیت اور اگر اس میں رب شامل کرا لیا جائے تو نجد کا سودا ہو سکتا تھا.. ان نقد و نقد سودوں میں غارِ حرا کے چند پتھروں کی کیا وقعت تھی..

پاکستان واپسی کے دن قریب آ رہے تھے..

سلجوق اپنی امی کے لیے.. اور چونکہ میں اس کی امی کا خاوند تھا اس لیے ضمنی طور پر میرے لیے بھی پُرتکلف پروگرام ترتیب دے رہا تھا.. شہر کے پاش اور مہنگے ریستورانوں میں کھانے.. جدّہ کے دوستوں کے گھروں میں محفلیں.. وغیرہ.. اور یہ جو اس کی امی تھی اور میری بیگم تھی بلکہ اب بھی ہے.. جنت ہو گی.. اپنے بیٹے اور بہو میں مست.. بس اپنی بہو کی لاڈلی اور دل میں اتر جانے والی باتوں پر لٹو ہوئی جاتی تھی..

اور وہ کوئی ایک لٹو تھوڑی تھی جو رابعہ کے گرد گھومتی تھی..

جو کوئی بھی اُس سے ملتا تھا وہ گھومنے لگتا تھا..

اور ان میں میرا برخوردار بھی شامل تھا جو فل سپیڈ پر گھومتا تھا..

سلجوق ان محفلوں میں.. ان پُرتکلف دعوتوں میں.. اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتا.. اپنی ڈپلومیٹک گفتگو اور مسلسل مسکراہٹ میں مگن عینک سنبھالتا کبھی کبھار جب میری جانب دیکھتا اور میری تمام تر مسرت اور سوشل ہونے کی اداکاری کے باوجود جب میری جانب دیکھتا تو اس کے چہرے پر ایک پرچھائیں سی تیر جاتی.. اُس کے اندر کوئی نہایت ہی سپر ٹیک سسٹم نصب تھا جو اُسے فوری طور پر آگاہ کر دیتا کہ اس لمحے.. ابا جو پُرمسرت قہقہے لگا رہا ہے.. بے وجہ ہر دل عزیز ہونے کی کوشش کر رہا ہے تو یہ ابا خوش نہیں ہے.. ابھی تک جلتا ہے.. اداکاری کے جوہر جو اس میں نہیں ہیں اُنہیں دکھا رہا ہے.. اُسی لمحے ابا جناب کی ناؤ میں ڈولتا پھرتا ہے.. وہ مجھے رُوبرُو پا کر کیسے نہ میرے دل کا حال جانتا کہ جدّہ سے آنے والے فون کو لاہور میں اٹھا کر جب میں صرف "ہیلو" کہتا تھا تو وہ اس ایک "ہیلو" سے سب کچھ جان جاتا تھا.. ابو آپ کی طبیعت ٹھیک ہے ناں.. کیا بات ہے والد صاحب.. اور والد صاحب کی طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہوتی تھی..

تو وہ کیسے نہ مجھے رُوبرُو پا کر میرے دل کا حال نہ جانتا..

وہ جانتا تھا کہ ابا جی ناخوش ہیں.. اُن کا دل اٹکا ہوا ہے.. جیسے ایک گولڈن فش پانی کی گہرائی میں تہہ تک چلی جائے تو وہ آبی پودوں میں اُلجھ جاتی ہے.. لاکھ سنہری ہونے کی سعی کرے.. سطحِ آب پر آنے کے لیے کھوے سے پھلا کر اپنے اندر آکسیجن بھرنے کی کوشش کرے ناکام رہتی ہے.. وہیں اٹکی رہتی ہے.. یوں ابا بھی اٹکا ہوا ہے.. اسی لیے وہ جب بھی میری جانب دیکھتا تھا تو اس کے چہرے پر ایک پرچھائیں سی تیر جاتی تھی.. جیسے ایک اور کے سرے پر بندھی سوالیہ نشان ایسی ٹیڑھی کنڈی کو

خوراک سمجھ کر ایک مچھلی منہ مار لیتی ہے اور وہ کنڈی اس کے گلپھڑوں میں پروئی جاتی ہے.. اور اس ڈور کو کوئی لٹکا ہوا چھپا ہوا کھینچتا ہے تو مچھلی کا کچھ اختیار نہیں رہتا.. وہ اٹکی رہتی ہے.. ایسے ہی ابا بھی اٹکا ہوا تھا..

پاکستان واپسی کے دن بہت قریب ہونے لگے..

یہ طے کیا جا چکا تھا کہ روانگی سے ایک روز پیشتر جب ہم عمرہ کرنے جائیں گے تو فجر کے فوراً بعد جائیں گے اور پہلے غار حرا تک جائیں گے.. نفل ادا کر کے نیچے آئیں گے اور پھر خانہ کعبہ جائیں گے..

اٹکی ہوئی مچھلی کو جب رہائی کی کوئی امید نہ رہی تو ایک روز سلجوق نے نہایت سرسری انداز میں کہا "ابا... میں اس دوران بیکار نہیں بیٹھا رہا.. ہوم ورک کرتا رہا آپ کے پروجیکٹ کے بارے میں.. میں نے خاصی تحقیق کی ہے.. اپنے سفارتی ذرائع بروئے کار لا کر کھوج لگائی ہے کہ بظاہر تو غار حرا میں رات بسر کرنے پر کوئی سرکاری پابندی نہیں ہے.. میرے ذرائع نے اطلاع فراہم کی ہے کہ جبل نور کی چوٹی پر رات کے وقت کچھ کشمیری لوگ قیام کرتے ہیں جو وہاں کھوکھے لگائے مشروبات وغیرہ فروخت کرتے ہیں.. اُن میں سے کچھ تو شام ڈھلے نیچے آ جاتے ہیں لیکن دو چار افراد وہیں رات گزارتے ہیں.. پولیس وہاں جا کر چیکنگ کرتی ہے یا نہیں اس کے بارے میں کچھ علم نہیں ہو سکا.. تو میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ بے شک اوپر جائیں.. غار میں کچھ دیر ٹھہریں اور پھر حالات کا جائزہ لیں.. اگر تو کوئی مسئلہ نہ ہو تو...."

"صحیح.." میں نے یہ لفظ تب ادا کیا جب سلجوق کے کمپاؤنڈ میں واقع سوئمنگ پول میں ایک روسی خاتون آہستگی سے اپنی تیراکی کی مشاقی کی بدولت پانی پر ایک لہر بھی اُبھرنے نہ دیتی تھی.. تیرتی جاتی تھی.. شام ڈھلے پول میں اُترتی تھی اور ایک روبوٹ کی مانند رات گئے تک تیرتی رہتی تھی.. "دیکھو.. میں ایسا کرتا ہوں کہ شام سے پہلے.. دن کی روشنی میں وہاں جاتا ہوں.. مجھے امید ہے کہ میں ایک بار پھر جبل نور کی کٹھن چڑھائی طے کر لوں گا اور چوٹی تک پہنچ جاؤں گا.. اگر تو وہاں زیادہ لوگ نہ ہوئے اور امکان یہی ہے کہ نہیں ہوں گے.. تو غار حرا میں چند نفل ادا کروں گا اطمینان سے... کچھ دیر اس میں قیام کروں گا اور پھر نہایت ٹھنڈے دماغ سے جذباتیت کے بغیر حالات کا جائزہ لوں گا.. اگر تو وہاں کوئی پابندی نہ ہوئی.. کچھ دشواری نہ ہوئی اور اُس مقام پر پوری رات گزارنے کے خیال سے میں دہشت زدہ نہ ہوا تو ٹھہر جاؤں گا ورنہ تاریکی چھا جانے سے پیشتر جبل نور سے اتر کر سامنے سے آنے والی پہلی ٹیکسی پر سوار ہو کر "جدہ.. جدہ.." پکاروں گا اور واپس آ کر ڈنر میں شریک ہو جاؤں گا اور رابعہ کے تیار کردہ چکن تو ول نوش کر لوں گا اور مجھے کوئی پچھتاوا نہ ہو گا.."

"میرا خیال ہے آپ واپس آ کر چکن تو ول ہی نوش کریں گے.." سلجوق نے اپنے دانتوں کی نمائش کی جس پر رابعہ فوراً فکر مند ہو گئی.. "سلجوق آپ کے دانت ہم سطح نہیں.. ذرا آگے پیچھے ہیں میں کسی وقت چیک کروں گی.." کیونکہ وہ ایک ڈینٹل سرجن ہونے کو تھی اور جب سے شادی ہوئی تھی سلجوق اس کے سامنے مسکرانے سے گریز کرتا تھا..

"ویسے ابو.." وہ بہت متانت سے ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگا "آئیڈیا زبردست ہے.. یقین کیجیے میرا بھی بہت ہی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ اوپر چلوں.. وہاں ہم دونوں ایک رات گزاریں.."

"تو کیوں نہیں چلتے.."

"میری سرکاری ذمہ داریاں ایسی نوعیت کی ہیں کہ.. اگر کسی کو خبر ہو گئی تو حساس نوعیت کا معاملہ ہو جائے گا.. ویسے ابو جو کہا سنا وہ اپنی جگہ.. لیکن مکہ کے گرد جو خشک صحرائی پہاڑیاں ہیں ان میں گرم علاقوں میں پائے جانے والے حشرات الارض بھی بہت ہیں.. رینگنے والے زہریلے کیڑے.. بچھو وغیرہ بھی ہیں تو زمین پر سونا خطرے سے خالی نہیں.. آپ کو بلڈ پریشر کا بھی کچھ عارضہ ہے.. اور خدانخواستہ وہاں کوئی ایمرجنسی ہو گئی تو کیا ہو گا.."

"کچھ بھی نہیں ہو گا بیٹے.. اگر کچھ ہو گیا تو اس سے بہتر جگہ کچھ ہو جانے کی کیا روئے زمین پر اور کہیں ہے؟.. کبھی نہ کبھی تو کچھ ہونا ہے.. وہاں ہو جائے تو کیا ہی نصیب والی بات ہے.. کہ نہیں؟"

"ہاں ہے تو سہی.." حیرت انگیز طور پر اس نے مجھ سے اتفاق کیا اور پھر اپنی مسکراہٹ کو عیاں کرتا کرتا رہ گیا "ویسے والد صاحب.. اوپر جانے کی کچھ تیاری بھی کی ہے؟"

"مکمل ہے.." میں کھل کر مسکرایا چونکہ میری بیوی ڈینٹل سرجن نہ تھی..

”فہرست سامان برائے غارِ حرا..
تبتی رُک سیک میں“

سلجوق نہیں جانتا تھا کہ میں نے یہ تیاری اسی روز شروع کر دی تھی جس روز یہ امکان رونما ہوا تھا کہ میں قطر سے فارغ ہو کر جدہ جا سکتا ہوں.. کسی بھی کوہ نوردی کی مہم سے پیشتر اس مہم کے لیے درکار سامان کی فہرست تیار کرنے میں جو ہیجان خیز مسرت بدن کو نکھارتی ہے وہی تو اصل ایڈونچر ہوتا ہے.. کہ خیمہ جو ایک برس سے پیک پڑا ہے اُسے کھول کر دھوپ میں رکھو' ہوا لگواؤ.. ڈاؤن جیکٹ چیک کرو.. ٹریکنگ بوٹ پہن کر ایک دو روز اُن میں گھومو.. اونی انڈرویئر.. چترالی ٹوپی.. فلسطینی رومال.. اور برف کی راتوں کے لیے خشک گوشت .. پنیر.. سارڈین مچھلی.. خوراک کے ٹین.. کافی.. دیسی گھی.. چاول.. وغیرہ وغیرہ.. تو میں نے اس ”مہم“ کے لیے بھی کہ غارِ حرا تک پہنچنا بھی تو ایک کوہستانی مہم تھی.. جبل نور بے شک بہت بلند نہ تھا لیکن ایک پہاڑ تھا اور اس کی چوٹی پر پہنچنا تھا اور وہاں قیام کرنا تھا تو میں نے اس مہم کے لیے بھی سامان کی ایک فہرست تیار کر رکھی تھی.. جس کی تفصیل میں ہو بہو نقل کیے دیتا ہوں..

”سامان غارِ حرا“

۱۔ ایک عدد چھوٹا سا رُک سیک..

۲۔ تھوڑی ادھم یا دو عجوہ کھجوریں، اگر عجوہ ہوں تو بہتر ہے (کہ حضور اس بلند آماجگاہ میں قیام کے دوران یہی پھل استعمال کرتے تھے)

۳۔ دودھ کی ایک لٹر والی بوتل.. (شاید خاتون جنت.. یا ایک اور فاطمہ چھوٹی سی بچی کی حیثیت میں شبیکہ میں واقع وادی سے حضور کے لیے بکریوں کا تازہ دودھ اوپر لے کر جاتی تھیں)..

۴۔ ایک تسبیح..

۵۔ ایک جائے نماز..

۶۔ ایک بہت بڑا سینڈوچ.. پنیر اور مکھن سے بھرا..

۷۔ کوئی اور پھل.. سیب وغیرہ..

۸۔ منرل واٹر کی بوتلیں..

۹۔ ایک عدد چھتری..

۱۰۔ پوٹیٹو چپس کے ایک دو پیکٹ..

۱۱۔ اگر ڈر کی وجہ سے.. یا دہشت کے باعث نیند نہ آئے تو اعصاب کو سکون دینے کے لیے ”Relaxin“ کی چند گولیاں..

۱۲۔ بلڈ پریشر کی ”Norvasc“ اور اسپرین کی گولیاں..

۱۳۔ دور کی عینک..

۱۴۔ سگریٹ اور لائٹر..

۱۵۔ پاسپورٹ اور شناختی کارڈ..

۱۶۔ ٹشو پیپرز کا ایک پیکٹ..

۱۷۔ ایک ٹارچ (یہ بہت اہم ہے)

۱۸۔ تولیہ، برش اور ٹوتھ پیسٹ..

مندرجہ بالا جتنی بھی اشیاء کی میں نے تفصیل درج کی ہے ان میں وہ جائے نماز بھی شامل تھا جو رابعہ کے ابو نے خانہ کعبہ میں بسر کی گئی عبادت کی راتوں میں استعمال کیا تھا اور اس نے بطور خاص اس عزیز شے کو میرے حوالے کر دیا تھا..

فہرست میں درج بیشتر اشیاء کو میں نے دبیز کپڑے کی تبتی رُک سیک میں باری باری پیک کیا تھا.. اس رُک سیک کو میں نیپال سے لایا تھا اور پھر اسے قطر کے لیے روانہ ہوتے ہوئے خاص طور پر اپنے سامان کا حصہ بنایا تھا کہ اگر اوپر جانا ممکن ہو گیا تو کاندھے پر ڈالنے کے لیے یہ بہت موزوں ہو گا.. علاوہ ازیں جیبیں بہت ہیں.. زِپ سے بند ہو سکتی ہیں تو بہت موزوں ہے..

تفصیل میں.. کھٹمنڈو کے پُر رونق بازار میں.. جنت سے آئے ہوئے مہاجرین کی ایک دکان میں.. شوخ رنگوں کی.. میکسیکو کے پانچوز کے رنگوں کی.. تبتی نمونوں والی درجنوں دیدہ زیب کھڈی پر بنی ہوئی مصنوعات تھیں.. پرس.. بیگ.. ڈھیلے سوٹ کیس.. چادریں.. جیکٹیں.. اور یہ ڈھیروں میں تھیں.. اور

ایک ڈھیر کے بھیتر میں سے یہ مختصر سا تھیلا اپنے رنگوں کی چھب دکھلاتا جھانک رہا تھا.. میں نے اس کا ایک سٹریپ پکڑ کر کھینچ نکالا اور قیمت بہت مناسب تھی' خرید لیا.. کہ شاید یہ عینی کو پسند آ جائے اور وہ اپنی میڈیکل کی بھاری کتابیں اس میں ڈال کر کالج میں اپنی سہیلیوں کو یہ کہہ کر حسد میں مبتلا کرے کہ یہ تو ابو نیپال سے لائے تھے.. تبت کا بنا ہوا ہے..

تو اس لمحے جب میں تھمل سٹریٹ میں ایک ڈھیر میں سے اس تبتی رُک سیک کو کھینچ کر نکالا تھا اور نہایت کاروباری ہوشیار اور چپٹی ناک کے باوجود ایک نہایت دل پذیر شکل والی تبتی دوشیزہ سے بھاؤ تاؤ کرتا تھا تو کیا اُس لمحے میں گمان کر سکتا تھا کہ میں اس تھیلے میں غارِ حرا تک جانے اور وہاں ایک رات بسر کرنے کی آرزو کے سامان بھروں گا.. یا اس کا دبیز بھیتر کیلئے رنگوں والا کھیس نما کپڑا یہ جانتا تھا کہ.. کیا میں ایک ایسے سفید فام سیاح کے کاندھوں پر ہوں گا جو مجھ میں نیپال کی خالص چرس پوشیدہ کر کے کنچن چنگا کی برف پوش وادیوں میں جائے گا.. مجھ میں کسی امریکی خاتون کے زیرِ جامہ ہوں گے.. یا یہ کہ.. مجھ میں آج سے چودہ سو برس پیشتر کے کچھ سامان ہوں گے.. کچھ خوراکیں ہوں گی اور میں غارِ حرا کے اندر ایک رات آرام کروں گا.. اپنے تبت سے.. دنیا کی چھت سے... بہت دور ایک ایسی غار میں پنہاں ہوں گا.. جس میں سے اقراء کی روشنی ظاہر ہوئی اور کل کائناتوں کو منور کرتی چلی گئی..

اس تبتی رُک سیک کے گمان میں یہ سب کچھ کیسے ہو سکتا تھا.. اور یہ بھی اُس کے تبتی مہاتما بدھ دھیان میں کیسے آ سکتا تھا کہ جو شخص مجھے کاندھے پر ڈال کر وہاں تک لے جائے گا.. وہ کوئی دھیان گیان والا لاما نہیں.. محض ایک بیکار اور بے جواز زندگی گزارنے والا آوارہ گرد ہے..

یہ تبتی رُک سیک خاص بھاری ہو گیا تھا..

لیکن میں نے یہی قیاس کیا کہ میرے گناہوں سے بڑھ کر کیا بھاری ہو گا..

اگر میں اُن کا بوجھ نہایت آسانی سے اور بنا شرمندگی کے اٹھائے پھرتا ہوں تو اُن کے مقابلے میں یہ تو پروں کی پوٹلی ہے..

''تخت ہزارے لے چل بُلھیا..''

چنانچہ اگلی دوپہر..

وہ متناسب بدن کی روسی خاتون جانے کوئی آبی جانور تھی.. وہ اگلی دوپہر بھی کمپاؤنڈ کے سوئمنگ پول میں ایک روبوٹ کی مانند بے آواز تیر رہی تھی..

میمونہ مطمئن تھی.. رابعہ پُرتشویش اور سلجوق ان دونوں کیفیتوں کے درمیان میں کہیں اُلجھا ہوا.. جب میں جوگرز کے تسمے باندھ رہا تھا.. نہیں مجھے یاد آ گیا کہ میں نے خاص طور پر اُس روز ایسے جوگرز پہنے تھے جن کے آس پاس میں جُڑ جانے والے فلیپ تھے تاکہ غارِ حرا میں.. اُس کی رات میں انہیں پہننے اور اُتارنے میں آسانی ہو تسموں میں نہ اُلجھا رہوں.. رابعہ نے چڑھائی کے دوران دھوپ سے بچاؤ کے لیے ایک چھوٹا سا تولیہ بھی رُک سیک کی ایک جیب میں رکھ دیا..

ڈرائیور کا نام امانت تھا..

اس نے مجھے مکہ سے پرے جبل نور کے دامن میں ڈراپ کرنا تھا.. نہیں ڈراپ نہیں کرنا تھا سلجوق نے اُسے ہدایت کی تھی کہ یہ ابا بھی ایک امانت ہے انہیں جبل نور کے دامن تک لے جانا ہے اور پھر آپ نے وہاں انتظار کرنا ہے کہ کب یہ ابا ہونکتا اور بے حال ہوتا توبہ تائب ہو کر واپس آتا ہے اور اسے لے کر واپس آنا ہے' رات کے کھانے سے پہلے.. یعنی چکن نوڈل کے ڈنر سے پہلے پہلے..

وہ میرے ساتھ کمپاؤنڈ سے باہر آ گیا جہاں امانت منتظر تھا..

''ابو.. کیا یہ کافی نہ ہو گا کہ آپ اوپر پہنچ جائیں.. وہاں غار کے اندر کچھ دیر ٹھہریں اور پھر واپس آ جائیں؟'' میرے لیے اس کی تشویش پھر لوٹ آئی تھی..

''ہاں.. کافی ہو گا''

''تو آپ آ ہی جایئے گا..''

''دیکھتے ہیں..''

اور یہ دراصل سلجوق کا تکیہ کلام تھا کہ وہ کبھی بھی کوئی واضح فیصلہ نہیں کر پاتا تھا.

''بیٹے سوٹ کے ساتھ سادہ ٹائی پہنو گے یا دھاریدار..''

''دیکھتے ہیں..''

''کیا آج شام ہم اِکیا کے شوروم میں کافی مگ خریدنے جائیں گے..''

''دیکھتے ہیں..''

اُس کی یہ خامی اُس کے سفارتی کیریئر کے لیے نہایت موزوں ثابت ہوئی کہ ''دیکھتے ہیں'' میں نہ اقرار ہوتا ہے اور نہ صاف انکار.. چنانچہ میرے ''دیکھتے ہیں'' کہنے پر وہ مسکرانے لگا ''ٹھیک ہے ابا.. دیکھتے ہیں.. اینڈ ٹیک کیئر آف یور سیلف اینڈ سی یو ایٹ ڈنر..''

''مکہ مکرمہ... 90 کلومیٹر''

شاہراہ مکہ پر آویزاں.. شاہراہ کے ماتھے پر نصب' جس ماتھے کے پیچھے سے ہم ایک ہموار رفتار سے گزر گئے ایک مرتبہ پھر ایک شہر کا نام اور وہاں تک کا فاصلہ نظر آیا تو وہ دل کو وہی انہونی اور انوکھی مسرت بخش گیا جو زندگی میں پہلی بار نظر آیا تو حاصل ہوئی تھی.. کیسا جادوئی نام تھا.

میں امانت کے برابر میں بیٹھا تھا.. سعودیہ میں پہلی بار ایک کار میں سلجوق کے سوا کسی اور کے برابر میں بیٹھا تھا اور ذرا تنہا محسوس کرتا تھا.. بیٹے کی حفاظت کے بغیر ذرا بے چارہ سا محسوس کرتا تھا.

تبتی یکھیں کے کپڑے سے بنا ہوا ڈھیلا ڈھالا رک سیک میری گود میں تھا اور میں نے اُسے دونوں ہاتھوں سے یوں تھام رکھا تھا جیسے مجھے ڈر ہو کہ مجھ سے کوئی اسے چھین لے گا.

جیسے نرسری کلاس میں داخل ہونے والا بچہ پہلے روز اپنے بستے کو تھامے ہوئے ہوتا ہے.. ایک ایسا بچہ جو ابھی لکھ پڑھ نہیں سکتا تھا.. اُمّی تھا.. اُس کے کانوں میں ابھی اقرا کی آواز نہیں آئی تھی..

''مکہ مکرمہ.. 80 کلومیٹر..''

اور مکہ کی جانب سفر کرتے ہوئے یہ مناسب موقع ہے کہ میں آپ کو.. اپنے پڑھنے والوں کو ایک راز میں شامل کروں.. دل کی ایک بات میں شریک کروں کہ میں وہ سب کچھ پوری ایمانداری سے بیان کروں گا اور بلا جھجک آپ سے کہہ دوں گا جو مجھ پر گزرے گی اور جو مجھ پر گزر چکی تھی.. مجھ پر جو کچھ گزر چکی تھی میں نے اُسے پوشیدہ رکھا تھا.. کسی سے بھی اُس کا تذکرہ اس لیے نہیں کیا تھا کہ کہیں اسے بہانہ کر مجھے وہ روک نہ لیں.. اور یہ کیا تھا کہ شاید میں رو کا ہی جانا چاہتا تھا..

حج سے واپسی پر پاکستان میں میں ایک مکمل طمانیت اور آسودگی میں رہا.. زندگی میں سب سے بڑے انتہائی تجربے کے نشے کے لطف میں رہا اور جب یہ نشہ کم ہوا.. اور سب نشے بے شک وہ روحانی نوعیت کے ہی کیوں نہ ہوں کم ہو جاتے ہیں.. کم از کم میرے ایسے شخص کے.. تو میری کند سوئی غارِ حرا پر اٹک

گئی.. کیسے ہوگا' کب ہوگا' کیا اس حیات میں ممکن ہوگا؟.. پھر اس بین الاقوامی ایوارڈ کی غیبی مدد آ گئی..

پاکستان سے روانگی کے وقت.. قطر میں قیام کے دوران' نہ مجھے خانہ کعبہ کی دید کی تمنا نے بیتاب کیا اور نہ عمرہ ادا کرنے کے ثواب نے میرا دامن پکڑا.. غارِ حرا تک جانے اور وہاں اُس کے اندر نہ سہی اُس کے آس پاس جبل نور پر کہیں بھی ایک رات بسر کرنے کا ناقابل سمجھ خبط تھا جو ہمہ وقت مجھ پر طاری رہا.. میں اگر کبھی بے دھیان ہوا غارِ حرا سے تو صرف روضۂ رسولؐ پر دوبارہ حاضری کے خیال سے ہوا... اور وہ بھی چند لمحوں کے لیے ہوا.. خبط کے سوا.. اسے اور کیا نام دیا جا سکتا ہے جو خانہ کعبہ اور روضۂ رسولؐ سے بھی بے دھیان کر دے..؟

اور اب میں آپ کو دل کی اُس بات میں شریک کرتا ہوں.. جونہی جدہ ایئرپورٹ پر اُترا ہوں.. پہلا قدم رکھا ہے تو گویا سو کلومیٹر دور جبل نور کے دامن میں جا قدم رکھا ہے تو میرے پاؤں میں شدید خوف ایک آکاس بیل کی مانند لپٹ گیا ہے.. اُن میں ڈر بھر گیا ہے.. ایسا ڈر جو رینگتا ہوا میرے پاؤں سے سرکتا ٹانگوں کے راستے میرے دل کے گرد پہنچ کر ایک آسیب کی مانند مسلط ہو جاتا ہے.. اور پھر اس ڈر میں سے سیاہ کونپلیں پھوٹتی ہیں اور بڑھتی جاتی دماغ کے اُن خلیوں کے گرد لپٹتی جاتی ہیں جن میں غارِ حرا میں ایک رات بسر کرنے کا خبط مقیم ہے..

لاہور میں.. دوحہ میں قیام کے دوران کچھ ڈر نہ تھا.. ایک ہمہ وقت تمنا کی بے تابی تھی.. کوئی اور خیال نہ تھا.. اور جونہی جدہ میں قدم رکھتا ہوں' اس تمنا کی تکمیل کی سرزمین پر یعنی اس کے بیس کیمپ میں پہنچتا ہوں' اور یہاں سے اوپر چوٹی تک پہنچنے کا امکان سامنے آتا ہے تو ڈر بھی آ جاتا ہے.. جو ایک خیالی منصوبہ بندی تھی وہ یہاں حقیقت میں بدل سکتی تھی تو مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے اور رو کے جانے کی خواہش کرتا ہوں..

جیسے اپنے سفر کے راستے کا تعین کرتے ہوئے کوئی ایک شہر.. قرطبہ' دمشق یا بیت المقدس محض چند حرف ہوتے ہیں ایک نقشے پر اور اُن حرفوں میں پنہاں جو شہر ہوتا ہے اُسے ظاہر دیکھنے کے لیے آپ بے تاب ہوتے ہیں.. لیکن جب آپ ایک طویل سفر کے بعد بچ بچ اُن کے دروازے پر جا کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دستک دینے سے وہ کھل سکتے ہیں تب ایک خوف دامن گیر ہو جاتا ہے کہ پتہ نہیں اس در کے اندر کیا ہے.. میں اس کے اندر چلا گیا تو کیا ہوگا.. آپ ڈر جاتے ہیں.. لیکن نہیں.. یہ حوالہ یونہی خیال میں آ گیا.. یہ کچھ صائب نہیں' موزوں یا مناسب ہرگز نہیں.. کہ ذاتِ رسولؐ کے حوالے سے کوئی بھی مقام.. جہاں اُن کے نقش پا ہوئے.. جہاں اُن کے سانس اور موجودگی ہوئی اُس کا موازنہ کسی اور مقام یا احساس سے نہیں کیا جا سکتا.. بیت المقدس میں ایک عارضی قیام تھا..

بس یوں سمجھ لیجیے کہ جدہ میں قدم رکھتے ہی میں یکدم شدید طور پر یوں خوفزدہ ہو گیا کہ یہ میں کیا سوچتا رہا ہوں.. یہ میں کیسے سوچ ہی سکتا تھا کہ جہاں حضورؐ راتیں بسر کرتے تھے.. میں؟.. وہاں رات بسر کروں.. جہاں جبریل امین بہ نفس نفیس اُترے اور ہم کلام ہوئے.. وہاں میں؟ جو کھرب ہا انسان گزر چکے اور جو ارب ہا انسان اس روئے زمین پر موجود ہیں اُن سب نے جس کتاب میں شک نہیں اُس پر سر جھکائے اور اُس کتاب کا پہلا نازل ہونے والا حکم "اقراء" پڑھا اور پڑھتے ہیں تو جہاں وہ نازل ہوا.. اس مقام پر.. اور جہاں جن پتھروں پر حضورؐ کے ہاتھوں کا لمس ہوا.. اُن کے سانس اُن پر تم ہوئے.. جہاں وہ سوال کرتے تھے.. اُن کے ذہن میں جو سوال جنم لیتے تھے اُن کے جواب چاہتے تھے.. بیٹھتے تھے.. لیٹتے تھے.. سوتے تھے اور جاگتے تھے تو میں وہاں؟.. انسان بے شک دیوانگی کی ہر سرحد عبور کر جاتے لیکن اس سرحد کے پار اگر یہ مقام ہو تو اُس کی دیوانگی میں بھی خلل آ جائے گا.. وہ رُک جائے گا.. ڈر جائے گا..

میں.. جدہ کے قیام کے دوران.. مدینے سے واپسی پر میمونہ کے ہمراہ اپنی بہو کی فراہم کردہ گھریلو ضرورت کی اشیاء پر نظر ڈالتا "بن داؤد" سٹور میں کپڑے دھونے کا صابن.. شیمپو.. تولیے یا پھل فروٹ اور سبزیاں پرکھ رہا ہوتا.. پنیر کی مختلف اقسام کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا اور بیکری کے تندور میں لگتی ہوئی خمیری روٹیوں اور پیزا کی مہک میں مگن ہوتا تو یکدم میرے ذہن میں ایک چنگاری بھڑک اٹھتی کہ غارِ حرا میں ایک رات.. تو میرا بدن سُن ہو جاتا.. کہ نہیں.. یہ میں نے کیوں اور کیسے سوچ لیا تھا.. نہیں.. میمونہ کسی سیب یا آڑو کی شوخ رنگت کو میرے سامنے کر کے کہتی "یہ خرید لیں؟" تو اس کے گمان میں بھی نہ ہوتا کہ یہ شخص اس لمحے ڈر کی ایک ناقابل بیان حالت میں مبتلا ہے...

جدہ میں کہیں بھی.... سٹاربک میں کڑوی کافی سڑکتے.. "جرواز" میں کسی بہت مہنگے پین کو محبت سے تکتے.. یا کمپاؤنڈ کے سوئمنگ پول کے کنارے اس سے پیشتر کہ وہ روسی مچھلی اُس میں تیرنے لگے.. ناشتے کے بعد پہلا سگریٹ پیتے ابھی میں ہشاش بشاش اور بے پروا ہوں اور ابھی میرے اندر اُس خیال سے ایک سراسیمگی پھیل جاتی ہے' ساون کی گھٹا کی طرح چھا جاتی ہے اور میں بے جان سا ہونے لگتا ہوں.

یہاں تک کہ صبح شیو بنانے کے لیے گالوں پر سفید جھاگ پوت رہا ہوں تو یکدم غار میں تن تنہا رات بسر کرنے کا خیال آ جاتا ہے اور وہ جھاگ بیٹھنے لگتی ہے' میں اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتا ہوں کہ یہ صورت.. تم.. ایک تاریک اتھاہ رات میں اُس غار میں جہاں.. میں جان گیا کہ یہ ہونے کا نہیں.. میں تو زندگی کے روزمرہ معمول کے معاملوں میں بھی خاصا ڈرپوک بندہ ہوں.. یہاں تک کہ کبھی بیگم کہیں چلی

جائے تو اپنے گھر میں بھی تنہا سو نہیں سکتا.. ساری رات کان لگا کر سنتا رہتا ہوں کہ پتہ نہیں صحن میں کوئی ہے.. ہر آہٹ پر دم نکلتا ہے ہر سرسراہٹ سراسیمہ کر دیتی ہے اور فجر کی اذان سنائی دیتی ہے تو دم ذرا بحال ہوتا ہے اور پھر بیگم کو فون کرتا ہوں کہ کہ پلیز..

تو میں اپنے گھر میں تنہا نہیں سو سکتا تو "اُن" کے گھر میں..

مکہ مکرمہ.. 60 کلومیٹر..

امانت ایک سعودی دیدہ شخص تھا. قونصلیٹ میں ایک عرصے سے ڈرائیوری کر رہا تھا اور محض ڈرائیور نہ تھا بلکہ ایک تجربہ کار دانش رکھتا تھا.. آس پاس کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا.. اُسے ابھی تک علم نہیں تھا کہ اُس کے برابر میں براجمان نائب قونصل کا جو اُبا ہے یا ایک فتور شدہ ابا ہے.. میں اُس کے لیے ایک اور زائر تھا جس نے غارِ حرا تک جانا تھا اور پھر رات کے کھانے تک واپس جدہ آنا تھا..

میں نے "سامانِ غارِ حرا" کی فہرست کو چیک کیا تو سب سامان موجود تھا.. دودھ اور منرل واٹر کے بارے میں سوچ رکھا تھا کہ جبل نور کے دامن میں جو سٹور ہیں وہاں سے تازہ اور خنک خرید لوں گا.. لیکن ٹارچ بھول آیا تھا..

غاروں کے لیے ٹارچ تو بہت ضروری آئٹم ہے..

"امانت.. راستے میں کسی ایسے مقام پر رُکنا جہاں سے ایک ٹارچ خرید سکوں.."

"ٹارچ کیا کریں گے صاحب.. آپ تاریکی ہونے سے پیشتر اُتر آئیں گے انشاء اللہ.."

"کیا پتہ کچھ دیر ہو جائے.."

ان راستوں کے کناروں پر آبادیاں بہت کم ہیں.. جہاں کہیں زائرین کے قافلے تازہ دم ہونے کے لیے رُکتے ہیں وہاں ریستوران کے علاوہ ایک آدھ سٹور بھی ہوتا ہے تو امانت ایک ایسے ہی مقام کے قریب ہوتے ہوئے آہستہ ہوا اور کار کو شاہراہ سے اُتار کر ایک شوروم کے سامنے جا رُکا..

"یہاں سے ٹارچ مل جائے گی؟"

"افغان لوگوں کا شوروم ہے صاحب.. یہ بہت کچھ رکھتے ہیں.."

افغانیوں کے وسیع شوروم میں ہر سو قالین اور غالیچے بچھے تھے اور دیواروں کو بھی ڈھانپتے تھے.. پر وہاں ٹارچ نام کی کوئی شے مہیا نہ تھی..

وہاں سے رخصت ہوئے تو تھوڑی دیر بعد ایک سپر سٹور دکھائی دیا..

اس سپر سٹور میں جو کچھ نمائش پر تھا اور بہت کچھ تھا لیکن اس بہت کچھ میں ہمیں ٹارچ دکھائی نہ دی.. ٹارچ وہاں کہیں تھی ضرور لیکن سٹور میں کام کرنے والے افریقی اور مصری سیلزمینوں کو میں یہ سمجھانے

سے قاصر رہا کہ مجھے کیا شے درکار ہے.. وہ کبھی کوئی کھلونا میرے سامنے رکھ دیتے اور کبھی موبائل فون پیش کر دیتے کہ یہ چاہیے..

"صاحب آپ فکر نہ کریں.. مکہ پہنچیں گے تو وہاں ٹارچ مل جائے گی.."

"مکہ میں تو مل ہی جائے گی امانت.. کہ وہیں سے تو ساری ٹارچوں کو روشنی ملی تھی ورنہ پہلے تو اُن کے سیل گیلے سیلے ہو کر بیکار ہو چکے تھے.."

امانت نے صرف "جی ہاں" کہا اور ڈرائیونگ میں مصروف ہو گیا.. اس کے مصروف ہونے سے پیشتر ہی میں شرمندہ ہو گیا کہ یہ فقرہ میں نے کیوں کہا کہ وہیں سے تو ساری ٹارچوں کو روشنی ملی تھی.. اس لیے کہ یہ میرے دل سے نہ نکلا تھا.. میں نے صرف لفظوں کی شعبدہ بازی کی خاطر ٹارچ اور روشنی اور مکہ کو جوڑ کر امانت پر اپنی عقیدت کا رعب جمایا تھا.. میرے ساتھ یہ کبھی کبھار ہو جاتا تھا اور پھر میں شرمندہ ہو جاتا تھا..

میں نے اپنے آپ سے پھر وعدہ کیا کہ آئندہ احتیاط کروں گا بات جو دل سے نکلے گی صرف اُسے بیان کروں گا..

شاہراہ کے اوپر جو حل نما کمانیں آپس میں جڑتی تھیں اور اُن پر ایک قرآن پاک کی شباہت آرام کرتی تھی ہم اُن کے نیچے سے گزر کر جب کچھ دیر سفر کر گزرے تو مکہ نظر آنے لگا..

دوپہر تو ڈھل چکی تھی لیکن دھوپ کا روشن نکھار ابھی زوال پذیر نہ ہوا تھا.. پہاڑیوں کے درمیان.. اور اُن کی ڈھلوانوں پر قدیم طرز کے کہنہ مکان آپس میں جڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے..

"امانت.." میں نے صراحیوں والے چوک کو قریب ہوتے دیکھ کر کہا "آپ تو مکہ میں داخل ہو رہے ہو.. جبل نور تو شہر کے باہر ہے.. کدھر جا رہے ہو؟"

"صاحب ظہر کی اذان ہونے کو ہے.. تو نماز کدھر پڑھیں گے.."

"پتہ نہیں.. جبل نور کے دامن میں میں نے ایک مسجد دیکھی تھی وہاں پڑھ لیں گے.."

امانت کے چہرے پر ناپسندیدگی سی آئی.. "صاحب اگر آپ اجازت دیں تو نماز خانہ کعبہ میں پڑھ لیں.."

اب میں کیسے انکار کر سکتا تھا.. پھر بھی میں نے خفیف سا احتجاج کیا "دھوپ ڈھلتی جا رہی ہے.. دیر ہوتی جا رہی ہے.. کہیں زیادہ دیر نہ ہو جائے.."

"صاحب ابھی بہت ٹائم ہے.." اس نے صرف اتنا کہا اور مجھے ناپسندیدگی کے علاوہ شک

بھری نظروں سے نوازا کہ یہ کیسا بھلا مانس ہے کہ خانہ کعبہ میں نماز پڑھنے سے کترا رہا ہے.. کہ کہیں دیر نہ ہو جائے..

نماز کے دوران اگرچہ میں نے سیاہ غلاف پر اپنی آنکھیں تا دیر رکھیں.. ہر خیال غار کو دل سے نکال دیا. میری آنکھیں اُس کی سنہری خطاطی پر سیاہ تتلیوں کی مانند پھڑپھڑاتی رہیں اور اس کے باوجود ہمہ وقت غلاف پر جو دھوپ دھیرے دھیرے ڈھلتی تھی اُس کی تشویش میرے اندر ڈھلتی رہی. کہ کہیں دیر نہ ہو جائے.. اور دل سے اپنے اُس دل سے دعا مانگتا رہا جو کوئی جواز مہیا نہیں کرتا' کسی بھی منطقی بحث میں شامل ہونے سے انکاری ہو جاتا ہے تو اُسی دل سے یعنی صدق دل سے دعا کرتا رہا کہ اے مالک اوّل تو یہ کہ میں اس ناتوانی کے باوجود جبل نور کی چوٹی پر پہنچ جاؤں.. اور اگر وہاں پہنچ جاؤں تو غارِ حرا کے صحن میں زیادہ لوگ منتظر نہ ہوں. مجھے غار کے اندر داخل ہونے کا موقع مل جائے.. چند سجدے کرنے کا وقت نصیب میں آ جائے.. پوری شب گزارنے کی درخواست پیش نہیں کرتا.. ویسے گر تو چاہے.. یہی دعا کرتا رہا..

حرم میں داخل ہونے سے پیشتر ہم نے یہ طے کر لیا تھا کہ ہم جہاں کہیں بھی نماز ادا کریں نماز کے بعد امانت فوری طور پر بازارِ مکّہ کا رُخ کرے گا وہاں سے ٹارچ خریدے گا اور میں باب عبدالعزیز کے سامنے اُسی گھڑیال کے قریب اُس کی واپسی کا انتظار کروں گا..

یہ گھڑیال وہاں ایستادہ نہ ہوتا تو ہزاروں لوگ بہت مخجل ہوتے.. کہ باہم ملاقات کا یہی ایک واضح مقام حرم کے باہر کے صحن میں نمایاں تھا..

اب میں وہاں کھڑا امانت کا انتظار کرتا ہوں..

اور یہ انتظار طول کھینچتا چلا گیا..

اتنی دیر ہوگئی کہ میں امانت کی شکل بھولنے لگا..

بلکہ جوں جوں دھوپ کم ہو رہی تھی توں توں امانت کی شباہت بھی کم ہونے لگی..

اتنی دیر کا کوئی جواز نہ تھا..

اتنی دیر میں ایک معمولی سی ٹارچ تو کیا مکّہ میں ایک سرچ لائٹ خرید کی جا سکتی تھی..

میرا تھیلا بھی کار کی اگلی نشست پر رکھا تھا.. اور اگر میں خود مختار ہو کر جبل نور کا راستہ اختیار بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا تھا..

اور میری بے چینی اور سراسیمگی کا سبب یہ بھی تھا کہ مجھے اگلے ایک دو روز میں جدہ چھوڑ دینا تھا اور اگر آج یہ گاڑی چھوٹ جاتی تھی تو [illegible] کرتے پلیٹ فارم پر کھڑے رہ جانا تھا..

امانت نے خیانت کر دی تھی..

بالآخر اتنی دیر ہوگئی کہ کعبہ کے در و بام بھی چھاؤں میں جانے لگے تب امانت نمودار ہوا اور نہایت شانت چہرے کے ساتھ اور قریب آ کر کہنے لگا "میں اس چینی ساخت کی ٹارچ کی تلاش میں تھا ملی نہیں تھی.. بہت اچھی روشنی دیتی ہے صاحب.. اور سستی بھی ہے.. پھر ایک پاکستانی دوست نے جانے کے لیے ٹھہرا لیا.. ابھی بہت ٹائم ہے صاحب.."

غصہ یوں بھی حرام ہے.. اور حرم کے عین سامنے تو بہت حرام ہے اس لیے میں نے ضبط کا بے مثال مظاہرہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا "ہاں ابھی بہت ٹائم ہے.. اور یہ چینی ٹارچ بھی لاجواب ہے.."

اگرچہ یہ امانت بہت برسوں سے ادھر تھا لیکن مکّہ سے جبل نور جانے والے راستے سے آگاہ نہیں تھا.. اور اُدھر دھوپ تھی کہ ڈھلتی جاتی تھی..

وہ کبھی کسی روشن سٹور کے اندر جا کر جبل نور کی جانب جانے والے راستے کے بارے میں معلومات حاصل کرتا اور کبھی کسی راہ گیر کو روک کر سوال جواب کرنے لگتا.. نہ مجھے اُس کا سوال سمجھ میں آتا تھا اور نہ راہ گیر کا جواب' مجھے صرف یہی سمجھ میں آتا تھا کہ دھوپ ڈھل رہی ہے.. دیر ہو رہی ہے اور میں ایک لاچار شخص کی مانند تھیلے کو سینے سے لگائے اُس کو آتا جاتا دیکھتا..

اس نے تو نہ دیکھا لیکن تین چار کلومیٹر کے بعد مجھے بائیں جانب جبل نور.. عمارتوں سے [illegible] کے دھوپ سے خالی ہوتے ہوئے آسمان میں نظر آ گیا..

”تپشِ شوق نے ہر ذرّے پہ اِک دل باندھا..
بیس کیمپ غارِ حرا..“

وہ جبلِ نظر آیا تو میں خوش نہ ہوا.. قدرے ہراساں ہوا کہ وہ بہت ہی بلند نظر آ رہا تھا.. اُس کی چوٹی پر پہنچنا جو عقاب کی ایک چونچ کی مانند اُس کی بلندی سے نکلتی تھی.. ممکن نظر نہ آتا تھا.. یہ ہر بلندی کا خاصا ہوتا ہے کہ وہ دور سے ناممکن ہی نظر آتی ہے..

شاہراہ میں سے جدا ہوتی ایک چھوٹی سڑک بائیں جانب چلی جا رہی تھی اور ہماری کار بھی اُس کے ساتھ ساتھ چلی گئی یہاں تک کہ جبلِ نور کے دامن میں جو چند دکانیں تھیں' سٹور اور گھر تھے وہاں پہنچ کر اس سڑک کا اختتام ہوا تو ہمارا سفر بھی اختتام کو پہنچ گیا..

بہت کم لوگ تھے.. نہ کوسٹر تھے اور نہ زائرین کی بسیں اور ویگنیں.. قدرے ویرانی کا نقشہ تھا.. دامن کے عین کنارے پر جو دکانیں تھیں وہ بند ہو رہی تھیں کہ ان میں زائرین کی دلچسپی اور عقیدت کے سامان تھے اور آخری زائر جنہوں نے آنا تھا آ چکے تھے اور اوپر جبلِ نور پر دوپہر کی دھوپ مدھم ہونے لگی تھی..

کار رکی.. اُس کا انجن خاموش ہوا تو عجیب سا سناٹا در آیا جس میں وہ ڈر تھا جو جدہ میں قدم رکھتے ہی میرے ساتھ ہو لیا تھا.. میں اس سناٹے اور ڈر میں مبہوت کار سے باہر آ گیا.. سر اٹھا کر جبلِ نور پر نگاہ کی.. اُس کا طلسم کسی کوہِ طور سے کم نہ تھا.. اُس پر دوپہر یوں ڈھل رہی تھی کہ دامن سے چوٹی تک جو بایاں حصہ تھا وہ تو ابھی روشن تھا.. جس حصے کا رُخ خانہ کعبہ کی جانب تھا اور دائیں جانب جو گھاٹیاں تھیں وہ چھاؤں میں جا چکی تھیں اور اوپر جانے والا راستہ بھی جہاں میں تھا وہاں سے چوٹی تک مکمل طور پر چھاؤں میں آ چکا تھا.. دھوپ اور چھاؤں نے جبلِ نور کو تقریباً درمیان میں سے دو حصوں میں بانٹ دیا تھا.. جہاں ابھی دھوپ ٹھہری ہوئی تھی وہاں جو چٹانیں اور پتھر تھے وہ زرد ہو رہے تھے اور چوٹی سے ذرا

نشیب میں جو ایک سوکھا ہوا درخت معلق تھا' نور کے اسی پہاڑ کا واحد مکین تھا بناوٹی لگتا تھا جیسے کسی نے جبل کی مکمل بیابانی کی یکسانیت کو رنگ دینے کے لیے اُسے وہاں سجا دیا ہو..

ہاں اُس کا طلسم کسی کوہِ طور سے کم نہ تھا.. اور کیسے ہوتا کہ دونوں بلندیوں پر کلام ہوا تھا.. سندیسہ آیا تھا.. اُس سے جبلِ نور کی دھوپ چھاؤں میں ایسی کشش تھی کہ اُس نے میرا ڈر زائل کر دیا اور مجھ میں ایک موسیٰ کا شوق بھر دیا کہ میں نے اس جبل پر چڑھنا ہے.. شنید ہے کہ اوپر وہ رہتا ہے تو وہاں پہنچ کر دیکھنا ہے کہ وہ ہے کہ نہیں..

ڈھل چکی دھوپ والے حصے میں چوٹی سے ذرا نیچے چند سفید ذرّے سے حرکت میں نظر آئے.. کچھ لوگ اترتے آ رہے تھے' واپس آ رہے تھے.. اس منظر نے مجھے حد درجہ طمانیت سے دوچار کیا.. یعنی وہاں تک آنا جانا لگا ہوا ہے.. بے شک یہ صرف آنا ہی آنا تھا.. نیچے سے اوپر کوئی بھی نہیں جا رہا تھا.. مجھے ایک اطلاع یہ بھی ملی تھی کہ ان دنوں غارِ حرا تک جانے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے تو یہ خدشہ بھی کہیں دل میں تھا اور اُن سفید دھیرے دھیرے حرکت کرتے اُترتے ذرّوں نے میری ڈھارس بندھا دی تھی... اوپر جایا جا سکتا تھا..

جہاں ہماری کار رکی تھی اور میں اُس کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنے طور کو تک رہا تھا اُس کے عین سامنے ایک مقامی پرویژن سٹور کے گدلے شیشوں کے پیچھے ایک نوجوان جمائیاں لیتا دکھائی دے رہا تھا.. غارِ حرا کے سامان کی فہرست میں جو منرل واٹر شامل تھا اُس کی دو ٹھنڈی بوتلیں میں نے اُس بیزار دکاندار سے خریدیں اور فریزر میں یخ ترین ایک لٹر کی سفید پلاسٹک کی ہینڈل والی جو بوتل تھی وہ نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دی.... میری انگلیوں کی پوروں میں اُس کی سفید خنکی دیر تک سنسناتی رہی..

منرل واٹر کی دو بوتلوں اور دودھ کی اس سرد سفید ایک لٹر کی بوتل کو جب میں نے تنقی تھیلے میں ڈالا تو وہ ان کے وزن سے بوجھل ہو کر لٹک گیا.. خاصا بھاری ہو گیا..

میں نے پھر جبلِ نور کے سائے میں آئے ہوئے حصے کو دیکھا اور وزن کم کرنے کی خاطر وہ چھوٹا تولیہ امانت کے سپرد کر دیا کہ اسے جدہ پہنچ کر میری بہو کے حوالے کر دینا اور کہنا کہ چڑھائی کا راستہ سائے میں آ چکا تھا اس لیے اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی اور وہ جو اُس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ انکل اس تولیے سے سر ڈھانپ لیجیے گا کہیں چڑھائی پر تیز دھوپ کے باعث سن سٹروک نہ ہو جائے اور انکل سن سٹروک سے تو بندہ مر جاتا ہے تو سائے کی وجہ سے اس کا امکان کم ہو چکا ہے..

امانت کی سمجھ میں نہ آیا کہ اگر ہم دونوں کچھ دیر بعد جدہ واپس جائیں گے تو یہ تولیہ میرے سپرد کیوں کیا جا رہا ہے..

میں نے ایک مرتبہ پھر سامانِ سفر کا حساب کیا.. تاریخ.. منرل واٹر.. دودھ تو موجود.. بقیہ اشیاء بھی ایک ایک کر کے دوبارہ چیک کیں.. البتہ ان سب کا وزن میرے اندازے سے کہیں زیادہ ہو گیا تھا.

میں نے تنگی تھیلے کے سوتی سٹریپس کو دونوں بازوؤں میں پرو دیا اور اُسے کمر پر بوجھ کر لیا.. وہ میری کمر پر ٹھنڈے سانس بھرتا تھا.. ایسے کہ اُس میں سٹور کردہ دودھ کی بوتل کی ٹھنڈک تنگی تھیلے کے کپڑے میں سے سرایت کر کے میری پشت پر ایک خنک تھپکی دینے لگی کہ شاباش اب ہمت کرو..

امانت نے دیکھا کہ میں نے رختِ سفر کمر پر بوجھ کر لیا ہے اور اُس سے کچھ لاتعلق سا ہو گیا ہوں اور ہاتھ ملا کر اُسے شکریہ ادا کرنے کے بعد خدا حافظ کہتا ہوں تو اُس نے کار کے بانٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر اُن ڈرائیوروں کے اطمینان کے ساتھ جن کی بیگمیں انہیں کسی شاپنگ مال میں ایک طویل عرصے کے لیے ترک کر رہی ہوتی ہیں اور وہ انتظار کی کوفت مٹانے کے لیے ایک سگریٹ سلگا لیتے ہیں اُس نے بھی ایک سگریٹ سلگا لیا..

وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ بیگم کچھ بے ایمان ہے.. ہو سکتا ہے واپس ہی نہ آئے..

”صاحب میں انتظار کرتا ہوں..“

”نہیں تم جاؤ امانت.. مجھے اوپر تک پہنچنے اور واپس آنے میں کم از کم تین چار گھنٹے لگیں گے.. تم جاؤ..“

”کوئی پروا نہیں جی.. میں انتظار کرتا ہوں..“

”نہیں.. مجھے نیچے اُتر کر یہاں سے رات کے کسی بھی پہر آسانی سے جدّہ کے لیے سواری مل جائے گی.. ہو سکتا ہے اوپر کوئی اور سبیل نکل آئے.. رات بسر کرنے کی.. مجھے ٹھہرا لیا جائے تو اس صورت میں تمہیں کیسے اطلاع کروں گا کہ تم جاؤ میری رہائش کا بندوبست کر دیا گیا ہے.. اس لیے تم جاؤ..“

وہ تامل کر رہا تھا.. ”صاحب نے تو کہا تھا کہ...“

”صاحب کے ابا جو تمہیں کہتے ہیں کہ تم جاؤ“

وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوا..

”دیکھو میں ذمہ لیتا ہوں کہ تم خالی ہاتھ واپس گئے تو صاحب ناراض نہیں ہوگا.. اب تم میرے سامنے یہاں سے کار موڑ کر واپس شاہراہ تک جاؤ گے تب میں جبلِ نور پر پہلا قدم رکھوں گا..“

”جی..“

یہ ”جی“ کہہ کر بھی وہ کھڑا رہا.. ڈھلمل یقین میں رہا کہ جاؤں یا نہ جاؤں اور پھر شاید اُس نے میری خشمگیں نگاہوں سے اندازہ لگا لیا کہ اگر نہیں جاؤں گا تو صاحب کا یہ ابا بھی ناراض نہیں ہوگا.. مجھے

ایک جھانپڑ رسید کر دے گا..

”چلا جاؤں گا صاحب.. آپ جاؤ..“

”پہلے تم جاؤ.. جاؤ..“

اُس نے ناچار ہو کر تعمیل کر دی..

سلوق کی کار امانت کے ہاتھوں سے سٹارٹ ہو کر ذرا پیچھے ہوئی اور پھر ایک نیم دائرہ بنا کر گھومی اور واپس ہو گئی.. میں نے اُس پر تب تک نگاہ رکھی جب تک وہ مرکزی شاہراہ کے قریب پہنچ کر اُس میں شامل ہونے سے پیشتر اُس کی عقبی روشنیاں بریک لگاتے ہوئے یکدم سرخ نہ ہو گئیں اور جب تک جدّہ کی جانب مڑتے ہوئے وہ بجھ نہ گئیں..

''غارِ حرا میں ایک رات''

کار کی کشتی واپس جا چکی تھی.. واپسی کے راستے مسدود ہو چکے تھے اور اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ آگے جایا جائے.. اور آگے جبل نور تھا. جس پر سائے طویل ہو رہے تھے.. دامن کی دکانوں سے آگے ایک ہوگی پکی سڑک اوپر اٹھتی بلند ہوتی تھی..... کہیں وہ اُدھڑ جاتی تھی.. کہیں سیمنٹ شدہ کچھ سے پاؤں میں آتے تھے اور کہیں سنگریزے.. چھوٹے پتھر اور روڑے.. میں آہستہ آہستہ سانس سنبھالتا چڑھتا جاتا تھا.. اس راستے کے آس پاس دو چار گھر.. کچھ بے آباد سے مکان.. جہاں تک ممکن تھا انسان نے اپنی رہائش کے سامان کر رکھے تھے.. ایک مختصر سفید رنگ کی مسجد.. کچھ دکانیں جو بند ہو چکی تھیں؛ جو دن کے وقت اوپر جاتے ہوئے زائرین کے ہجوم کی پیاس بجھانے کا کاروبار کرتی تھیں.. چند خالی تھڑے.. کچھ عارضی چھپر جن کے نیچے مشروبات کے خالی کریٹ پڑے تھے..

یہ تو میں نے پہلے قدم سے ہی طے کر لیا تھا کہ میں بہت دھیرج اور اطمینان سے آہستہ آہستہ چڑھوں گا.. لیکن میں اس طے شدہ آہستگی سے بھی کہیں آہستہ رک سیک کے بوجھ سے ہو رہا تھا.. جو پچھلی بار میری کمر پر نہیں تھا.. یہاں تک کہ جوس کے کارٹن اور منرل واٹر بھی نمیر نے اٹھا رکھے تھے.. اس بار یہ آسانی میسر نہ تھی تو بہت آہستہ.. آہستہ..

جہاں آبادی کا اختتام ہو جاتا تھا. عمارتیں آس پاس کی ختم ہو جاتی تھیں وہاں جو آخری بند دکان تھی.. اور اُس سے آگے بڑے بڑے پتھروں کا آغاز ہو جاتا تھا وہاں اُس بند دکان کے تھڑے پر تین افریقی نوجوان جو ہو سکتا ہے سعودی ہوں خوش گپیوں میں مصروف تھے وہ مجھے دیکھ کر چپ ہو گئے.. میں ایک نہایت شرمندہ سی مسکراہٹ کے ساتھ ان سے ہم کلام ہوا اور سلام کیا کیونکہ وہ چپ ہی اس لیے ہوئے تھے کہ انہیں توقع ہی نہ تھی کہ شام ڈھلے ایک بوڑھا شخص بالکل اکیلا اوپر جا رہا ہوگا.. اور مسکرا بھی رہا ہوگا.. انہوں نے میرے سلام شوق کا کچھ کا خاص رغبت سے جواب نہ دیا اور پھر سے ایک دوسرے کی جانب متوجہ ہو کر شاید میرے ہی بارے میں کوئی بات کرتے مجھے نظر انداز کرتے ہوئے ہنسنے لگے..

ان تین افریقی نوجوانوں کے بعد.. جس تھڑے پر براجمان وہ اس ڈھلتی دوپہر میں.. جبل نور جو ان کا گھر تھا اُس سے غافل.. خوش گپیوں میں مصروف تھے تو اُس آخری انسانی تعمیر کے بعد.. اور یاد رہے کہ یہاں تک میں آسانی سے چہل قدمی کرتا نہ آیا تھا بلکہ چار پانچ بار رک کر سانس درست کرتا آیا تھا اور اپنے قیمتی منرل واٹر کے چند گھونٹ بھر چکا تھا تو اس کے بعد یکدم منظر وسیع ہو جاتا تھا.. کوئی رکاوٹ نظر کو روکتی نہ تھی.. بس آپ ہوتے ہیں اور جبل نور ہوتا ہے.. ایک پتھریلا.. بے نشان.. سنگریزوں سے بھرا بے نام بلند ہوتا راستہ ہوتا ہے.. بلکہ کئی راستے ہوتے ہیں.. جدھر آپ کا قدم آسانی سے اُٹھ جائے وہی راستہ ہو جاتا ہے..

جونہی آبادی کے آثار اختتام کو پہنچے.. جانے کہاں سے ایک دیسی ساخت کا شلوار قمیض میں ملبوس نہایت خوش و خرم سا نوجوان نمودار ہوا.. مجھے پہلے تو مسکراہٹوں سے نوازتا رہا اور پھر کہنے لگا ''چاچا اوپر جا رہے ہو؟''

''ہاں..'' چاچا نے بیزاری سے جواب دیا کہ یہاں یہ بھتیجا کہاں سے ٹپک پڑا..

''غار میں نفل ادا کرنے کے لیے جاتے ہو..''

''ہاں..''

''اس ٹیم کیوں جاتے ہو..''

''بس جاتا ہوں..'' میں نے جان چھڑانے کی غرض سے ذرا خوشگوار ہو کر کہا..

''مجھے اپنا سامان دے دو.. میں اُٹھا کر اوپر لے جاتا ہوں.. مدد کرتا ہوں..'' اُس نے پیشکش کی.

''نہیں.. شکریہ..''

''بوڑھے ہو.. اوپر نہیں پہنچو گے.. میں لے جاتا ہوں.. مدد کروں گا..''

''نہیں.. تم جاؤ.. میں پہنچ جاؤں گا..''

وہ مسکراتا ہوا بغیر دل کو آزار دیے چلا گیا.. شاید وہ کچھ ریال کمانا چاہتا تھا.. شاید وہ تہہ دل سے صرف انسانی ہمدردی کی خاطر میری مدد کرنا چاہتا تھا.. یہ میں نہیں جانتا تھا..

اوپر سے.. چند زائرین.. شاید ترک یا انڈونیشیا کے.. کچھ ایرانی اُترتے آ رہے تھے..

یہ وہی سفید ذرے تھے جنہیں میں نے دامن میں کھڑے ہو کر جبل نور میں حرکت کرتے دیکھا تھا.. وہ مجھ سے کچھ کہے بغیر.. تھکے ہوئے.. مجھ پر ایک نگاہ ڈالے بغیر میرے قریب سے گزر کر اُترنے لگے..

حج کے سفرنامے میں غارِ حرا کے باب میں میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ جبل نور پر چڑھنے کے لیے کوئی واضح اور باقاعدہ راستہ نہیں ہے.. یا تو آپ دوسرے لوگوں کے قدموں پر قدم دھرتے جاتے ہیں یا پھر اپنی ہمت کے مطابق اپنا راستہ خود بناتے ہیں.. آپ زگ زیگ طریقے کو بھی بروئے کار لا سکتے ہیں اور اگر توانائی وافر ہے تو بڑے بڑے پتھروں پر چڑھ کر سفر کی مدت میں مناسب کمی کر سکتے ہیں. البتہ ایک سہولت دور سے نظر آتی ہے.. خدا کے کسی نیک بندے نے خاصا تردد کر کے کہیں کہیں پتھروں اور چٹانوں پر تیر کے نشان پینٹ کر دیے ہیں کہ اب آپ آ ہی گئے ہیں تو براہ کرم ان نشانوں کے مطابق راستہ اختیار کر لیجیے.. سہولت رہے گی..

میں انہی نشانوں کو نظر میں رکھتا اُن کی ہدایت پر عمل کرتا اوپر جا رہا تھا.. اور ہر دو چار قدم کے بعد ٹھہر کر کسی چٹان کا سہارا لے کر نیچے دیکھتا کہ میں کتنی بلندی تک آ چکا ہوں.. اور اُس سفید مسجد اور آخری مکانوں کے مختصر ہونے سے اندازہ لگاتا کہ کچھ تو بلند ہو چکا ہوں اور پھر جب سر اُٹھا کر چوٹی کی جانب دیکھتا تو بس اللہ ہی اللہ.. رانجھن نے بھی کہاں جھوک جا آباد کی ہے کہ اگر ایک دریا کے پار ہوتی تو تیرتے ڈوبتے پہنچ ہی جاتے.. نہ ہی یہاں سے دکھائی دیتی تھی کہ پوشیدہ تھی ایک غار میں تھی اور نہ اس سے میں کسی کو پکار سکتا تھا کہ نال میرے کوئی چلے.. کہ آس پاس کوئی تھا ہی نہیں جسے پکارتا.. جبل نور دامن سے چوٹی تک ایک تنہا پہاڑ نہیں ہے بلکہ پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے جس کا بلند ترین حصہ جبل نور کہلاتا ہے.. حضورؐ کے زمانے میں اسے حرا کہتے تھے اور اس کی چوٹی میں چھپی ہوئی غار کو حرا کی غار کہا جاتا تھا.. پھر یہ نام حرا کا صرف غار کے لیے مختص ہو گیا اور پہاڑ کو جبل نور کہا جانے لگا.. دائیں جانب اس سلسلے کو کوئی اونچائی کم ہو کر کہیں نیچے اتر جاتی تھی..

تھی رُک سیک میں جو دودھ کا پلاسٹک کارٹن تھا اس کی ٹھنڈک میری کمر پر آئے ہوئے پسینے اور گرمی کے باعث زائل ہو چکی تھی اور اب اُس کے کونے اور اس کا وزن مجھے اذیت دے رہے تھے.. چلنے سے پلاسٹک کے بھاری کونے مجھے چوکے دیتے.. یہاں تک کہ ایک بار ذہن میں یہ بھی آیا کہ اسے نکال کر جتنا دودھ پی سکتا ہوں پی کر اسے یہیں کہیں لڑھکا دوں اور اس کے تکلیف دہ بوجھ سے نجات حاصل کر لوں..

یکدم مجھے رُکنا پڑا..

مجبوراً ٹھہرنا پڑا..

میں نے نزدیک ترین چٹان کی سختی پر اپنی مشقت کی سختی سے ناآشنا ہتھیلیوں کو رکھا اور سنبھلنے کی سعی کی..

میرے تن بدن میں ایک گھماؤ سا گھوم گیا تھا.. ایک چکر آیا.. ایک بگولا سا اُٹھا اور آنکھوں کے سامنے دھندیں یوں پھیلی کہ میں اُس چٹان کو فوراً نہ تھام لیتا تو یقیناً گر جاتا..

یہ کیا ہے؟.. میں نے شدید خوفزدگی کا شکار ہو کر اپنے آپ سے پوچھا.. ایسا پہلے تو کبھی نہ ہوا تھا.. کسی بھی بلندی پر شدید ناتواں حالت میں بھی میں یوں بے اختیار نہ ہوا تھا.. یہ کیا ہے؟

بلندی ہے.. تمہاری عمر ہے اور.. تمہاری حماقت ہے..

مجھے واقعی آج تک اس قسم کا بے جان کر دینے والا چکر نہیں آیا تھا.. بلکہ مجھے تو علم ہی نہ تھا کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ مجھے چکر آ گیا تو یہ کیسے آتا ہے.. اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے..

شاید یہ قدرت کی جانب سے ایک وارننگ تھی.. ایک اشارہ تھا کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں.. میں بہت دیر تک اُس چٹان کا سہارا لیے کھڑا رہا.. سنبھل تو میں گیا تھا لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ دو چار قدم کے بعد پھر سے چکر آ جائے اور آس پاس تھام لینے کو کوئی سہارا نہ ہو.. نیچے.. کہیں نشیب میں جو سفید مسجد اور دکانیں دکھائی دیتی تھیں اُن سے پرے جہاں کار پارک تھا' کہیں امانت واپس آ کر وہاں میرا منتظر تو نہیں.. اگر ہے تو یہیں سے لوٹ جاؤں.. ظاہر ہے وہ وہاں نہیں تھا..

میں دراصل عمر کے تنزل کے تناسب سے ہمت کے گراف کی لکیر کے بہت تیزی سے نیچے گرنے کے عمل سے ناآشنا تھا.. میں لاعلم تھا اس لیے کہ ان حقیقتوں کا علم تبھی ہوتا ہے جب آپ اس عمر تک پہنچتے ہیں... اور کسی ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوتے ہیں جس کا سامنا آپ نے دو چار ماہ پیشتر آسانی سے کر لیا تھا لیکن اب آپ اس کے سامنے لاچار ہو جاتے ہیں.. میں آج سے چھ سات ماہ قبل ہی تو یہاں آیا تھا.. اگرچہ تب بھی یہ ایک کٹھن سفر تھا' دشواری بہت تھی لیکن یہ طے ہو گیا تھا.. اگرچہ اس میں میرے دائیں بائیں آتے پاسے بکریوں کی مانند چڑھتی ترک' افغانی اور ایرانی خواتین کا بھی بہت ہاتھ تھا کہ انہیں دیکھ کر انسان شرمندہ ہو جاتا تھا اور اوپر پہنچنے کے لیے جان کو داؤ پر لگا دیتا تھا.. اور آج.. آس پاس کوئی بھی نہ تھا.. میں جبل نور کا تنہا مسافر تھا اور آس پاس بڑھتے ہوئے سائے تھے.. اور میں ان چھ سات ماہ میں بڑی تیزی سے جسے انگریزی میں کہتے ہیں کہ پہاڑی کے نیچے لڑھکتے جانا تو میں اس دوران لڑھک چکا تھا اور احساس ہی نہیں ہوا تھا.. جو کٹھنائیاں میں چھ سات ماہ پیشتر سہہ سکتا تھا آج انہیں سہنے کے قابل نہیں رہا تھا..

میں نے بہت سنجیدگی سے بہت ٹھنڈے دل سے غور کیا کہ اگر بدن کی یہی کیفیت رہی تو کیا لوٹ جانا مناسب نہ ہوگا.. ابھی تو فرش نگاہ میں تھا اور عرش کہیں بلندی پر فائز تھا.. میں نے سوچا چند قدم اور سہی.. اتنا تردد کر کے آیا ہوں.. اتنی تمنا لے کر آیا ہوں ایک دھچکا لگا ہے تو فرار کے راستے سوچنے لگا

ہوں.. تو ایک آخری کوشش تو کر دیکھوں.. جیسے کے ٹو کی چوٹی بالکل قریب پا کر ایک مکمل طور پر ڈھے چکا کوہ نورد ایک اور قدم بہر طور کوشش کر کے اٹھا لیتا ہے....

میں حوصلہ ہارنے کو تھا کہ ایک اپاہج فقیر نے مجھے حوصلہ دے دیا.. وہ ایک چٹان سے ٹیک لگائے دن بھر کی کمائی ریالوں' روپوں اور لیروں میں شمار کر رہا تھا اور جس نے اپنے ناکارہ اعضاء کو سمیٹ رکھا تھا اور اُس نے مجھے اپنے سامنے پایا تو بصد حیرت دیکھا.. اور پھر فوراً ہی اپنی حیرت پر قابو پا کر کسی ناشناسا بولی میں صدا لگائی اور جب میں نے سر ہلا کر لاعلمی کا اظہار کیا تو اس نے زبان کے ساتھ لہجہ بھی بدل لیا ''میڈھے سائیں.. صدقہ دو.. خیرات کرتے جاؤ.. کچھ دے کر جاؤ سائیں''

یعنی یہ اپاہج فقیر.. اگرچہ کسی ٹھیکیدار کے کارندے نے اسے کاندھوں پر لاد کر صبح سویرے یہاں پہنچایا تھا اور اسے پھر سے تھوڑی دیر میں نیچے مکّہ میں لے جایا جائے گا تو بے شک یہ پہنچایا گیا ہے لیکن پہنچ تو گیا ہے.. تو میرے تو ہاتھ پیر ہیں' مجھے تو اوپر پہنچنے پر دو جہان کی بھیک ملے گی تو چلو.. کچھ ہمت کرو..

دو چار صداؤں کے بعد اُس نے اپنا وقت مزید ضائع کرنا مناسب نہ جانا اور دن بھر کی دولت شماری میں پھر سے مشغول ہو گیا..

میں نے رُک سیک میں سے دودھ کی بوتل نکال کر ایک طویل گھونٹ بھرا جو نہایت ٹھنڈک والا تھا اور چڑھنے لگا..

سانس بحال کرتا.. اپنے آپ کو شاباش شاباش کہتا جبل نور پر چڑھتا گیا..

جیسا کہ میں نے دیکھا تھا.. اگر کوئی شخص خانہ کعبہ سے ادھر آنے والی شاہراہ پر کھڑے ہو کر اس کوہ پر نظر کرتا تو اُسے اس کی بلند ہوتی تنہائی میں.. ایک ناقابل یقین اونچائی سے اُترتے کچھ چیونٹے سے نظر آتے.. وہ ان سرکتے چیونٹوں پر کچھ دھیان نہ دیتا کہ یہ تو معمول تھا.. جبل نور سے اس کے جب سائے بڑھتے جاتے ہیں لوگ اُترتے ہی رہتے ہیں..

اور اہل مکّہ اس معمول کے عادی ہو چکے تھے..

لیکن اس معمول میں ایک شدید خلاف ورزی ہو رہی تھی.. وہ شخص دیکھتا کہ جبل نور کی بلندی پر ایک تنہا چیونٹا ہے جو دھیرے دھیرے سرک رہا ہے اور نیچے نہیں آ رہا بلکہ ہولے ہولے اوپر کی جانب رینگ رہا ہے.. وہ یقیناً حیرت میں چلا جاتا کہ یہ کس قسم کا چیونٹا ہے جو یہ نہیں جانتا کہ شام اُترنے کو ہے.. وہ تنہا سرکتا جاتا ہے اور اس کے اوپر پہنچنے تک تاریکی چھا جائے گی تو یہ واپس کیسے آئے گا.. وہ مزید حیرت میں چلا جاتا اگر اُسے اس تنہا چیونٹے کے عزائم معلوم ہو جاتے کہ یہ واپس آنے کی تمنا نہیں رکھتا'

رات وہیں ایک غار میں بسر کرنے کے ارادے سے رینگتا ہے..

ویسے میں چڑھتا تو جاتا تھا لیکن سراسیمگی کے عالم میں پھونک پھونک کر قدم دھرتا تھا کہ کہیں میں عمر کے تابع ہو کر چکرا نہ جاؤں.. لاچار نہ ہو جاؤں..

اور بالآخر وہ مقام آ ہی گیا جو جبل نور کے دامن سے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے یہی منزل ہو.. یہی آخری بلندی ہو اور وہاں پہنچ کر کھلتا ہے کہ نہیں.. ابھی تو منزل ماورا راست.. کاروانِ شوق کے اونٹ کی ٹانگیں سمیٹ کر اس کے بیٹھ جانے اور آپ کے اُترنے کا لمحہ ابھی نہیں آیا.. ابھی تو دائیں جانب اٹھتی ایک اور بلند مسافت درپیش ہے..

یہاں پہنچ کر البتہ منظر وسیع ہو جاتا ہے.. جبل نور کی دوسری جانب جو وادیاں ہیں وہ نظر آنے لگتی ہیں.. چھپّر.. لکڑی کے ٹوٹے پھوٹے بنچ اور سائبان جو دن کے وقت زائرین کو دھوپ سے بچاتے تھے اور ان کے سائے میں وہ مشروبات سے اپنے آپ کو تازہ دم کرتے تھے.. سب کے سب یکسر ویران پڑے تھے..

نہ دھوپ تھی اور نہ پیاسے زائرین.. بس ایک چیونٹا تھا.. اور اُس کے تھیلے میں پیاس بجھانے کے اپنے سامان تھے.. میں نے ایک ٹوٹے ہوئے بنچ پر اپنے آپ کو بمشکل قائم رکھ کر دودھ کا ایک اور طویل گھونٹ بھرا.. جہاں دن کے وقت ایک ہجوم ہوتا تھا وہاں تنہا بیٹھ کر جبل نور کی دوسری جانب جو وادیاں سائے میں جا چکی تھیں اُن پر نظر کی.. اس مقام سے دائیں ہاتھ پر سلسلۂ کوہ میں جو ایک ہموار سطح تھی اُسے حیرت سے دیکھا.. اور پہلی بار پر یقین ہوا کہ میں اوپر پہنچ جاؤں گا..

اوپر جانے کے لیے کھردری.. ناہموار اور مختلف شکلوں کی سیڑھیوں کی آسائش بہر طور موجود تھی.. باقاعدہ پہاڑی راستے کا خاتمہ ہو چکا تھا.. اس لیے مجھے یقین ہے کہ اب اوپر پہنچ جانا یقینی ہو چکا ہے..

دو چار سیڑھیاں اوپر گیا ہوں تو کاریگر حضرات کا دیدار ہو گیا.. وہ بھی اُس اپاہج گداگر کی مانند دن بھر کی کمائی سمیٹتے حساب کتاب کر رہے تھے.. وہی کاریگر حضرات جو مٹھی بھر سیمنٹ میں بوری بھر ریت ملا کر صرف ایک کچی پکی سیڑھی تیار کر کے اس کی گیلی سطح کو پچھلے کئی برسوں سے ایک جیسی سے تھپکتے چلے آتے ہیں اور صدا دیتے ہیں کہ یا حاجی صدقہ کرو.. خیرات کرو.. غارِ حرا تک جانے والی سیڑھیوں کی تعمیر کے لیے کچھ رقم عنایت کرو.. تمہاری رقم سے تعمیر کردہ یہ سیڑھی تمہیں جنت تک لے جائے گی.. اور یہ صدائیں وہ صرف اردو میں نہیں دیتے بلکہ ہفت زبانی کی حد کرتے ہیں اور زائر کی قومیت بھانپ کر ترکی.. فارسی.. سندھی.. پشتو اور پنجابی میں بھی دیتے ہیں..

ان کاریگر حضرات نے بھی مجھے شک کی نظروں سے دیکھا.. کہ جو اوپر گئے تھے وہ نیچے جا چکے

ہیں یا جا رہے ہیں تو یہ کس حساب میں اوپر چلا جاتا ہے.. ان میں سے صرف ایک نے بجھے سے دل سے صدا لگائی کہ حاجی صدقہ دو.. اور جب حاجی ہانپتا لرزتا اپنے تپتی تھیلے کے بوجھ سے جھکا جاتا قطعی متوجہ نہ ہوا تو وہ اپنی دن بھر کی آمدنی شمار کرنے میں محو سا ہو گیا..

اب تو چڑھائی آسان ہو گئی تھی..

پاؤں تلے سنگریزے نہ تھے.. راستے میں پتھر نہ تھے.. سیڑھیاں جیسی بھی تھیں اُن پر جو گر پھسلتے نہ تھے..

جبلِ نور میٹرہارن کی سوئس چوٹی کی مانند ایک عقاب کی چونچ کی مانند خم کھاتا ہوا اب دھوپ سے یکسر خالی ہو چکا تھا.. مکمل طور پر سائے میں آ چکا تھا اور یہ سائے اس کی بلندی سے اُتر کر وادیٔ مکہ کی بستیوں کے پہلے مکانوں اور راستوں پر بچھنے کو تھے..

میں ایک موڑ پر دم لینے کے لیے رُکا تو دائیں ہاتھ پر ایک پیالہ نما کھنڈر نظر آنے لگا..

جبلِ نور کی ایک گھاٹی میں یہ پہلی باقاعدہ انسانی تعمیر تھی.. اگرچہ کھنڈر ہو چکی تھی..

پچھلی بار ادھر سے گزرا تو یہی خیال آیا کہ شاید کسی زمانے میں یہاں کوئی سرائے ہو.. زائرین کے قیام کے لیے کوئی عمارت ہو جو ڈھے چکی ہے.. لیکن اس کی شکل ایک متروک شدہ تالاب کی مانند کیوں ہے.. پاکستان واپسی پر مطالعے میں قدرے وسعت ہوئی تو معلوم ہوا کہ دراصل یہ "خزانہ" تھا..

تُرک دور میں جبلِ نور پر دو "خزانے" تعمیر کیے گئے.. ایک یہ جو میرے دائیں ہاتھ پر کھنڈر ہو رہا تھا اور دوسرا وہ جو چوٹی کی دوسری جانب تقریباً اسی سطح پر تعمیر کیا گیا اور جبلِ نور پر چڑھتے ہوئے اگر آپ غور سے اُس جانب دیکھیں جہاں پس منظر میں مکہ ہے تو اُس کے آثار بھی دکھائی دے جاتے ہیں..

خزانے.. دو تالاب تھے..

ترکوں نے انہیں زائرین کی سہولت کے لیے تعمیر کیا اور ایسی ساخت میں کہ جب بھی بارش ہو ڈھلوانوں پر بہتا پانی ان میں جمع ہو جائے.. اور غارِ حرا تک پہنچنے کی جستجو میں تھکے ہارے اور پیاسے لوگ اس سے اپنی پیاس بجھا کر تازہ دم ہو سکیں.. ہمارے موجودہ معیاروں کے مطابق وہ پانی قدرے گدلا ہوتا ہوگا لیکن اُن زمانوں میں جب گورا.. جوس کے کارٹن اور منرل واٹر کی بوتلیں ابھی ایجاد نہیں ہوئی تھیں اور مشکیزوں سے یہاں تک پانی لانا ممکن ہی نہ تھا تو اُن زمانوں میں یہ گدلے پانی کیسی بڑی نعمت اور راحت ہوتے ہوں گے..

ایک "خزانہ" تو اُس راستے کے قریب تھا جو میں نے اختیار کر رکھا تھا لیکن دوسرا خزانہ میں

مخالف سمت میں پہاڑ کے دوسری جانب کیوں بنایا گیا تھا.. یقیناً اس لیے کہ ان دنوں ادھر سے بھی ایک راستہ چوٹی تک جاتا ہوگا..

یہ خزانے اب خشک پڑے تھے اور کھنڈر ہو چکے تھے..

ویسے تو پائپوں کے ذریعے بڑی آسانی سے اب پانی یہاں تک پہنچایا جا سکتا تھا لیکن اتنا تردد کون کرے.. اگرچہ چڑھائی کے دوران زائرین کو تازہ پانی ملنا شروع ہو جائے تو اُن کی تعداد میں اضافے کا خدشہ تھا اور یہ کسی صورت میں قابلِ قبول نہ تھا.. جبلِ نور کو اسی لیے ایک بڑا ڈسٹ بن بننے دیا گیا تھا.. اس کی صفائی اور ستھرائی کا کوئی انتظام نہ تھا تا کہ زائرین کی حوصلہ شکنی کی جا سکے اور وہ شرک سے باز آ جائیں..

ان خشک ہو چکے ترک "خزانے" کو دیکھ کر میں پھر سے پیاسا ہو گیا حالانکہ دھوپ ڈھل چکی تھی.. ایک چوڑے پتھر پر بیٹھ کر میں نے منرل واٹر کی بوتل سے منہ لگا کر دو گھونٹ بھرے اور پھر بوتل کے نصف ہو جانے پر کچھ فکرمند ہوا کہ میرے پاس صرف ایک اور بوتل باقی تھی.. یعنی پانی کی سپلائی کم ہوتی جا رہی تھی..

نیچے سے ایک شخص شلوار قمیض میں ملبوس خاصا تنومند اپنی پشت پر ایک بہت بڑا کریٹ لادے جھکا ہوا سیڑھیوں پر چڑھتا آ رہا تھا..

وہ مجھے دیکھ کر یا سانس درست کرنے کی خاطر میرے قریب آ کر ٹھہر گیا.. "صاحب اوپر جا رہے ہو؟"

"جی.."

"واپسی کے لیے آپ کے پاس ٹارچ ہے؟"

"جی ہاں.."

"اندھیرے میں اُترنا بہت مشکل ہوتا ہے.. بوڑھے لوگ گر جاتے ہیں.. زخمی ہو جاتے ہیں.. آپ یہاں بیٹھے نہ رہو جلدی سے اوپر پہنچو اور پھر نفل پڑھو اور نیچے آ جاؤ.. ابھی تھوڑا روشنی ہوگا.."

"بالکل.."

میں طویل گفتگو سے اس لیے بھی پرہیز کر رہا تھا کہ میرا سانس ساتھ نہیں دے رہا تھا.. اس شخص کا نام اشرف تھا اور وہ جبلِ نور کی چوٹی پر جو چھپّر ہوٹل تھا وہاں تک جوس اور بوتلوں کا کریٹ لے جا رہا تھا.. شاید وہ اس چھپّر کے کاروبار میں شریک تھا یا محض مزدوری کر رہا تھا لیکن یہ طے تھا کہ وہ اس مقام

سے پوری طرح آگاہ ہے.. اس سے کچھ معلومات حاصل ہو سکتی تھیں.. میں نے اُسے اپنے بارے میں کچھ بتایا.. بس یہی کہ پاکستانی ہوں پچھلی بار آیا تھا تو غار میں جگہ نہ ملی تھی اب پھر قسمت آزمانے کو جا رہا ہوں..

''اب تو وہاں کوئی نہ ہوگا.. شاید دو چار زائرین ہوں.. شام کے بعد کوئی نہیں آتا..''

''اشرف.. آپ رات اوپر ہی گزارتے ہو یا نیچے مکہ میں چلے جاتے ہو..''

''بس جی گزارہ ہو جاتا ہے..'' اُس نے ایک نیوٹرل سا جواب دیا.. کچھ اقرار نہ کیا.. ایسی جگہوں پر پائے جانے والے غیر سعودی ہمیشہ احتیاط کرتے ہیں' اقرار نہیں کرتے کہ اکثر غیر قانونی طور پر مقیم ہوتے ہیں..

''اگر اوپر رات بسر کرنی پڑ جائے تو پھر کیا کرتے ہو..''

''اوّل تو نیچے چلا جاتا ہوں.. اگر دیر ہو جائے تو چوٹی سے ذرا پہلے دائیں ہاتھ پر پہاڑ کے کنارے ایک ہموار جگہ ہے تھوڑی سی.. وہاں رات کو ہوا لگتی ہے تو وہاں سو جاتا ہوں..''

''کوئی خطرہ تو نہیں ہوتا؟''

''نہیں صاحب..'' اُس نے بدن کو حرکت دے کر اپنے بوجھ کا دباؤ بدلا اور پھر کچھ اور بغیر سیڑھیوں پر چڑھنے لگا..

کوئی خطرہ نہیں.. میں نے خوش ہو کر اپنے آپ سے کہا.. چلے چلو.. رات بھی بسر ہو سکتی ہے.. غار میں نہ سہی.. جبل نور کی چوٹی کے قریب جو ہموار جگہ ہے وہاں.. جہاں ہوا بھی لگتی ہے.. لیکن تنہا نہیں.. اگر کوئی اور وہاں ہوا تو.. حضورؐ جب غار سے باہر آئے تھے تو اُنہیں حرا کے پہاڑ کے سامنے جو پہاڑ تھے اُن پر ایک شخص نظر آیا تھا جو اُن پر محیط تھا جو عرش تک جاتا تھا اور حضورؐ ڈر گئے کہ یہ کون ہے.. اور وہ اپنا رُخ دوسری جانب کرتے تو وہ شخص اُنہیں وہاں نظر آنے لگتا.. ورقہ بن نوفل نے اُنہیں آگاہ کیا کہ وہ جبریل تھے.. تو ایسے مقام پر جہاں سے وہ پہاڑ نظر آتے ہوں.. سامنے ہوں جہاں جبریل نمودار ہوتے تھے تو وہاں تنہا تو رات نہیں گزاری جا سکتی..

میں بھی اُٹھا.. اپنا مختصر بوجھ جو میرے لیے ایک بڑے کریٹ سے کم نہ تھا کمر پر لادا اور سیڑھیاں طے کرنے لگا..

میرے سانس درست کرنے کے وقفوں میں اضافہ ہو رہا تھا.. تھکاوٹ کے ساتھ کسی حد تک بلندی کا بھی کچھ اثر تھا.. اور شام ہو رہی تھی..

[illegible] وہاں کچھ قیام کر کے فوری طور پر تاریخ کی روشنی میں جبل نور

سے اترنے کی سکت رکھتا ہوں.. مجھے پریشانی لاحق تھی..

آخری کاریگر آ گیا..

زائرین کے مقدس جذبات کو بھڑکا کر انہیں ثواب کے باغ دکھا کر رقم بٹورنے والا آخری کاریگر.. اس نے اب ریت اور مٹھی بھر سیمنٹ کی اُس مدت سے زیرِ تعمیر سیڑھی پر پانی چھڑکنا اور تیسی سے اسے تھپکتے جانے کا عمل ترک کر دیا تھا.. جانے وہ کس کا منتظر تھا.. شاید اوپر کچھ زائرین ابھی موجود تھے اور اسے جانے والوں کا اور واپس آنے والوں کا پورا پورا حساب تھا تو وہ اُن کی واپسی کا منتظر تھا.. وہ اپنی سیڑھی سے ہٹ کر ایک پتھر پر براجمان جبل نور پر کم ہوتی روشنی میں نہایت امن اور شانتی کی کیفیت میں سگریٹ کے سُوٹے لگا رہا تھا.. میرا سانس درست کرنے کا اگلا وقفہ اُس کے قریب آیا.. جانے کیوں وہ مجھ سے لاتعلق رہا.. مجھے دیکھ کر کسی حیرت کا اظہار نہ کیا اور اطمینان سے اپنے سگریٹ سے لطف اندوز ہوتا رہا جیسے یہ میرا معمول ہو کہ میں وہاں سے سرِشام گزرتا ہی رہتا تھا..

میں نے سلام دعا کے بعد نہایت معصومیت سے اُس کے پیشے کے بارے میں دریافت کرنا شروع کر دیا.. ''بھائی آپ کب سے یہ سیڑھی بنا رہے ہو؟''

''آج سویرے شروع کی تھی.. بس چند دنوں کی بات ہے اوپر چوٹی تک لے جاؤں گا.. انشاء اللہ.. آپ کچھ صدقہ خیرات کرو ثواب ہوگا.. جنت میں سیڑھی بنے گی اللہ کے فضل سے..''

''مجھے یاد پڑتا ہے کہ'' اور مجھے واقعی یاد پڑتا تھا ''کہ سات ماہ قبل جب میں حج کے دوران یہاں تک آیا تھا تو آپ اسی سیڑھی کو تیسی سے تھپک رہے تھے..''

مسلسل کش لگاتا سیڑھی والا کاریگر چوکنا ہو گیا ''نہیں صاحب..''

''ہاں بھئی.. میں نے تمہیں یہیں دیکھا تھا..''

اُس نے فوراً ہتھیار ڈال دیے ''مہنگا کام ہے صاحب.. روزانہ ریت کی بوری اوپر لاتے ہیں پانی ڈھوتے ہیں.. دھوپ میں بیٹھتے ہیں.. کیا کریں غریب لوگ ہیں.. بال بچہ بہت ہے..''

''اچھا یہ بتاؤ کہ سب سے زیادہ صدقہ خیرات کون لوگ کرتے ہیں؟''

''کیوں پوچھتے ہو؟''

''آپ پر ترس آتا ہے کہ اتنی محنت کرتے ہو تو کیا ملتا ہے.. ویسے ہی پوچھ رہا ہوں..''

''صاحب پاکستانی لوگ بہت جذبات رکھتا ہے.. جیب خالی کر دیتا ہے.. افریقی کچھ نہیں دیتا الٹا ہے.. ترک بھی کچھ نہ کچھ دے جاتا ہے.. پر جو ایرانی ہوتا ہے وہ رقم نہیں نکالتا.. کھانے پینے کا چیز دے گا.. بسکٹ کولا دے گا.. دعاؤں کی کتاب دے گا لیکن پیسہ کم دے گا..''

اب اُس کی جھجک ختم ہو گئی تھی اور وہ اپنا دُکھ درد بانٹنے میں تامل نہیں کر رہا تھا..

"لیکن بھائی ایک بات بتاؤ.. نیچے سے جو لوگ اوپر آتے ہیں تو جو پہلا شخص سیڑھی [illegible] سامنے آتا ہے اُس پر نوٹ نچھاور کر دیتے ہیں.. پھر دوسرا نظر آتا ہے تو اُسے بھی کچھ دے دیتے ہیں.. لیکن جب وہ یہاں پہنچتے ہیں تو اُن کی جیبیں خالی ہو چکی ہیں اور وہ جنت کے بلند ترین درجات تک جانے والی سیڑھیوں کے لیے صدقہ و خیرات کر چکے ہوتے ہیں تو تمہارے حصے میں کیا آتا ہے.. تم جو یہاں آخر میں دھونی رمائے بیٹھے ہو.. نیچے جا کر دھندا کیوں نہیں کرتے؟"

اس سوال پر سیڑھی والے کے دل کے پھپھولے جل اُٹھے.. اُس نے مجھے ایک ہمدرد دوست کی صورت میں دیکھا اور ایک المناک سی شکل بنا کر اپنا دکھ بیان کرنے لگا "صاحب کیا بتائیں.. مجبوری کی بات ہے.. اُدھر نیچے پہلے سیڑھی والے کو جتنی آمدنی روزانہ ہوتی ہے ہمیں مہینہ بھر نہیں ہوتی.. ہم تک آتے آتے حاجی لوگ ثواب سے بیزار ہو چکے ہوتے ہیں اور اُن میں سے جو بہت نیک لوگ ہوتے ہیں وہ کچھ صدقہ دے جاتے ہیں.."

"تو نیچے جا کر کیوں نہیں بیٹھ جاتے؟"

"نہیں بیٹھ سکتے صاحب.. ہم لوگ ہندوستان سے آئے ہیں.. نیچے جو لوگ قابض ہیں سندھ و پاکستان کے ہیں.. اور بڑے لڑاکے ہیں.. ہم مسکینوں کو نیچے دھندا نہیں کرنے دیتے مار پیٹ پر اُتر آتے ہیں.. جو اچھا والا پہلا جگہ ہوتا ہے وہاں بیٹھتے ہیں اور اپنا فقیر بھی اُدھر لا کر بٹھاتے ہیں.. بہت دولت مند لوگ ہیں صاحب ہم اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے.."

"کبھی اوپر غارِ حرا میں بھی گئے ہو؟"

"گیا تھا صاحب.. اُدھر حاضری دیا تھا دو تین برس پہلے جب اِدھر آیا تھا.. اُدھر کیا کریں گے.. روزی تو اِدھر ہے.."

تب اُسے یکدم خیال آیا کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ گیا ہے اور اپنے پیشے سے غفلت برت رہا ہے.. اُس نے سگریٹ کا آخری کش لگا کر اُسے جبلِ نور کی گھاٹی میں پھینک دیا اور ہاتھ آگے کر کے بولا "اب تو کچھ صدقہ خیرات کرتے جاؤ.. جنت میں سیڑھی بنے گا.."

چونکہ میں نے طے کر رکھا تھا کہ جنت میں اگر بنی بنائی سیڑھی میسر ہو گئی تو سبحان اللہ ورنہ اپنے خرچے سے قطعی طور پر نہیں بنواؤں گا اس لیے میں نے کچھ جواب نہ دیا اور تنتی رُک سیک اپنی پشت پر جما کر اٹھ کھڑا ہوا..

میں یوں جنت کے حصول کی خاطر دو چار ریال بھی اپنی جیب میں سے باہر کرنے سے قاصر

رہا تو اُس نے مایوس ہو کر ایک اور سگریٹ سلگایا اور سُوٹے لگانے لگا.. کہ ان تلوں میں تیل نہیں.. میں اُٹھا تو احساس ہوا کہ میں نے ناحق اس سوال جواب میں وقت کا زیاں کیا کہ دیر ہو رہی تھی.. شام ہو رہی تھی.. اوپر سے کوئی بھی نیچے نہیں آ رہا تھا.. اور مجھے ابھی اوپر پہنچنا تھا.. دو نفل ادا کر کے تاریخ کی روشنی میں نیچے بھی پہنچنا تھا..

یہاں سے چند سیڑھیاں طے کر کے اوپر ہوا.. تو وہ جھل آسمان میرے برابر میں آ گیا.. منظر کھلا اور جبلِ نور کے دوسری جانب جو ہوا تھی وہ میرے بدن کو مس کرنے لگی.. میں ایک ایسے مقام پر آ گیا جہاں میں پہلی بار کھلی فضا میں تھا.. چڑھائی کے دوران آپ کی نظروں کے سامنے صرف پہاڑ کی شباہت ہوتی ہے لیکن جب آپ اس کی چوٹی کے قریب پہنچتے ہیں تو منظر کھل جاتا ہے اور ہوا بھی کھل کر بدن کو لپیٹ میں لے لیتی ہے.. جبلِ نور کی دوسری جانب جدھر سے یہ کوہ ایک گھاٹی کی صورت نیچے تک گرتا ہے وہاں نشیب میں جو اِکا دُکا مکان نظر آتے تھے اُن پر شام مکمل طور پر حاوی ہونے کو تھی اور اُن میں کہیں کہیں روشنیاں جل اُٹھی تھیں.. دائیں بائیں تو فضا کھلی تھی لیکن ابھی سامنے چند سیڑھیاں اوپر کو جاتی دکھائی دے رہی تھیں.. میں سانس لینے کے لیے دیر تک نہیں رُکا.. میں جان گیا تھا کہ منزل ما دور نیست.. یہاں سے چوٹی.. لبِ بام بس دو چار ہاتھ ہے..

میری کمر پر لٹکتے تنتی رُک سیک میں دودھ کی جو بوتل تھی وہ بھی مجھے کچوکے دیتی تھی کہ بس اب منزل آنے کو ہے..

پچھلی بار آیا تھا تو دو طرفہ انسانی ٹریفک جاری تھی.. لوگ آ جا رہے تھے اور میں اُن کے ہجوم میں.. نمیر کے پیچھے چلا جاتا تھا لیکن آج اسی راستے پر میں یکسر تنہا تھا اور شام ہو رہی تھی.. اس اُترتی شام میں اور یکسر تنہائی میں بھی ایک عجیب کیف تھا.. اس کیف میں اگرچہ ڈر شامل تھا لیکن اس کا لطف جدا تھا..

میں پھر سے چلنے لگا..

ایک دماغی طور پر تھکے ہوئے عمر رسیدہ اونٹ کی مانند ہچکولے لیتا.. اپنے خزاں رسیدہ دانت بھینچتا.. اپنے آپ کو ڈھارس دیتا تھا کہ اے شوریدہ سر شتر بے شک تمہارے پاؤں بوجھل ہو چکے ہیں یہاں تک کہ ان میں جو جوگرز ہیں وہ بھی تھکن سے چوڑے ہو کر نڈھال ہو رہے ہیں لیکن اے شترِ شوق ابھی چند لمحوں میں تجھے اس بے انت صحرا میں ایک نخلستان دکھائی دینے کو ہے.. تم کمر پر کجاوے کے بوجھ کو کچھ دیر اور سہار لو.. اور اس نخلستان میں کھجوروں کے گھنے جھنڈ میں پوشیدہ گہرے نیلے پانیوں کا ایک چھوٹا سا تالاب ہے جہاں تمہارے حضورؐ اپنی پیاس بجھانے آتے تھے اور قیام کرتے تھے.. جہاں پہلی بار جبرئیل امین اُترے تھے کہ اس شخص کی پیاس بجھاؤں جس نے کل کائنات کو ترو تازہ کرنا ہے اور جسے کچھ

سوالوں کے جواب نہیں مل رہے تو اُسے وہ جواب پڑھاؤں.. اقراء کا اذن دوں..

تو اے عمر رسیدہ.. حواس باختہ نکمے ناکارہ اور آوارہ شک سے بھرے اونٹ.. تیری جلد ڈھلک رہی ہے، دانت اکھڑ رہے ہیں.. جبڑا چارہ چبانے سے قاصر ہوتا جاتا ہے.. اور آنکھیں مدھم ہو رہی ہیں.. تو ذرا سی ہمت اور کرلے.. تو بے شک عیبوں سے بھرا ہے ابھی تک نہیں جانتا کہ تو موسیٰ ہے یا فرعون.. تو یہ جاننے کے لیے تھوڑی سی ہمت کر، جان جائے گا..

آخری سیڑھی پر آخری قدم.. اور میں جبلِ نور کی چوٹی پر ایستادہ چھپر تلے تھا..

جونہی چھپر تلے گیا تاریکی بڑھ گئی.. وہاں گھپ اندھیرا تھا.. آسمان دکھائی نہ دیتا تھا کہ راستے میں چھپر حائل تھا..

میرے جوگرز تلے خالی ڈبے اور کارٹن دبتے تھے.. منرل واٹر کی ایک خالی بوتل پاؤں تلے آئی تو اس کے پلاسٹک کے دبنے سے کڑکڑاہٹ ہوئی جس نے مجھے ایک لمحے کے لیے ڈرا دیا..

یہاں کوئی نہ تھا.. تاریکی میں کچھ کرسیاں.. ایک کاؤنٹر اور ایک شیلف بچھے ہوئے تھے.. میں کچھ دیر یہیں تاریکی میں کھڑا رہا..

ذرا آگے.. دو چار قدم آگے.. میں جانتا تھا کہ اگر میں ذرا آگے جاتا ہوں تو ایک مختصر ہموار سطح آئے گی وہ بھی دو چار قدم کی اور پھر چوٹی سے اُترتی کچھ تنگ سیڑھیاں ہوں گی.. ان میں ایک موڑ آئے گا اور کھائی پر معلق یہ سیڑھیاں جب اختتام کو پہنچیں گی تو وہاں دائیں ہاتھ پر ایک تاریک سرنگ ہوگی جس کے پار غار ہے.. یار ہے.. اب کیا کروں؟.. کب تک کھڑا رہوں..

تنہا نیچے جانے کا کچی بات ہے مجھ میں حوصلہ نہ تھا.. اور یہ بھی کہاں ممکن تھا کہ جھڑتے دانتوں اور ڈھلکتی کھال والا بے ڈھب بابا اونٹ یہ سونگھ لے.. اُس کے بوڑھے نتھنے ایک باس سے آشنا ہو جائیں جو خبر کردے کہ نخلستان تو آ گیا ہے اور اس کے درمیان کیسے ٹھنڈے پانی ہیں جو تمہاری ازلی پیاس بجھانے پر قادر ہیں.. یہ جان لے، سونگھ لے اور پھر بھی وہ آگے نہ جائے، ٹانگیں سمیٹ کر وہیں ڈھیر ہو جائے یہ کہاں ممکن تھا..

یہ ممکن تو نہ تھا لیکن اس کے باوجود تنہا نیچے جانے کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا..

جب دن کی روشنی تھی، لوگ تھے.. ہجوم بھی تھا تب بھی اس اندھیری غار میں جانے سے ہول آتا تھا.. نہیں گیا تھا.. ہجوم میں دم گھٹنے کے خوف سے اور اس کی تاریکی کے ڈر سے.. اور اب.. میں اکیلا تھا.. تاریکی بھی تھی.. میں اُس غار کے ہجوم سے تو بچ نکلا تو اتر سکتا تھا لیکن اس کے اندر اترنے کے خیال سے

ہی بدن کو مردہ کر دینے والی سراسیمگی گرفت میں لے کر مجھے گھونٹ دیتی تھی..

چھپر تلے کی اُسی تاریکی میں ایک سرسراہٹ سی ہوئی جس نے اونٹ غریب کا رہا سہا خون بھی خشک کر دیا..

اس سرسراہٹ کے نتیجے میں نیاز نمودار ہوا..

اُس کی نمو داری واضح نہ تھی صرف ایک سایہ سا تھا.. جس نے تاریکی میں سے جنم لیا تھا.. نہ میں اس کی شکل دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی وہ یہ جان سکتا تھا کہ اس ڈھل چکی شام میں جبلِ نور کی چوٹی پر جو بھٹکتا ہوا بابا اونٹ آن پہنچا ہے یہ کون ہے.. ہم دونوں واہمے اور سائے تھے ایک دوسرے کے لیے.. شکلیں نہ تھے مبہم ہیولے تھے.. اُس نے کچھ کہا مجھ سے مخاطب ہو کر.. اُس نے کیا کہا.. میری سمجھ میں نہ آیا.. پھر اُس نے کچھ اور کہا اور پھر کچھ اور..

اور جب اُس نے کچھ اور کہا تو وہ لفظ آشنا سے لگے کہ یہ فارسی کے تھے.. اور جب میں نے جواب میں کچھ بھی نہ کہا تو اُس نے جو کچھ کہا وہ بہت ہی آشنا تھا "بھائی جی.. کتھوں آئے او.. پاکستانی او؟"

میں خوش ہو گیا.. "بھائی آپ پنجابی جانتے ہو؟" یہ میں نے پنجابی میں ہی دریافت کیا..

"آہو جی.."

"تو یہ ابھی ابھی کیا بول رہے تھے؟"

"یہ تو میں فارسی، ترکی.. بنگالی اور انڈونیشین وغیرہ بول رہا تھا.."

"آپ یہ سب زبانیں جانتے ہیں..؟"

"گزارے موافق.. آپ ادھر چھپر تلے کھڑے تھے تو پہچان نہیں ہو رہی تھی کہ کون ہے ایرانی ہے ترک ہے کون ہے.."

وہ مجھے وہاں اُس اندھیرے میں تنہا پا کر حیران نہیں ہوا تھا.. اور نہ ہی اُس نے پوچھا کہ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو..

مجھے تشویش تھی کہ کہیں وہ مجھے تنہا چھوڑ کر چلا نہ جائے.. مجھے ہر صورت اُس کے ساتھ دوستی کر لینے کی شدید خواہش تھی "آپ یہاں کیا کرتے ہو؟"

"میں یہاں بہت کچھ کرتا ہوں حاجی صاحب.." اُس کے لہجے میں بہت اپنائیت تھی.. "دن کے سمے بھی ادھر زائرین کو جوس اور پانی بیچتا ہوں.. نیچے سے سامان بھی لاتا ہوں.. میرے پاس پولورائڈ

کیمرہ ہے جس کے ساتھ حاجیوں کی تصویریں بھی اُتارتا ہوں.. فوٹو گرافر بھی ہوں.. آپ کا تصویر اُتاروں؟"

"نہیں شکریہ.. یہاں تو تاریکی بہت ہے.."

"فلیش ہے صاحب.. یادگار رہے گا.."

"نہیں.. آپ کا نام کیا ہے؟"

"نیاز.. آپ پہلی بار آئے ہو؟"

"نہیں.. پہلے بھی آ چکا ہوں.. تو تم فوٹو گرافر بھی ہو؟"

"ہاں جی.. دن کے ٹیم یہاں بہت لوگ ہوتے ہیں.. ہم نے اِدھر پتھروں پر "غارِ حرا" پینٹ کیا ہوا ہے.. حاجی لوگ اُن کے سامنے کھڑے ہو کر تصویریں اُتروواتے ہیں اور خوش ہو جاتے ہیں.."

"لیکن.. غارِ حرا تو نیچے ہے.. یہاں تو نہیں ہے.."

"کیا فرق پڑتا ہے صاحب.. جبل نور کا ہر پتھر غارِ حرا ہے.."

یہاں چھپر تلے تو گھپ اندھیرا تھا.. گہرا اور ڈھکا ہوا لیکن بقیہ جبل نور ایسی تاریکی میں نہ تھا.. کہ اس کے دامن میں واقع وادیٔ مکہ کی آبادیوں میں.. اور شاہراہوں پر جو روشنیاں کہیں جھمکوں میں اور کہیں بکھری ہوئی تھیں اُن کے عکس اس کوہ کو بھی تاریکی میں نہ جانے دیتے تھے.. وہ تیز روشنیاں اگرچہ اس جبل تک پہنچتے پہنچتے ایک دیے کی لو میں بدل جاتی تھیں لیکن وہ کافی تھیں اس کی ہیئت اور شکل کو واضح کرنے کے لیے.. نیاز کی رفاقت سے مجھے حوصلہ ہوا اور میں ذرا آگے ہوا.. چھپر کی چھت سے ذرا آگے ہوا تو اس ہلکی مدھم روشنی میں آ گیا اور اس کے ساتھ ہی مکہ کی پوری وادی جبل نور کے قدموں میں بچھی روشن نظر آنے لگی.. میں اس منظر میں مبہوت تھا کہ نیاز کچھ قریب ہوا اور کہنے لگا "صاحب.. آپ وہ تو نہیں ہو.. تارڑ صاحب؟"

"ہاں.. بالکل وہی ہوں.."

کام بن گیا تھا.. میں اس دیار میں ہمیشہ پہچانے جانے سے کتراتا تھا.. منہ چھپائے پھرتا تھا لیکن یہاں میں پہچانا جانا چاہتا تھا.. بے شک میں تھوڑا سا کمینہ ہو جاتا.. اپنی بوتھی آگے کر کے وانت (لال) کر زبردستی اپنی پہچان کرواتا کہ اس مقام پر میں اپنی شہرت کیش کروانا چاہتا تھا.. میں نیاز کو باور کروانا چاہتا تھا کہ اس نے آج تک مجھ ایسا مشہور عالم شخص نہ دیکھا تھا صرف اس لیے کہ.. کہیں وہ مجھے چھوڑ کر چلا نہ جائے.. مجھے اس کی موجودگی کا سہارا درکار تھا.. اس کی رفاقت کی بیساکھیوں کے سہارے میں کم از کم اس [illegible] تک جا سکتا تھا جس کے لیے وہ غار تھا..

وہ چونکہ میرے اقرار کرنے پر کچھ نہ بولا تھا اس لیے میں نے دوبارہ کہا "ہاں میں وہی تارڑ ہوں بھائی جی.."

میرے تارڑ ہونے سے وہ کچھ زیادہ متاثر نہ ہوا.. جانے اس مقام پر کیسے کیسے نامور نابغۂ روزگار.. اللہ کی قربت والے آتے تھے تو وہ کیسے مجھ ایسے جعلی شہرت کے بھوکے بے وقوف سے متاثر ہوتا.. جیسے وہ راستے کے کسی پتھر کو پہچان لے کہ یہ دیکھا ہوا لگتا ہے.. کسی اونٹ کی تھوتھنی سے اندازہ کر لے کہ اسے کہیں دیکھا تھا.. اور پوچھ لے کہ تم وہی پتھر ہو.. وہی اونٹ ہو.. ایسے اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تم وہی تارڑ ہو تو جواب اثبات میں پا کر کیسے متاثر ہوتا..

"آپ نے نیچے غار تک بھی جانا ہوگا.. تو آ جائیں.."

"آپ بھی ہوں گے ناں.."

"آ ہو جی.. آ جائیں.."

میں آ گیا..

نیاز جبل نور کی چوٹی سے اُترتی.. وادیٔ مکہ کی جانب رُخ کرتی گہرائی میں اُترتی تنگ سیڑھیوں پر اُترنے لگا.. اور میں اُس کے پیچھے پیچھے.. اُسے نظر میں رکھتا ہوا کہ وہی میری ڈھارس تھی.. میرا سہارا تھا..

اور یہاں سے سیڑھیاں اُترتے ہوئے جبل نور کی اعلیٰ ترین اونچائی سے اس کے دامن سے شروع ہو کر جہاں تک نظر میں جانے کی سکت تھی وہاں تک ایک ایسا جادوئی منظر دیکھا.. ایک بار دیکھا اور اس لمحے اسے دوسری بار دیکھنے کی ہوس نے سر اُٹھایا..

یہ خالق کی جانب سے ایک آوارہ گرد کی خاطر زمین پر اُتارا گیا تھا..

یہ ایک اور انعام تھا.. ایک تحفہ تھا.. جو صرف مجھ ایسے سیاہ کار آوارہ گردوں کے نصیب میں درج ہوتا ہے..

یوں تو کبھی منظر خالق اُتارتا ہے..

لیکن ایسے منظر کسی کسی پر اُتارتا ہے..

اس لیے کہ ایسا ترددد اور ایسی وابستگی بھی تو کسی کسی میں ہوتی ہے..

میں وادیٔ مکہ کے اردگرد جتنی بھی بلندیاں ہیں.. میں ان میں سے جو بلند ترین اس کی چوٹی پر ایک شب میں ہوں.. جبل نور کی چوٹی پر ہوں..

اور میرے قدموں میں.. مکہ ہے.. نہیں یہ اظہار قطعی طور پر ناواجب ہے.. مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میرے قدموں میں مکہ ہے.. میں جہاں ہوں اُس کے گہرے نشیب میں مکہ کی وادی روشنی اور روشنی.. جھلملاتی کہیں اور کہیں ٹمٹماتی نمایاں اور روشن ہوتی جاتی ہے.. اور اس دنیا کے عزیز ترین شہر کی روشن بستیوں میں.. منور آبادیوں میں.. اُن میں گھرا ہوا رب کا گھر ہے..

خانہ کعبہ ہے..

میں بہت بلندی پر ہوں.. بہت فاصلوں پر ہوں.. تو یہاں سے وہ مختصر ماڈل کی صورت نظر آتا ہے.. اتنا مختصر دوریوں میں اتنا دور کہ اُس کے مینار بس اتنے اونچے ہیں جتنی اونچی ایک آدھی پنسل.. اور اُن کی جسامت بھی اتنی ہی ہے.. اور اُن میناروں کے درمیان جو روشنی دمکتی سفید سفید ہے اُس کے درمیان میں خانہ کعبہ ہے.. جسے فاصلے کبھی دکھاتے ہیں اور کبھی روپوش کر دیتے ہیں.. خانہ کعبہ کبھی دکھائی دینے لگتا ہے اور کبھی نظر کا دھوکا لگتا ہے روشنیوں میں گھل جاتا ہے.. آنکھیں وہیں ایک نقطے پر جمائے رکھو تو وہ ہے.. ایک بار آنکھیں جھپک دو تو وہاں نہیں ہے..

خانہ کعبہ..

وادیٔ مکہ کی روشنیوں میں آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا ایک مختصر سورج..

ایک چھوٹا سا ماڈل..

ایک گھروندا..

ایک دمکتا ہوا گھر.. جو ابھی دکھائی دے رہا ہے اور ابھی حرم کے سورج میں گھل جاتا ہے..

بے شک وہ حقیقت ہے.. وہاں ہے.. لیکن یہاں سے اس بلندی سے.. غارِ حرا تک اُترنے والی سیڑھیوں سے وہ ایک خواب لگتا تھا..

یہ سیڑھیاں جبل نور سے چمٹی ہوئی.. ایک کھائی سے پہلو بچاتی ہوئی.. یکدم رُخ بدلتی مڑتی ہیں.. تعداد میں بیس کے لگ بھگ ہوں گی.. جب یہ اختتام کو پہنچتی ہیں..

آخری سیڑھی آتی ہے تو بنگالی بابا بھی آ جاتا ہے..

توند پھیلائے.. اس پر سکڑتی بنیان چپکتا.. اپنی سفید ریش سنوارتا.. ڈھلکتے ہوئے تہبند کو سنبھالتا بنگالی بابا نور اللہ آ جاتا ہے..

جبل نور پر.. ایک نور اللہ براجمان ہے جو بنگال کا ہے..

یہ بنگالی بابا کیسے سامنے آ جاتا ہے میں عرض کرتا ہوں..

جب آپ جبل نور کی چوٹی سے اتر کر سیڑھیوں پر احتیاط سے اُترتے جب آخری سیڑھی پر اُترتے ہیں تو پہاڑ کی ڈھلوان ہے جو اس کے دامن تک گرتی جا رہی ہے.. اس تقریباً عمودی ڈھلوان سے چمٹا ہوا ایک چھپّر ہے.. وہاں چھپّر تلے.. اور چھپّر تلے اور کیا ہے.. ایک بوسیدہ سا بستر بندھا ہوا.. پانی کی بوتلیں.. ایک دو چار تختوں کو آپس میں ٹھونک کر بنایا گیا لرزیدہ سا لکڑی کا بنچ جس پر کچھ گندے مندے تکیے پڑے ہیں.. ردی کاغذوں کے پلندے.. اور چھپّر تلے اُس سرنگ کا دہانہ ہے اور وہاں ایک پتھر پر آلتی پالتی مارے اپنے ڈھلکتے ہوئے تہبند کو سنبھالتا‘ سفید ریش سنوارتا بڑے تربوز سے سر والا یہ بنگالی بابا ہے.. جو اس بُدھ کا ہم شکل ہے جو اگر بنگال میں پیدا ہوتا تو ہو بہو ایسا ہوتا سوائے سفید داڑھی کے کہ اُس کی توند چینی جاپانی مہاتما بدھ کے ہم پلّہ تھی.. ہمارے گندھارا کے بدھ تو نہایت سمارٹ متناسب بدن کے اپالو دیوتا ایسے ہوتے ہیں.. تو یہ بنگالی بدھ مہاراج جس سے ہم چھپّر تک اُتر آئے ہیں تو اپنے سنگھاسن پر براجمان.. یعنی ایک پتھر پر کچھ گدّے سے رکھے اُن پر براجمان ہمیں دیکھ کر اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے جس میں ایک ٹارچ ہے اور ذرا سا آگے ہو کر دائیں جانب جو کھوہ سی دکھائی دے رہی ہے اُس کی تاریکی میں روشنی ڈالتا ہے کہ یہی وہ دشوار تنگ اور چٹانوں کی رکاوٹ والی سرنگ ہے جو غارِ حرا کے صحن میں جاتی ہے..

یاد رہے کہ یہ سارا منظر شام کے بعد کا ہے.. رات کی قربت کا ہے اور تاریکی میں جنم لے رہا ہے.. اس اندھیرے میں جبل نور کی ایک کھائی کے کنارے چھپّر تلے اگر ایک ایسا بابا یکدم میرے سامنے آ جاتا اور نیاز میرے ہمراہ نہ ہوتا تو یقیناً میرا دم نکل جاتا..

میں نے اُسے ایک نہایت خوشامدانہ سا السلام علیکم کہا اور اُس کے قریب بنچ ٹٹول کر اُس پر بیٹھ گیا اس احتیاط کے ساتھ کہ کہیں میں اس ناتواں اور لرزتے بنچ سمیت کھائی میں نہ لڑھک جاؤں.. بابے نے میرا خیال ہے کہ میرے سلام کو یا تو سنا نہیں اور اگر سنا تو سمجھا نہیں کیونکہ اُس کے جواب میں کچھ نہ کہا اسی حالت میں ادھر ہی کو جھکا رہا اور سرنگ کے اندر روشنی ڈالتا رہا.. اور پھر نیاز نے نہایت دوستانہ انداز میں اُسے کچھ کہا تو وہ ٹارچ بجھا کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا.. وہ ناراض سا نظر آتا تھا.. میں نے اُس کی روشنی کو ضائع کر دیا تھا اور سرنگ کے اندر نہیں گیا تھا..

بابا بنگالی نے سرنگ میں روشنی ڈال کر زائرین کو راستہ دکھانے کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی اور مفت میں نہیں کر رکھی تھی..

یہ عمل دن رات جاری رہتا تھا.. یعنی جب تک زائرین کا آنا جانا لگا رہے.. وہ جو بھی کسی

زائر کو بے شک دن کی دھوپ میں سیڑھیوں سے اُترتا دیکھتا تھا تو ایک روبوٹ کی مانند ٹارچ آن کر کے اپنی نشست سے ذرا آگے ہو کر قدرے جھک کر سرنگ میں روشنی بھیجتا تھا تا کہ زائر کو آسانی ہو اور وہ سرنگ میں راستہ دیکھ سکے اور پار چلا جائے.. اگرچہ ٹارچ کی روشنی بہت دور تک نہیں جاتی تھی چند قدم کے بعد دم توڑ جاتی تھی.. اور یہ بھی نہیں کہ وہ زائر اس راستہ دکھانے والے بنگالی بدھا کو تھینک یو بابا جی کہہ کر ایک مسکراہٹ پر ٹرخا کر اندر چلا جائے.. پہلے پہل مجھے بھی یہی گمان ہوا کہ کیسی اعلیٰ اور ارفع روح ہے یقیناً کوئی پوشیدہ ولی ہے کہ برسوں سے یہاں اس چھپر تلے براجمان یہیں سوتا جاگتا زندگی کرتا ہے محض اس لیے کہ خلق خدا کو حضور کی پتھریلی اور محبوب آماجگاہ تک پہنچنے میں آسانی ہو تو یہ کیسا اونچا اور بزرگ ہے..

میں اُس کی بے لوث خدمت سے از حد متاثر ہوا کہ یہ اپنا وطن بال بچے تیاگ کر یہاں آن بیٹھا ہے.. ایک نہایت دقت والی مشکل زندگی گزار رہا ہے.. اگرچہ وہ ایک عمدہ شاید نیک دل بھی سو ہے سا بوڑھا تھا لیکن وہ ایک واجبی تھینک یو یا سرسری مسکراہٹ پر ہی ٹرخا دیا جانے والا بوڑھا نہیں تھا.. وہ زبردستی تو نہیں کرتا تھا لیکن اپنی بدنی زبان اور اشاروں کنایوں سے یہ واضح کر دیتا تھا کہ اس سہولت کے لیے جو وہ ایک ٹارچ روشن کر کے مہیا کرتا تھا زائر صدقے کے طور پر کچھ نہ کچھ تو نذر کرے.. اس بلندی پر ٹارچ کے سیل آسانی سے نہیں ملتے.. ویسے میں اُسے دوش نہیں دے سکتا تھا.. محض عقیدت پر گزارا نہیں ہو سکتا.. اور اگر زیارت کے آس پاس قیام طویل ہو جائے تو عقیدت مدھم پڑ جاتی ہے اور دال روٹی کا حصول زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے.. بہر طور وہ ایک دھیما اور کسی حد تک سادہ انسان لگتا تھا..

ہم تینوں بہت دیر چپ بیٹھے رہے.. وادیٔ مکہ سے اُٹھنے والی روشنیاں بجھتی بجھاتی اپنی تمازت جبلِ نور کے اس کھائی پر معلق چھپر تک پہنچتے تک کھو دیتی تھیں اور ایک ہلکی لو دینے لگتی تھیں جو ہمارے چہرے عیاں کرنے کے لیے کافی تھی..

''گار میں نہیں جائے گا..'' بابا بنگالی نے مجھے اپنے واحد فرنیچر یعنی لکڑی کے بینچ پر براجمان بیکار اور چپ بیٹھے دیکھ کر پوچھا..

''گار میں؟''

''ہاں گار میں بابا..''

بابا بنگالی ہے نا.. غار کو گار بولتا ہے.. نیاز مسکرایا..

''جائے گا بابا.. کیوں نہیں جائے گا.. اسی لیے تو اوپر آیا ہے..''

''تو جو [illegible] رات بسیرا وہ ہو گیا تو واپس نیچے کیسے جائے گا''

''بابا.. ابھی اندر کوئی ہے؟''

''ہاں.. دو تین ایرانی لوگ ابھی گیا ہے.. بہت جگہ ہے... جاؤ..''

بابا نے تو ''جاؤ'' کہہ دیا لیکن میں جا نہیں سکتا تھا..

میں تنہا اس گھٹا ٹوپ اندھیرے والی تنگ سرنگ کے اندر اب بھی نہیں جا سکتا تھا..

''اگر میں ادھر سے اوپر جا کر صحن میں اُتر جاؤں تو ٹھیک ہے..''

''نہیں صاحب..'' نیاز بولا ''ایک تو پتھروں پر اس قیم چڑھنا خطرناک ہے.. دوسری جانب جو کھائی ہے اُدھر ڈھلوان بہت ہے وہاں پھسل جائے گا.. پھر غار کی چھت سے نیچے صحن میں بھی آسانی سے نہیں اُترا جا سکتا.. آپ سرنگ کے راستے کیوں نہیں جاتے..''

''مجھے ڈر لگتا ہے یار..''

''میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں..'' اور میں یہی چاہتا تھا..

''ٹھیک ہے.. لیکن میرے ساتھ رہنا..''

بابا بنگالی نے فوراً ذرا آگے ہو کر ٹارچ آن کی ''چلو ہم لائٹ کرتا ہے..''

''نہیں بابا'' میں نے امانت کی خرید کردہ اپنی مختصر سی ٹارچ جلا کر کہا ''میرے پاس ٹارچ ہے..''

''چھوٹا ہے..'' اُس نے ناگواری سے کہا اور اپنی ٹارچ بجھا دی..

واقعی میری ٹارچ.. چھوٹا تھا.. عین سامنے جو دو ایک پتھر تھے انہیں تو واضح کرتی تھی لیکن ان کے پار جانے سے قاصر تھی..

میں اب بھی حیران ہوتا ہوں کہ اس تنگ سرنگ میں سے عام وقتوں کی بھیڑ میں جو درجنوں بوڑھے اور عورتیں ہوتی ہیں وہ کیسے اس میں سے گزرتے ہیں.. یہ کوئی ایسی باقاعدہ سرنگ نہ تھی جس کا ایک فرش ہوتا ہے.. ایک چھت ہوتی ہے بلکہ لاکھوں برس پیشتر کسی جغرافیائی تبدیلی کے نتیجے میں شاید کسی بھونچال کی وجہ سے بڑے بڑے پتھر اور چٹانیں گریں اس انداز میں کہ اُن میں ایک راستہ بن گیا.. سرنگ کے اندر چند چٹانوں کی مہیب رکاوٹ تھی.. یا تو ان کے درمیان میں سے سکڑ کر گزرا جا سکتا تھا یا انہیں ناپنا پڑتا تھا.. ان پر چڑھ کر دوسری جانب اُترنا ہوتا تھا.. اور یہ بھی دھیان رکھنا ہے کہ اوپر جو پتھر جھکے ہوئے ہیں اُن سے سر نہ ٹکرائے.. اور چٹانوں کی رکاوٹ کے باعث سامنے کچھ نظر نہ آتا تھا.. اور وہ جو سرنگ کے آخر میں روشنی والا انگریزی محاورہ ہے وہ یہاں ناکارہ ہو جاتا تھا..

میں تو اس سرنگ میں داخل ہی شب کی سیاہی کے سے ہوا تھا لیکن یہاں دن کو بھی تلوک چند

محروم کی آخری آرام گاہ نور جہاں کے مصداق شب کی سیاہی کا سماں ہوتا تھا.. تاریکی ہوتی تھی.. تو وہ لاکھوں لوگ کیسے شاندار حوصلے والے تھے جو اس سرنگ کے باہر مجھ ایسے تھڑدلے کی مانند جھجکتے نہ تھے بے دھڑک اس میں داخل ہو جاتے تھے..

یہ سرنگ اتنی طویل نہیں جتنا میرا بیان ہو چلا ہے.. کوئی فیتہ وغیرہ تو ساتھ لے کر نہیں گیا تھا اگرچہ لانا چاہیے تھا کہ ناپ کر اس کی صحیح لمبائی بیان کر سکتا.. میرا خیال ہے کہ بابا بنگالی کے چھپر تلے جو اس کا دہانہ تھا وہاں سے غارِ حرا کے صحن تک یہ کوئی پانچ چھ میٹر سے زیادہ طوالت کی نہ تھی..

نیاز میرے آگے تھا..

اگرچہ ٹارچ میرے ہاتھ میں تھی لیکن نیاز اس کی روشنی کا محتاج نہ تھا کہ وہ تو مقامی باشندہ تھا.. دن رات آتا جاتا رہتا تھا.. ایک ایک پتھر سے واقف تھا.. آنکھیں بند کر کے بھی اس میں سے گزر سکتا تھا..

اور میں دور کے شہروں سے آیا تھا..

ناواقف تھا.. پہلی بار اس سرنگ میں داخل ہوا تھا..

ایک چٹان تو ایسی تھی کہ سرنگ کی دیوار اور اس کے درمیان گزر جانے کی جگہ بہت تھی..

پھر ایک اور تقریباً چھت کو چھوتی چٹان حائل ہوئی اور یہ آخری چٹان تھی..

اس پر چڑھ کر دوسری طرف اُترنا میرے لیے تو ممکن نہ تھا تو اسے عبور کرنے کے لیے آپ دائیں جانب سرنگ کی دیوار اور اس چٹان کے درمیان جو بہت تنگ سی جگہ ہے اُس مختصر خلا میں سے اپنا پیٹ سکیڑ کر سانس روک کر ہی گزر سکتے ہیں..

نیاز تو گزر گیا..

اور میں پھنس گیا..

جب میں نے اپنا سانس اور پیٹ خوب سکیڑ کر اس خلا میں سے پار ہونے کی سعی کی تو ان ہر دو چٹانی قربتوں نے مجھے اپنے کلاوے میں جکڑ لیا جیسے ایک ناتواں پہلوان کو گاما پہلوان اپنے شکنجے میں جکڑ لیتا تھا کہ بچہ اب کہاں جائے گا.. تو اس حالت میں مجبوری میں.. بچے نے.. یعنی میں نے.. اپنے حلق سے ایک گھگھیائی ہوئی آواز برآمد کی..

مجھے وادیِ شمشال کو جاتے ہوئے ایک گھاٹی پر خطر بھربھری ریتلی آسمان سے گرتی گہرائی میں بہتے نہ نظر آنے والے دریا میں جا گرتی ڈھلوان پر میں بالکل سامنے دیکھتا 'پیچھے نہ دیکھتا' کچھ قدم تو چلتا گیا اور جب [illegible] میں دھیان پیچھے گیا تو دیکھا کہ شمشال جانے کی گہرائیوں [illegible]

مسافتوں کے آخر میں نظر آیا بھی اور اوجھل بھی ہوا تو میرے پاؤں چکّی کے پاٹ ہو گئے.. تھم گئے.. میں ایسے خوف کے نرغے میں آیا کہ وہیں بُت بن گیا اور میں نے اپنے گائیڈ رجب شاہ کو جو آگے آگے ایک شتر بے مہار کی مانند مست چلا جاتا تھا' پکارا.. اور کس انداز میں پکارا.. کہ را.. را.. رج.. رجب..

تو یہاں بھی.. اس سرنگ میں جیسے میرا چھوٹا ٹارچ کچھ کچھ دکھاتا تھا.. جہاں اپنے آقا آیا جایا کرتے تھے اور یقیناً نہایت ستواں.. نہایت فٹ اور چیتے کے پیٹ والے ہوں گے جو ادھر سے آسانی سے گزر جایا کرتے تھے.. اور میں وہاں پھنس گیا تھا.. اور اپنے حلق سے ایک گھگھیائی ہوئی آواز برآمد کر کے.. اسی شمشالی انداز میں پکارتا تھا.. ن.. ن.. نیا.. نیاز!

وہ پار ہو چکا تھا.. مجھے دیکھ نہ سکتا تھا کہ میں کہاں ہوں "کیا ہے تارڑ صاحب؟"

"یار میں اِدھر پھنس گیا ہوں.. میری توند مزید پیچھے ہونے سے انکاری ہے.."

وہ بندہ خدا.. یا بندہ غارِ حرا.. پھر سے واپس آ گیا "آپ اُدھر سے پیچھے ہو جاؤ.."

میں پیچھے ہو گیا..

اس چٹان کا ایک حصہ تو وہ تھا جہاں ایک مختصر خلا تھا جس میں میں پھنس گیا تھا اور دوسری جانب یہ چٹان سرنگ کی دیوار کے ساتھ جڑی ہوئی تھی..

اس لیے اس کے پار جانے کے لیے نیاز نے مجھے سہارا دیا اور ایک پتھر پر چڑھا کر دوسری جانب اُتار لیا..

اور میں بہت ہی مشکل سے اس پتھر پر چڑھا اور دوسری جانب اُترا..

یہاں غار کے آخر میں روشنی ہونے کا محاورہ بیکار نہ ہوا.. روشن ہو گیا..

دوسری جانب سرنگ کے اختتام پر ایک ہلکی ملائم روشنی ظاہر ہو رہی تھی.. جیسے سویر ہونے کو ہو.. اور دو چار قدموں کے بعد میں اس سویر میں آ گیا.. اور جب میں اس سویر میں آیا تو گویا آج تک کائنات بھر میں جتنی بھی سویریں آ چکی تھیں اُن سب میں سے ممتاز ایک ایسی انوکھی سویر میں آیا کہ میرا اگلا قدم ایک صحن میں تھا.. جو کہ غارِ حرا کا صحن تھا..

یہ ہمیشہ سے صحن نہیں تھا..

غار کے آگے ایک چھوٹی سی ہموار جگہ ہوا کرتی تھی.. سرنگ میں سے نکلتے ہی سامنے آتی تھی..

دائیں جانب چٹانیں اُفق ہوئی جبل کی چوٹی تک پہنچتی تھیں یعنی تین حصاروں میں گھری ہوئی تھی.. سرنگ کے آگے.. غار کے سامنے اور چٹان کی اوٹ میں.. اور جو چوتھی جانب تھی وہ کھلی تھی اور اُدھر سے

جھانکنے تو کھائی گرتی دکھائی تھی..

ہوتا یہ تھا کہ اکثر سرنگ میں سے زائرین کا ریلا آتا.. اُس مختصر جگہ پر پہلے سے کچھ لوگ موجود ہوتے اور یہ ریلا بے اختیار انہیں دھکیلتا تو وہ بے بس ہو کر کنارے تک دھکیلے جاتے جس کے آگے کھائی گرتی تھی اور یوں شاید کچھ حادثات بھی رونما ہوئے چنانچہ زائرین کی حفاظت کے لیے یہاں چند برس پیشتر ایک چار پانچ فٹ کی پتھریلی دیوار تعمیر کر دی گئی اور یہ چھوٹا سا صحن وجود میں آ گیا..

شاید آٹھ فٹ X چھ فٹ کا..

وہی مختصر صحن جسے میں نے اور سمیر نے غار کی چھت پر بیٹھے زائرین سے بھرا ہوا دیکھا تھا..

میں نے اپنی حیات میں اگرچہ ہر شخص کی مانند بہت سے صحن دیکھے تھے لیکن ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو میری نفسیات اور تخلیقی سوچ کا ایک حصہ بن چکے ہیں..

اپنی نانی جان' حاجن فاطمہ.. بے بے جی کا صحن.. جس کے ایک کونے میں دھریک کا ایک درخت تھا.. اتنے پتے گرتے کہ ماچھن خورشیداں کے لیے وبالِ جان ہو جاتے.. وہ دن میں دو مرتبہ صحن میں جھاڑو پھیرتی تو بھی ہر جانب زرد پتے سرکتے رہتے.. دوسرے کونے میں کوٹھے پر جانے والی کچی سیڑھیاں تھیں جن کے تلے سلگتے اُپلوں پر دھری چاٹی میں دھیرے دھیرے گرم ہوتے دودھ کی سطح پر خزاں رنگ پتوں ایسے تانبے رنگ کی بالائی کی تہہ اتنی گھنی ہوتی کہ انگلی چھو کر اس میں چھید کرنا مشکل ہو جاتا..

ایک صحن مسجد قرطبہ کا تھا.. جسے صحن نارنجستان کہتے ہیں کہ وہاں نارنگیوں کے پیڑ جھومتے ہیں اور اس پر سایہ کرتا وہ مینار.. تیرا منار بلند جلوہ گہ جبرئیل...

اور میں وہ سرنگ پار کر کے جس صحن میں داخل ہوا تھا یہی تو جلوہ گہ جبرئیل تھا.. مسجد قرطبہ کے صحن پر فوقیت رکھتا تھا..

ایک اور صحن جو میرے بدن میں آباد ہے میرے آبائی گھر کا ہے جس کے ایک کونے میں کسی زمانے میں بیری کا ایک تناور درخت ہوا کرتا تھا.. اور میری دادی جان نے یہ خبر پانے کے بعد کہ اُن کے اکلوتے بیٹے کے ہاں اولاد متوقع ہے تو انہوں نے ایک شب خواب میں دیکھا کہ صحن کی بیری کی ہر شاخ پر دیے جل رہے ہیں.. اور وہ اگلی سویر بھاگی بھاگی مولوی نوردین کے پاس گئیں کہ یہ کیسا خواب ہے.. تو انہوں نے کہا تھا کہ بی بی تیرے ہاں ایک پوتا ہوگا اور اس کے دیے جلیں گے روشنی کرے گا..

مسجد امیہ کا بھی ایک صحن تھا..

[illegible] حضرت یحییٰ علیہ السلام [illegible] کے پہنچ کی ہڈیاں ہونے کی تاروں سے جکڑی

ہوئی ایک شوکیس میں تھیں..

صحن کے اس رخ پر جدھر صلاح الدین ایوبی کا مزار ہے مسجد کی دیوار سے پرے شہرِ دمشق کے ایک کوچے میں اس رخ پر وہ مقام ہے جہاں کربلا کے بعد یزید نے دربار لگایا تھا اور وہ مقام تھا جہاں حسینؓ کا بریدہ سر رکھا گیا تھا..

گھریلو صحن تبھی ہوتے تھے جب لوگ کم ہوتے تھے اور خدا کی زمین زیادہ..

ایک اور میرے من کو لگنے والا صحن نیکسلا میں جولیاں کی خانقاہ کا ہے..

اور ان سے الگ ایک ایسا صحن جو کہیں نہیں اور پھر بھی ہر حساس انسان کے اندر ہے.. عشق آتش کا صحن جو "ویہڑا" کہلاتا ہے..

"کدی آ وڑ ویہڑے وے.. میں لک چھپ نیر بہاواں"

اس ویہڑے میں شاہ حسین مست ہوئے.. بلھے شاہ ناچے.. اور روہی کے ویہڑے میں خواجہ فرید پر حال آئے..

یوں بہت سے صحن ہیں جن کا بیان ہو سکتا ہے اور بہت سے "ویہڑے" ہیں جو راانجھن کے ہیں..

لیکن..

غارِ حرا کے آگے جو چھوٹا سا صحن ہے.. جس "ویہڑے" میں سب کے راانجھن آیا کرتے تھے یہ ان تمام صحنوں اور ویہڑوں کی ماں ہے..

کیسے؟

ایسے کہ کیا میری نانی جان.. میرے آبائی گھر.. مسجد قرطبہ.. مسجد امیہ.. جولیاں کی خانقاہ اور بلھے شاہ، شاہ حسین اور خواجہ فرید کے "ویہڑے" ہو سکتے تھے اگر یہ ایک ویہڑہ نہ ہوتا.. یہ نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا.. اور اس ویہڑے کے تو جبرئیل بھی شکر گزار ہوئے ہوں گے کہ راانجھن یہاں نہ آتا تو وہ کیسے یہاں اپنا جلوہ دکھاتے.. جمالِ یار نے اس صحن کو روشن کیا تو جبرئیل کو راستہ دکھائی دیا..

اور میں.. اسی صحن میں اسی ویہڑے میں داخل ہوتا تھا..

داخل ہو چکا تھا اور شام بھی ہو چکی تھی.. تاریکی ہو چلی تھی..

میں تنہا نہ تھا.. دو چار ایرانی زائرین بھی تھے.. لیکن ان سے کچھ سلام دعا نہ ہوئی وہ جلد از جلد غار میں نفل ادا کر کے واپس جانے کی فکر میں تھے..

مجھے چنداں جلدی نہ تھی..

میں بے فکر تھا..

تھوڑی دیر بعد وہ ایرانی کچھ پڑھتے ہوئے سرنگ میں داخل ہوئے اور اُس کے اندھیرے میں تحلیل ہو گئے.. ہم دونوں اُس صحن میں تنہا باقی رہ گئے... میں اور نیاز..

ہم تنہا ہوئے تو جبل نور کی چٹانوں میں سے جو آسمان جھلکتا تھا جس میں ابھی کچھ دیر بعد دسویں کے چاند نے نمودار ہونا تھا کہ یہ ماہ کے چاند کی دسویں تاریخ تھی' جب میں اُس صحن میں داخل ہوا تھا.. تو اُس آسمان سے ایک عجیب سی بے سروساماں وحشت اُتری اور میرے قلب کے گرد سیاہ جالے بننے لگی کہ کہیں نیاز مجھے یہاں تنہا چھوڑ کر نہ چلا جائے..

مجھ میں کچھ تاب نہ تھی اس جبل کی گھاٹی کی گود میں پوشیدہ اس صحن میں تنہا رہنے کی.. میں یہاں اس مقام پر اکیلا نہیں رہ سکتا تھا.. جی نہیں سکتا تھا.. مجھے اتنا خوف آیا یہاں کی تنہائی سے..

''صاحب..'' نیاز ایک جانب لاتعلق کھڑا تھا.. اُسے اس مقام میں کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی اور نہ اُس کے اندر کوئی ڈر تھا کہ وہ جانے کب سے جبلِ نور کا باسی تھا'' آپ نفل ادا کر لو.. غار خالی ہے..''

میں نے ابھی تک غار کی جانب نظر بھر کر نہ دیکھا تھا.. جان بوجھ کر غافل سا رہا تھا..

مجھے تاریکی میں ایک کھوہ سی نظر آئی اور اس کے فرش پر سفیدی سی نظر آئی جو سنگ مرمر کی چند سلیں تھیں..

غارِ حرا دراصل.. لغوی معنوں میں ایک غار نہیں ہے..

غاریں تو ایک خاص ہیئت ایک مخصوص شکل رکھتی ہیں اور مدتوں سے غاروں کے طور پر پہچانی جاتی ہیں.. جیسے موہڑا مرادو کی خانقاہ کے کھنڈروں کے عین اوپر پہاڑوں میں ٹیکسلا کی وادی میں ایک واضح غار ہے جس میں ہزاروں چمگادڑیں قیام کرتی ہیں اور وہ غار جانے کہاں اختتام پذیر ہوتی ہے.. یا فرانس اور سپین کی غاریں ہیں جن میں قدیم عہد کے انسان کے مصوری کے نمونے محفوظ ہیں..

اصحاب کہف کی غار تھی..

یہ غار وہی نہ تھی..

پچھلے زمانوں میں.. شاید لاکھوں برس پہلے کے زمانوں میں کسی زلزلے کے نتیجے میں.. کسی قدرتی آفت کے اتھل پتھل کے باعث.. جیسے یہاں تک آنے والی سرنگ وجود میں آئی تھی تقریباً ایسے چند بہت بڑی بڑی چٹانیں گر گئیں.. یا انہوں نے مقام چھوڑا اور جب وہ ساکت ہوئیں تو ان کے درمیان میں کچھ جگہ بن گئی.. ایک کھوہ وجود میں آ گئی... بے ترتیبی سے اوندھے سیدھے پڑے پتھروں اور

چٹانوں میں ایک خلا سا پیدا ہوا.. چنانچہ حرا کی پہاڑی کی ڈھلوان پر اس کھوہ نے جنم لیا.. جسے ایک باقاعدہ غار نہیں کہا جا سکتا..

اس کے اندر اتھاہ تاریکی تھی..

میں اس میں.. اس کھوہ میں قدرے جھک کر احتیاط سے اندر داخل ہوا کہ جو پتھر اسے ڈھکتا تھا وہ بھی جھکا ہوا تھا اور اس کے ساتھ سر ٹکرا سکتا تھا..

فرش کے کچھ حصے پر سنگ مرمر کی معمولی سلیں نصب تھیں جو تاریکی میں سفید نظر آتی تھیں اور ان پر ایک بوسیدہ مصلیٰ بچھا تھا جو لاکھوں نہیں تو ہزاروں نفل پرست افراد کے گھٹنوں اور سجدوں سے بوسیدہ ہوا تھا..

میں نے اپنے تھیلی رک سیک میں سے وہ مصلیٰ نکالا جو میری بہو رابعہ نے مجھے عطا کیا تھا اور وہ اسے بہت عزیز اس لیے رکھتی تھی کہ اس کے والد نے خانہ کعبہ میں بہت ساری راتیں اسی مصلیٰ پر عبادت میں گزاری تھیں.. اس کی کلر سکیم میں نیلاہٹ کے مختلف شیڈ ہیں.. گہرے سمندر نیلے سے آسمانی نیلاہٹ اور پھر نیل کھلے نیلے تک سب پرتو ہیں.. اور دونوں جانب سرو کے درختوں کی شبا ہتیں بلند ہوتی ہیں..

میں نے اس جائے نماز کو غارِ حرا کے فرش پر پہلے سے بچھے بوسیدہ مصلیٰ پر بچھایا اور.. منہ قبلہ کعبہ شریف.. اور اسے اتفاق کہیے یا مشیت.. کہ کعبہ غار میں کھڑے شخص کے عین سامنے کے رُخ پر ہے.. دائیں یا بائیں جانب بھی ہو سکتا تھا.. پشت پر بھی ہو سکتا تھا.. لیکن نہیں ہے.. سامنے جہاں غار کی تاریکی ختم ہوتی ہے اُس جانب ہے... میں اقرار کر لوں کہ نفل ادا کرتے ہوئے غرق نہ ہوا.. مگن نہ ہوا بلکہ مصلیٰ پر سجدے کے مقام پر نظر رکھنے کی بجائے اس نظر کو بار بار بھٹکا کر سامنے غار کے آخر کو غور سے تکتا رہا.. وہاں ایک چھوٹی سی دراڑ تھی جس میں سے رات کی سیاہی میں کچھ روشنیاں تو دکھائی دیتی تھیں لیکن جیسا کہ روایت میں چلا آیا ہے خانہ کعبہ دکھائی نہ دیتا تھا.. یہ عین ممکن ہے کہ تب دکھائی دیتا ہو اور چودہ سو برس کے دوران چٹانوں اور پتھروں کے کسی قدرتی تغیر کے باعث کھسکنے سے اب وہ دکھائی نہ دیتا ہو..

نفل ادا کرتے ہوئے مسلسل مسکراہٹ میں تھا..

مگن نہ تھا مسکرا رہا تھا..

کیوں؟..

اس لیے کہ کہاں وہ ایام تھے.. حج کے دن تھے جب میں اس غار کی چھت پر بیٹھا اُن پر حسرت کی نظر کرتا تھا جو صحن میں بھرے پڑے تھے اور اس ایک فرد سے حسد کرتا رکھتا تھا جو غار کے

اندر ہاتھ باندھے کھڑا ہوتا تھا اور کہاں یہ شب تھی کہ میں تنہا تھا انجمن میں.. اور صحن میں صرف نیاز تھا جو اپنی لاتعلقی اور خاموشی کی بنا پر نہ ہونے کے برابر تھا اور میں کیسے اطمینان اور سکون سے غارِ حرا میں نفل پڑھ رہا تھا.. اور نہ ہی کوئی اپنی باری کے لیے بے چین منتظر مجھے دھکیلتا تھا.. بس میں تھا..

شاید مجھ سے یہ توقع وابستہ کرلی جائے کہ اب میں اُس الوہی کیفیت کو بیان کروں گا جو مجھ پر مقام اقراء میں جو میرے حضورؐ کا بسیرا تھا.. آس پاس کے پتھروں میں اُن کے لمس کی حدت تھی وہاں مجھ پر طاری ہوئی.. ایسا ہرگز نہ ہوا اس لیے میں کیسے بیان کروں.. میں نے وہ دو نفل مسکراتے ہوئے اور پُرمسرت کیفیت میں ایسے ادا کیے جیسے میں سنو لیک پر ہوں.. کرومبر جھیل کے کنارے ہوں.. فیری میڈو کے جنگل میں ہوں جہاں صرف خوبصورتی ہے اور میں اس خوبصورتی کے سامنے سر جھکا کر اس کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے اُسے میرے لیے تخلیق کیا ہے..

نہ خیال تھا کسی ثواب کا نہ آخرت میں لیے جانے والے حساب کا..

بے شک اس میں بہت مبالغہ ہے کہ.. وہ شمع جس نے اجالا کیا چالیس برس تک غاروں میں.. کہ غار ایک ہی تھی جو یہ غار تھی.. اور دو چار برس چالیس برس تو ہرگز نہیں.. شاعر ردیف قافیے کی قید میں مجبور حقائق سے.. تجاوز کر جاتا ہے لیکن نثر نگار کو یہ سہولت حاصل نہیں ہوتی اُس نے تو وہی بیان کرنا ہوتا ہے جو حقیقت اور مشاہدے پر مبنی ہوتا ہے.. اُس کا انداز بیاں شاعر کی مانند شوخ نہیں ہوتا لیکن دل پر اثر کرنے کی سچائی سے لبریز ہوتا ہے..

تو میں اس غار میں تھا جسے ایک شمع نے اُجالا تھا..

میں شعوری طور پر کوئی بھی کیفیت اپنے آپ پر طاری نہیں کرنا چاہتا تھا.. اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں.. کہاں ہوں.. جو کچھ ہوتا ہے خود ہو اس میں میرا کچھ عمل دخل نہ ہو.. جب سلام پھیر کر اٹھا اور مڑ کر دیکھا تو نیاز کے سوا صحن میں اب بھی کوئی نہ تھا میں نے پھر سے ہاتھ باندھ لیے..

مزید نوافل کے بعد میں مصلے سمیٹنے کو تھا کہ پھر کچھ خیال آیا پیچھے دیکھا تو صحن ابھی تک ویران.. کوئی بھی میرے غار سے نکلنے کا منتظر نہ تھا.. میں نے پھر سے نیت کر لی.. یعنی جب تک سورج چمکتا ہے اتنی دیر تک تو اپنی دکان سمجھا لو..

میں اگرچہ ایک حالت سکون میں تھا.. گہرے اطمینان میں تھا اور مسکراہٹ ابھی تک میرے ہونٹوں سے رخصت نہ ہوئی تھی لیکن یہ سب کچھ عارضی ثابت ہوا.. یکدم مجھے اس ویران اور تاریک چٹانی آماجگاہ کے اندر پوری رات بسر کرنے کے خیال سے وحشت ہونے لگی.. میں پھر سے خوف کا شکار ہونے لگا.. وہ ڈر پھر سے میرے اندر جڑیں پکڑنے لگا کہ اس مقام پر.. جہاں حضورؐ کھڑے ہوا کرتے تھے میں

کھڑا ہوں.. جہاں جبریلِ امین آتے تھے.. تو میں کیسے ایک رات یہاں "سہہ" سکوں گا.. میں ایک ڈرپوک شخص ہوں.. مجھ میں نہ وہ وابستگی ہے اور نہ اُجالا جس کی روشنی میں مجھے یہاں سب کچھ دکھائی دیتا رہتا.. میں تو اندھیروں میں بھٹکنے والا تھا مجھے یہاں کچھ دکھائی نہ دے گا.. یہ میرے بس کی بات نہ تھی.. میں کسی مقام پر.. بے شک ویران ہو تاریکی میں جا چکا ہو وہاں تھوڑے بہت ڈر اور خدشے کے ساتھ رات گزار سکتا تھا لیکن کسی مقام پر.. اس مقام پر نہیں.. یہاں تو میرے ساتھ جانے کیا ہو جائے.. میرا تو کلیجہ پھٹ جائے رعب اور دہشت سے.. چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ آرزو پوری ہو گئی.. اطمینان سے کچھ وقت غارِ حرا میں گزار لیا تو بہتر یہی ہو گا کہ رات گزارنے کا ارادہ ترک کر کے یہاں سے نکل جاؤں.. تاریکی کی وادی میں کسی نہ کسی طرح ایک ڈیڑھ گھنٹے میں نیچے پہنچ جاؤں گا بلکہ نیاز سے درخواست کروں گا کہ وہ بھی میرے ساتھ چلے میرا ہاتھ تھام کر دامن تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہو.. اور ایک مرتبہ نیچے پہنچ جاتا ہوں تو وہاں سے ٹیکسی کا حصول دشوار نہ ہو گا اور میں مزید ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد جدہ پہنچ جاؤں گا.. اپنے گھر میں.. جہاں چکن نوڈل کا ڈنر میمونہ رابعہ اور کلجوق میرے منتظر ہیں..

انسان بھی کیسا خود غرض ہوتا ہے کہ حضورؐ کے گھر میں رات بسر کرنے کی بجائے اپنے گھر کو فوقیت دیتا ہے..

چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا.. جوگرز پہن لیے.. مصلے سمیٹ کر پھر سے رُک سیک میں رکھ لیا اور وہ کے کچھ گھونٹ حلق میں سے اُتار کر صحن میں آ کر اس کی دیوار کے ساتھ لگ کر جبلِ نور کے دوسری جانب جو وادیاں اندھیرے میں اُتری ہوئی تھیں.. اور جہاں اب روشنیاں بڑھتی جاتی تھیں اُنہیں دیکھنے لگا.. سامنے جو پہاڑ تھے وہ تاریکی میں زندہ لگتے تھے.. سانس لیتے ہوئے اور قریب آتے ہوئے محسوس ہوتے تھے جیسے غارِ حرا کے ساتھ اُن کا انسیت کا رشتہ ہو.. وہ مدتوں سے آشنا ہوں.. حضورؐ جب غار سے نکل کر یقیناً اسی صحن میں.. آتے تھے اور ان زمانوں میں اس کی دیوار نہ تھی تو انہوں نے یقیناً یہیں کھڑے ہو کر سامنے انہی پہاڑوں پر ایک "شخص" کو آسمان تک بلند ہوتے دیکھا تھا اور وہ گھبرا کر اپنا رُخ بدلتے تھے تو وہ "شخص" وہیں نظر آنے لگتا تھا.. اور ورقہ بن نوفل تھے جنہوں نے حضورؐ کی پریشانی دور کی اور بتایا کہ وہ شخص جبریل تھے.. اگر یہاں غارِ حرا نہ ہوتا.. میرے سامنے صرف یہ پہاڑ ہوتے تب بھی مجھ میں ہمت نہ ہوتی کہ ان کے سامنے ایک رات بسر کروں..

مختصر صحن میں بہت تاریکی تھی..

جبلِ نور کا وہ رُخ جو وادی کعبہ کی جانب تھا اور جدھر بنگالی بابا براجمان تھا.. وہ تو وادی میں روشن بستیوں کے طفیل ہلکی سی روشنی میں نہایا لگتا تھا.. پتھروں اور چہروں کی پہچان ہو جاتی تھی لیکن اِدھر..

جدھر غارِ حرا واقع تھی جبل کا یہ رُخ پورے کا پورا تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا..

یکدم خیال آیا کہ بھائی یہ تم کیا کر رہے ہو.. بیکار کھڑے انگلیاں چٹخا رہے ہو.. غارِ حرا خالی ہے اور تم اُس کی جانب پشت کیے لاپروائی برتتے اُدھر اُن پہاڑوں کو تکتے جاتے ہو جن پر جبریل آئے تھے اور جن کے لیے آئے تھے ان کے گھر سے غفلت برتتے ہو.. چنانچہ میں شرمندہ سا ہو کر پھر غار میں گیا اور اُسی بوسیدہ جائے نماز پر کھڑے ہو کر منہ دل کعبے شریف..

غار کے آخر میں کہ یہ تنگ ہوتا چلا جاتا تھا جو شگاف تھا اُس میں سے دکھائی دینے والی روشنیوں میں اب زیادہ روشنی تھی کہ تاریکی کے بڑھنے سے اُن کی لو تیز ہو رہی تھی..

میرا تپتی تھیلا صحن میں پڑا تھا..

نیاز چٹان کے ساتھ ٹیک لگائے خاموش بیٹھا تھا..

وہ کیوں میرا ساتھ دے رہا ہے.. اُسے مجھ سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے.. یہاں ہزاروں ہر روز آتے جاتے ہیں میں اُن میں سے ایک تھا.. کیا اُسے مجھ سے کچھ غرض تھی.. اُس نے یونہی تو اپنے آپ کو میرے لیے وقف نہیں کر دیا تھا.. ایسے مقامات پر انسان کتنی دیر بے غرض رہ سکتا ہے.. لیکن مجھے وہ غرض والا لگتا نہ تھا.. مجھے لگتا تھا کہ وہ بنیادی طور پر ایک ہمدرد اور ملنسار شخص ہے.. اُس کے دل میں مجھ سے کچھ حاصل کرنے کا کچھ لالچ نہ تھا..

''نیاز..''

''جی صاحب..'' وہ ذرا قریب ہو گیا..

''چلیں؟''

''اگر ٹھہرنا ہے تو ابھی ٹھہرو.. آپ کی مرضی ہے..''

''نہیں چلنا چاہیے..''

''تو چلیں..''

''نیاز.. کیا آپ مجھے نیچے تک لے جاؤ گے..'' کہنا تو میں یہ چاہتا تھا کہ اگر آپ مجھے نیچے تک لے جاؤ گے تو میری جیب میں کچھ ریال ہیں لیکن میں کہہ نہ سکا..

''کیوں نہیں تارڑ صاحب.. میں ساتھ چلوں گا آپ کے.. اس ٹیم نیچے جانا ذرا مشکل ہوتا ہے.. ہم تو آتے جاتے رہتے ہیں.. یونہی بھی تھوڑی دیر میں مجھے ویسے بھی نیچے جانا ہے کھانا کھانے کے لیے.. بنگالی بابا کا بھی کھانا اوپر لانا ہے تو آپ کو بھی ساتھ لے جاؤں گا.. چلیں..؟''

''ابھی کچھ دیر ٹھہر لیتے ہیں.. پھر چلتے ہیں..''

''ٹھیک ہے صاحب..'' وہ پھر چٹان کے ساتھ ٹیک لگا کر اس کا ایک حصہ بن گیا..

جونہی نیاز نے مجھے نیچے لے جانے پر رضامندی کا اظہار کیا میں ایک عجیب افسردگی میں چلا گیا.. ابھی چند لمحے پیشتر میں اپنی آرزو کی تکمیل پر مسکراتا خوش تھا... اور ابھی ایسا آزردہ ہوا جیسے اس جہان میں میرا کوئی نہ ہو.. ایسی آزردگی میں مبتلا ہو گیا..

جیسے لیٹری میڈو کے جنگل میں کھلنے والے سٹرابیری کے پہلے سفید پھول کو دیکھتے آپ نہیں تھکتے اور اس سے بچھڑنا نہیں چاہتے..

جیسے سنولیک کی رات میں اُس پر سفید ہنس تیرتے ہیں تو آپ نے اس منظر سے جانا ہوتا ہے لیکن جانا نہیں چاہتے..

''نیاز آپ تو برسوں سے ادھر ہو.. تو یہاں غارِ حرا میں لوگ پوری رات بھی بسر کرتے ہیں؟'' میں نے نہایت لاتعلقی سے دریافت کیا..

''نہیں صاحب.. فجر کے وقت آ جاتے ہیں.. کبھی مغرب تک ٹھہر کر چلے جاتے ہیں.. کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ساری رات آنا جانا لگتا رہتا ہے لیکن ادھر رات بھر کے لیے کوئی نہیں ٹھہرتا.. یہاں کیا کرے گا پوری رات ٹھہر کر..''

''ہاں نیاز.. نفل ادا کر لیے.. زیارت کر لی.. چند پتھروں کو چوم لیا تو پھر اس کے بعد یہاں رات بسر کرنے سے کیا فائدہ..'' میں اپنے فیصلے کو خود ہی تقویت دینے کی کوشش کر رہا تھا.. ''تو یہاں آج تک.. جب سے تم یہاں ہو کسی نے رات بسر نہیں کی؟''

وہ سوچ میں پڑ گیا.. ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے تاریکی میں گم تھے اس لیے میں اُس کے چہرے سے یہ اندازہ نہیں لگا رہا تھا کہ وہ سوچ میں ہے بلکہ اُس کی جانب سے جو خاموشی تھی وہ مجھے اطلاع کرتی تھی کہ وہ کچھ حساب کتاب میں مصروف ہے..

''ہاں... دو لوگ آئے تھے وہ یہاں ٹھہرے تھے..''

''کہاں سے آئے تھے..''

''پاکستان کے تھے.. بہاولپور سے آئے تھے.. وہ یہاں دو تین دن ٹھہرے تھے.. دن کے وقت چونکہ یہاں بہت لوگ ہوتے ہیں اس لیے وہ اوپر چھجے تلے سوئے رہتے.. اور رات کے نیم ادھر آ جاتے اور پوری رات عبادت میں گزارتے.. یہ کوئی چھ سات سال پہلے کی بات ہے.. اُن کے بعد ادھر کوئی نہیں ٹھہرا..''

''کیا میں.. یہاں رات بسر کر سکتا ہوں؟''

''نیچے نہیں جائیں گے؟''

''وہ تو جاؤں گا.. یونہی پوچھ رہا ہوں کہ اگر میں ٹھہر جاؤں تو کوئی خطرہ تو نہیں.. کوئی پابندی تو نہیں؟''

''نہیں جی..''

''پولیس وغیرہ تو تنگ نہیں کرتی؟''

''کبھی کبھی کرتی ہے صاحب.. اِدھر جو لوگ ہیں وہ تقریباً سب کے سب غیر قانونی ہیں تو پولیس ہمارے کو پکڑنے کے لیے جب اوپر آتی ہے.. اور اوپر آنا کوئی آسان تو نہیں تو کم ہی آتی ہے.. اگر آ جائے تو ہمیں پہلے سے خبر ہو جاتی ہے تو ہم اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں.. کچھ غار میں چھپ جاتے ہیں..''

''غارِ حرا میں؟''

''نہیں جی سب سے پہلے تو اسی کی تلاشی ہوتی ہے یہاں کون چھپ سکتا ہے.. اِدھر اسی جانب جبلِ نور کی ڈھلوان میں ایک اور غار ہے جس کا صرف ہمیں پتہ ہے.. وہاں!''

''یعنی کوئی خاص خطرہ نہیں.. پابندی نہیں حکومت کی جانب سے.. یعنی اگر میں چاہوں تو رات یہاں بسر کر سکتا ہوں؟''

''آپ یہاں رہنا چاہتے ہو.. نیچے نہیں جاؤ گے..''

''نیچے جاؤں گا.. لیکن یونہی معلومات حاصل کر رہا ہوں..''

''تو رہ جاؤ.. کوئی مسئلہ نہیں.. لیکن یہاں کرو گے کیا.. نفل پڑھ لیے ہیں تو رات رہ کر کیا کرو گے..''

نیاز جو ایک عرصے سے یہاں آتا جاتا تھا اُس کے لیے یہ محض چند پتھر تھے..

روزی کا وسیلہ تھے..

اور ہاں غارِ حرا کو ڈھکتے.. اس کو دیوار کرتے جو بڑے بڑے چار پانچ پتھر تھے ان سب کو اذیت دی گئی تھی.. اُن پر بہت بھونڈے انداز میں ''مکہ حرا'' پینٹ کیا گیا تھا.. اتنے بڑے پینٹ سے کہ اگر وہ پتھر بول سکتے تو ضرور احتجاج کرتے کہ ہم پر تم لوگوں نے کیمیائی سرخ اور سبز رنگ میں جو یہ بے پھیرے ہیں ہمیں آلودہ کیا ہے تو کیا تم نہیں جانتے کہ پینٹ سے تم نے ہمارے وہ مسام بھی بھر دیے ہیں جن میں ہم نے حضورؐ کے سانس [illegible] مسام تھے.. سنبھال رکھے تھے.. ہم پر جہاں جہاں اُن کا لمس محفوظ تھا.. تم نے اس لمس پر برش پھیر دیا.. ہمیں اُن کی ہتھیلیاں شہد تھیں اور تم نے اُن کو مٹا دیا.. ملیا میٹ

کر دیا.. کیسے لوگ ہو.. دن کے وقت تو یہ آلودگی بہت دُکھ دیتی تھی.. واضح اور عیاں ہوتی تھی البتہ رات میں وہ تاریکی میں گم ہوتی تھی اور صرف پتھروں کے ہیولے نظر آتے تھے..

اگر نیاز یہ دریافت کرتا تھا کہ ان پتھروں میں رات رہ کر کرو گے کیا تو میں اُسے موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا تھا..

وہ ایک مدت سے یہاں رہتا تھا..

یہ پتھر اس جیسے لوگوں کا روزگار تھے..

اور یوں بھی طویل قربت عقیدت کو ختم کر دیتی ہے..

پردہ اُٹھ جائے تو جنوں کم ہو جاتا ہے..

دوری ہی اُس طلسم کو تخلیق کرتی ہے جس کا میں شکار تھا..

ناآسودگی ہی عشق آتش کو مزید بھڑکاتی ہے..

وصل میں طوالت گرمئی جذبات کو سرد کر دیتی ہے..

فرض کیجیے اگر میں بھی جبلِ نور کا باسی ہوتا.. برس ہا برس سے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کی خاطر اوپر آنے والے زائرین کے صدقہ خیرات کا طالب ہوتا.. صرف پانی پینے کی خاطر مجھے اس کوہ کے دامن تک اُترنا پڑتا.. کھانا بھی وہیں سے میسر ہوتا.. دن بھر تیز دھوپ میں بھاگ دوڑ کرتا اور رات کے وقت کھلے آسمان تلے پتھروں پر نیند میں جانے کی سعی کرتا تو.. میرے لیے بھی یہ محض پتھر ہو جاتے.. تو نیاز کو جو حیرت ہوئی تھی کہ یہاں رات رہ کر کیا کرو گے تو اُس حیرت کا سبب تھا۔

''کرنا کیا ہے نیاز.. میں تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر اس وقت نیچے چلا جاؤں تو کیا پتہ کوئی ٹیکسی میسر ہو یا نہ ہو.. اگر مل بھی جائے تو بہت دیر میں جدہ پہنچوں گا اور خواہ مخواہ بھورائی کو ڈسٹرب کروں گا.. تو صرف اس لیے سوچ رہا ہوں کہ یہیں سو جاؤں.. اور پھر صبح سویرے نکل جاؤں.. کیا خیال ہے..''

''رہنا چاہتے ہو تو رہ جاؤ..''

نیاز ایک دبلا پتلا ایک نیاز مند اور مددگار خصلت والا نوجوان تھا..

''لیکن تم یہ بتاؤ کہ رات کے وقت تم کہاں سوتے ہو؟''

''کبھی نیچے بھی چلا جاتا ہوں.. چوٹی سے اُدھر ذرا نیچے.. جہاں سیڑھیوں کا اختتام ہوتا ہے وہاں تھوڑی سی ہموار جگہ ہے اور کھلی فضا میں ہے کبھی وہاں سو جاتا ہوں.. دو تین اور لوگ بھی ہوتے ہیں..''

''اِدھر اس صحن میں نہیں سوتے؟''

تاریکی میں بھی اُس کی مسکراہٹ عیاں ہونے لگی ''ادھر تو بند جگہ ہے.. کھلی نہیں.. ادھر تو صاحب بہت گرمی ہوتی ہے.. اوپر وہاں ہوا لگتی ہے.. آرام سے نیند آ جاتی ہے۔''

''ادھر کبھی نہیں سوئے.. کوئی نہیں سوتا..''

''نہیں.. ادھر ہوا نہیں..''

''اچھا۔'' میں نے صرف اتنا کہا..

وہ اگرچہ نیاز مند خصلت کا تھا لیکن مجھے محسوس ہوا کہ وہ کچھ بیزار تو نہیں بے چین ہو رہا ہے

''صاحب آپ اس ٹیم نیچے نہیں جانا چاہتا تو بے شک نہ جاؤ.. ادھر سو جاؤ.. میں آپ کو ادھر جو ہموار اور کھلی جگہ ہے وہاں لے چلوں گا اُدھر آرام سے سو جاؤ.. ادھر تو نیند نہیں آئے گا.. گرمی بہت ہے..''

میں اُسے سمجھا نہیں سکتا تھا.. اور اُس کی ناسمجھی میری سمجھ میں آتی تھی کہ میں محض رات گزارنے کی خاطر ادھر نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا.. غارِ حرا سے الگ ہو کر جبلِ نور کی کسی گھاٹی میں جو ہموار اور کھلی جگہ ہے وہاں ایک نسبتاً آرام دہ ہوا لگتی رات نہیں گزارنا چاہتا تھا..

یہاں اس مقام پر.. اس کھوہ کے اندر جہاں ہوا کا ایک جھونکا بھی نہیں آتا.. جہاں شاید کیڑے مکوڑے اور بچھو بھی رینگتے ہوں یہاں رات گزارنا چاہتا تھا..

چاہتا تو یہی تھا لیکن دہشت میرا دامن نہ چھوڑتی تھی.. مجھے ایک سہارے کی ایک موجودگی کی تلاش تھی جو مجھے ہمت دے اور وہ صرف نیاز مہیا کر سکتا تھا..

''یار نیاز.. میں یہاں رہنا چاہتا ہوں.. یہاں... اگر آپ یہ مہربانی کرو کہ آج کی رات یہیں اس صحن میں سو جاؤ گے تو میں رہ جاتا ہوں ورنہ چلا جاتا ہوں..''

''ادھر تو بہت گرمی ہوگی.. ہوا بالکل نہیں ہوگی..''

''بے شک نہیں ہوگی.. لیکن میں ادھر ہی سونا چاہتا ہوں.. اگر تم میرا ساتھ نہیں دو گے تو پھر نہیں.. پھر مجھے نیچے جانا پڑے گا..''

ایک.. ''یہاں ہی کیوں سونا چاہتے ہو''.. اُس کے لبوں پر آتا آتا رہ گیا.. شاید وہ میرے بارے میں کچھ تشویش میں بھی مبتلا ہوا کہ یہ کیسا شخص ہے.. کہیں کوئی سر پھرا تو نہیں.. ''اکیلا کیوں نہیں سو سکتا اگر ادھر ہی سونا ہے..''

''دراصل مجھے یہاں رات گزارنے کے خیال سے خوف آتا ہے.. میں ڈرتا ہوں..''

''ڈر کیسا صاحب.. وہاں اوپر ہم لوگ ہوں گے اور ادھر کوئی خطرہ نہیں میں نے آپ کو بتایا ہے..

''پھر بھی..''

نیاز کچھ بولا نہیں.. اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہاں خوف کھانے کی یا ڈرنے کی کیا بات ہے.. کچھ پتھر ہیں آڑے ترچھے.. جن کے اندر کھوہ ہے.. پھر اُس نے ایک معصوم بچے کی مانند ہنستے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے صاحب.. آپ مہمان ہیں.. میں ادھر آ جاؤں گا.. ادھر سو جاؤں گا.. زمین پر ہی سونا ہے تو ادھر کیا اور ادھر کیا.. لیکن گرمی ہوگا..''

میرا خیال ہے کہ میں بھی ایک معصوم بچے کی مانند ہی مسکرایا.. میرے سینے پر جو بوجھ تھا.. غارِ حرا کے بھاری پتھروں کا وہ ہٹ گیا.. ایک چھوٹا سا دیا جلا جس کی مٹی سی لو نے میرے من مندر کو روشن کر دیا.. میں یہاں تسلیم کرنا چاہتا ہوں کہ میں اس لمحے تک حالت انکار میں تھا.. اور یہ صرف نیاز تھا جس کے جادو بھرے تسلی بھرے لفظ مجھے اقرار تک لے آئے ورنہ میں تو فرار ہونے کو تھا.. بھگوڑا ہو جانے کو تھا.. اگر وہ ادھر سو جاؤں گا.. نہ کہتا تو میں کچھ دیر بعد یقیناً جبلِ نور سے اُتر آتا..

''تمہیں تکلیف تو ہوگی نیاز..'' میں کبھی کسی شخص کا اتنا شکر گزار نہیں ہوا جتنا کہ اُس لمحے ہو رہا تھا اور میں اظہار نہیں کر پا رہا تھا.. ''دراصل میں یہاں آیا ہی اس نیت سے تھا.. اس تتی تھیلے میں رات گزارنے کا سامان لایا تھا.. بہت بہت شکریہ..''

جب یہ فیصلہ ہو گیا بوجھ اتر گیا.. میں آج کی رات یہیں بسر کروں گا اور نیاز اپنا بوریا بستر یہاں لے آئے گا اس صحن میں تو.. میں جھیل سرال کی سطح پر ہلکورے لیتا ایک پَر تھا.. کسی راج ہنس کا.. پانیوں کی ٹھنڈک پر تیرتے امن میں تھا شانتی میں تھا.. خلاء میں ڈولتے ایک خلاباز کی مانند بے وزن تھا اور اپنی بے وزنی سے عجیب کیف حاصل کر رہا تھا..

میرا تتی تھیلا صحن کے ایک کونے میں پڑا تھا.. کیا اسے اٹھا کر ابھی سے غار کے اندر رکھ دوں یا کچھ صبر کروں.. غار کا گھر خالی پڑا ہے تو ابھی اس میں آباد ہو جاؤں یا.. کچھ صبر کروں.. جب آپ کسی حیرت کدہ منظر میں سے گزرتے ہیں.. کسی پہاڑی مسافت کے دوران تو آپ اُسے کسی اور نظر سے دیکھتے ہیں اور جب وہی منظر آپ کی شب کی قیام گاہ ہو.. آپ نے رات بھر وہاں ٹھہرنا ہو.. اُس پر معلق آسمانی گنبد کو اُسی رات میں دیکھتے رہنا ہو.. اگر ستارے نمودار ہوں تو اُنہیں اور ماہتاب اُبھرے تو اُسے.. اور طلوع کے رنگوں میں آنکھیں کھولنی ہوں تو پھر اسی منظر کو آپ کسی اور اپنائیت اور قیام کی نظر سے دیکھتے ہیں.. ابھی کچھ دیر پہلے یہی امکان تھا کہ میں سرسری گزرنے والوں میں سے تھا اس لیے غارِ حرا کو اس کے صحن کو اور طرح سے نظر میں بھرتا تھا اور اب یہاں رہائش کی صورت نکل آئی تھی تو یہ

ایک گھر لگنے لگا تھا..

میں صحن کی واحد دیوار کے پتھروں پر کہنیاں جمائے کبھی سامنے کے پہاڑوں پر نظر کرتا تھا اور کبھی کھائی میں جھانکتا تھا..

ادھر سے جبل نور کے اس رُخ سے.. اس کھائی کی جانب سے کوئی شخص اوپر نہیں آ سکتا تھا.. جب تک کہ وہ چٹانوں پر چڑھنے کے آلات سے لیس نہ ہو اور اُن زمانوں میں تو یہ ایجادات نہ ہوئے تھے.. انحصار ہمت اور قدموں کی استقامت پر ہوتا تھا.. یوں بھی اگر دوسری جانب وادیٔ مکہ کی جانب سے یہاں تک آنا ممکن تھا تو کوئی شخص ادھر سے کیوں آئے گا.. میں کوہ پیمائی کے یہی حساب کتاب کر رہا تھا اندازے لگا رہا تھا جب یوں جھانکتے ہوئے نیچے چٹانی ڈھلوان پر نیم تاریکی میں دو چار لمبی دُموں والے میرے ہم شکل جانور نظر آئے.. جو کبھی اس پتھر پر اور کبھی اُس چٹان پر کودتے پھلانگتے نظر آتے اور وہ نظر تو بندر ہی آتے تھے..

لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ وہاں بندر ہوتے..

جبل نور کی گھاٹیوں میں اور پتھروں پر اُچھلتے کودتے.. وہاں بندر کیسے ہو سکتے تھے.. اگر ہوتے تو کوئی نہ کوئی تو اُن کا ذکر کرتا.. تو اُن کا ذکر کیوں نہیں آیا.. پھر مجھے رچرڈ برٹن کا حوالہ یاد آیا کہ حضورؐ کے زمانے میں وادیٔ مکہ کی گھاٹیوں میں نہ صرف بندر ہوتے تھے بلکہ بڑے بڑے بن مانس یا گوریلے بھی پائے جاتے تھے.. تب مجھے یہ حوالہ بہت عجیب سا اور کسی قدر ناقابلِ یقین لگا تھا لیکن اب میں اُنہی بندروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ میں وادیٔ مکہ کی ایک کھائی کے اوپر ہی تو یہ نظارہ کر رہا تھا..

جانے کسی بھی زائر نے.. کسی حاجی بابا نے ان کا تذکرہ کیوں نہیں کیا.. اُن میں سے کچھ نے تو انہیں دیکھا ہوگا.. شاید اس لیے کہ بندروں کا اس مقام پر ہونا اُن کے عقیدت سے سرشار بدن کو اور روحانی جذبات کو مجروح کرتا تھا ورنہ اُن کا تذکرہ کرنے میں کیا مضائقہ تھا..

میں نے مڑ کر نیاز سے رجوع کیا "یہ نیچے بندر ہیں ناں؟"

"ہاں صاحب.." اُس نے وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا..

"ادھر جبل نور پر رہتے ہیں؟"

"جی.. ادھر ہی ہوتے ہیں.. سب لوگ ان سے بڑے عاجز ہیں صاحب.. سامنے رکھا کھانا اٹھا کر لے جاتے ہیں اور ہم انہیں کچھ بھی نہیں کہہ سکتے.. حرم کے علاقے میں رہنے والے بندر ہیں.. صاحب یہ جو غارِ حرا کے داخلے کے برابر میں جو بڑا پتھر ہے لوگ نفل ادا کرنے سے پہلے اس پر ہاتھ کا سامان اور کھانے کے تھیلے رکھ دیتے ہیں تو کئی بار ایسا ہوا کہ یہ بندر وہ سامان اور خاص طور پر کھانے

اٹھا کر نیچے کھائی میں کود جاتے ہیں.. تو یہاں جو زائرین آتے ہیں ہم اُن کو خبردار کر دیتے ہیں.. کہ سامان کہیں اور رکھو، اس پتھر پر نہ رکھنا.."

"واقعی؟" یہ ایک سراسر اچھوتی اور دلچسپ دریافت تھی.. یقین نہیں آتا تھا.. میں نے پھر دیوار پر سے جھانک کر نیچے دیکھا تو دو چار بندر اٹھکیلیاں کرتے خاصے اوپر آ چکے تھے.. شاید انہوں نے مجھے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا تھا.. وہ خاصے قریب ہو کر ایک چٹان پر براجمان ہو کر یہ ظاہر کرنے لگے کہ وہ مجھ سے غافل ہو چکے ہیں اور وادیٔ مکہ میں پھیلی روشنیوں کو نہایت اطمینان سے دیکھنے لگے..

یعنی یہ غارِ حرا کے آس پاس کی وائلڈ لائف تھی.. جنگلی حیات تھی.. اس سے پیشتر میں نے متعدد بکریاں بھی دیکھی تھیں جو غارِ حرا کے عین اوپر چٹانوں پر چڑھتی اُترتی اور ممیاتی پھرتی تھیں.. کبھی کسی پتھر پر چڑھ کر بالکل ساکت ہو جاتیں.. جانے یہ پالتو تھیں یا بندروں کی مانند آزاد اور وحشی تھیں..

طائف کے بندروں اور بہت پلے ہوئے بندروں کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ یہ ہنومان مہاراج یہاں کیسے آ گئے.. جہاں وہ دیوتا تھے اُس دھرتی کو چھوڑ کر یہاں کیسے آ گئے جہاں وہ محض بندر تھے تو غارِ حرا کے صحن کی دیوار سے نیچے نظر آنے والے بندروں کو دیکھ کر بھی یہی خیال آیا کہ ہنومان مہاراج ہم تو ایک مدت سے آپ کو تیاگ چکے.. مسلمان جیسے کیسے بھی ہیں ہو چکے تو آپ ہمارا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتے بھائی..

ہمارے تعاقب میں یہاں تک چلے آئے ہو غارِ حرا تک! شاید تمہیں ہمارے شک شبہے کا علم ہو گیا ہے.. تمہیں کچھ آس ہے کہ ہم تمہیں پھر سے دیوتا مان لیں گے اس لیے پیچھے پیچھے چلے آئے ہو.. یار یہاں تو ممکن نہیں.. کہیں اور ملاقات ہوتی تو شاید کچھ امکان بھی ہوتا.. اس مقام پر تو نہیں..

ان بندروں کو کوئی تنگ نہیں کرتا.. کوئی نہیں مارتا..

بلکہ بقول نیاز ان کی خدمت خاطر کی جاتی ہے..

محض اس لیے کہ جبل نور حرم کی حدوں میں واقع ہے اور ان حدود کے اندر کسی بھی جانور کو تنگ کرنا.. پکڑنا یا ہلاک کرنا ممنوع ہے تو ہنومان مہاراج اس سہولت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے.. جبل نور پر موج کرتے ہیں.. راج کرتے ہیں بلکہ ہزاروں برسوں سے کر رہے ہیں..

یقیناً حضورؐ نے بھی جو یہاں آتے جاتے رہتے تھے.. طویل مدتوں تک اس غار میں قیام پذیر رہتے تھے تو انہوں نے بھی ان کو دیکھا تو ہوگا.. اور یہ بندر جو میں اب دیکھ رہا ہوں اُنہی بندروں کی نسل میں سے ہوں گے جنہیں حضورؐ نے دیکھا ہوگا.. تو اس حوالے سے یہ بندر بھی میرے لیے تھوڑے سے مہاراج ہو گئے.. میری نظر میں پُروقار ہو گئے.. انہوں نے یقیناً ان پر لطف اور کھانڈرے جانوروں کو بھی

محبت کی نگاہ سے دیکھا ہوگا کہ وہ ایسے ہی تھے.. جانوروں پر جبر کرنے والوں اور انہیں اذیت دینے والوں کو سرزنش کرتے تھے کہ بے شک تم نے عرفات پہنچنا ہے لیکن اپنے اونٹوں کو تیز رفتار کرنے کی غرض سے انہیں چھڑیاں مت مارو.. تم جو انہیں خوبصورت بنانے کے لیے ان کی لمبی گردنوں میں تنگ طوق چڑھاتے ہو ان کو اُتار دو.. انہیں اذیت ہوتی ہے.. اور ایک بار انہوں نے دیکھا کہ اُن کے سیاہ کمبل پر.. کالی کملی پر ایک بلی سوئی ہوئی ہے تو اُسے اٹھایا نہیں.. اُس کی نیند میں خلل نہیں ڈالا.. پاس بیٹھے رہے.. تو انہوں نے یقیناً ان بندروں کو بھی الفت کی نگاہ سے دیکھا ہوگا..

البتہ ہماری اتنی دیر کی تنہائی میں خلل آ گیا

سُرنگ کے اندر سے کچھ ملی جلی آوازیں.. بچوں کی.. بڑوں کی.. خواتین کی آنے لگیں.. کچھ لوگ آ رہے تھے..

یہ ایک پاکستانی کنبہ تھا.. اس سے عام طور پر کوئی نہ آتا تھا لیکن یہ آ گئے تھے.. باتیں کرتے شور کرتے.. جیسے ایک پکنک پر آئے ہوں.. سرنگ میں سے نکل کر صحن میں وارد ہو گئے..

اُنہوں نے پہلے تو نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ غار میں باری باری نوافل ادا کیے اور پھر یادگار کے طور پر ایک کیمرے کے مسلسل اور اس تاریکی میں چندھیا دینے والے فلیش سے پتھروں کے آرام کو مجروح کرتے ہوئے تصویریں اُتارنے لگے.. میری اجازت کے بغیر میری آج کی شب کی قیام گاہ کی تصویریں اُتارنے لگے..

میں نیاز کے برابر میں چٹان کے ساتھ ٹیک لگائے اُن کی رخصتی کا منتظر تھا اور دبکا کھڑا تھا جب ایک فلیش کی بے رحم چندھیاہٹ نے مجھے عریاں کر دیا اور اس کے ساتھ ہی کیمرے کے عقب سے ایک آواز آئی ''اوہو.. آپ تارڑ صاحب تو نہیں..''

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ حج کے دوران میرے لیے یہ ایک صعوبت تھی.. جیسے ایک کوڑھ کا مارا ہوا مریض اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے چھپاتا پھرتا ہے ظاہر نہیں ہونا چاہتا.. یہی میرا حال تھا.. کہ میں پہچانا نہیں جانا چاہتا تھا.. ایک دو بار جب میں نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جی میں وہ نہیں ہوں تو سمیر نے مجھے ڈانٹ دیا کہ ابا کیا کرتے ہو.. حج کے دوران جھوٹ بولتے ہو تو پھر میں احتیاط کرنے لگا..

اس لیے میں نے یہاں بھی فوراً ہی اقرار کر لیا کہ جی.. میں ہوں..

میں تو کہیں نہیں کھسک سکتا تھا اور جو صاحب مجھے دیکھ سکتے تھے انہوں نے نہایت پُر مسرت انداز میں

کہا ''اوئے بچو.. اُدھر دیکھو یہ وہی ہیں.. ان کو پہچانا؟ تمہارے چاچا جی ہیں.. پتہ نہیں یہ کیسے آ گئے ہیں.. کیسے آ گئے ہیں تارڑ صاحب؟.. اوئے ان کے ساتھ تصویریں کھینچو اور غارِ حرا کے سامنے..''

تو میں بے پایاں خوشی کا اظہار کرتا.. ایک جعلی اور عاجزانہ مسکراہٹ لبوں پر منجمد کیے متعدد بچ[ـوں] اور لوگ کے ساتھ متعدد تصویریں کھنچواتا ہوں اور فلیش کی روشنی صحن کے درو دیوار اور غارِ حرا کے پتھروں کا کچھ لحاظ نہیں کرتی.. کیمرہ اور فلیش دونوں یقیناً جاپانی تھے وہ کیا لحاظ کرتے اور مسلمانوں نے چونکہ پچھلے کئی سو برسوں سے ایک نیل کٹر بھی ایجاد نہ کیا تھا اگر ایک کیمرہ اور فلیش ہی ایجاد کر لیتے تو وہ کچھ لحاظ کرتے..

اس فوٹو سیشن کے دوران میں نے نوٹ کیا کہ وہ صاحب جو کیمرہ بردار تھے ایک عدد سیل فون بھی رکھتے تھے اور ہر دو چار منٹ کے بعد کسی نہ کسی رشتے دار یا کاروباری رابطے کو اطلاع بھی کرتے کہ میں اس لمحے غارِ حرا کے صحن میں ہوں اور اطلاع کم کرتے تھے اور ''ہیلو ہیلو'' زیادہ کرتے تھے تو یکدم مجھے خیال آیا کہ اس فوٹو سیشن کے عوض کیوں نہ ان کا موبائل استعمال میں لایا جائے..

''آپ کے سیل فون سے جدّہ میں بات ہو سکتی ہے؟''

''جدّہ تو ادھر پاس ہے تارڑ صاحب.. آپ بے شک پاکستان بات کیجیے..'' وہ جو بھی تھا ایک فیاض دل شخص تھا..

اب تاریکی میں سلجوق کے گھر کا نمبر نہیں مل رہا.. میں تھیلی رُک سیک کو اوندھا کر کے اس میں جتنے بھی کاغذ ہیں انہیں پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ نمبر کہاں لکھا تھا اور وہ نہیں مل رہا..

بالآخر دو تین رانگ نمبر دبانے کے بعد اُدھر سے سلجوق کی آواز آ گئی ''ہیلو'' اور میری جان میں جان آ گئی..

''سلجوق بیٹے.. میں ابو بول رہا ہوں..''

اُدھر سلجوق میری آواز سن کر یکدم نروس ہو گیا کہ اگر اس وقت ابا جی فون کر رہے ہیں تو یقیناً پولیس کسٹڈی میں ہیں.. حوالات میں بند ہیں.. غارِ حرا کے شوق میں پکڑے گئے ہیں اور ایمرجنسی میں فون کر رہے ہیں.. ''آپ.. کہاں ہیں ابو.. ٹھیک تو ہیں..''

''میں بالکل خوش و خرم ہوں بیٹے..''

''بول کہاں سے رہے ہیں؟''

''میں غارِ حرا کے صحن میں ہوں بیٹے..''

''لیکن وہاں فون کہاں سے آ گیا.. ابو آپ کچ تو نہیں؟ آپ کہاں ہیں؟''

میں نے اپنے محسن کی جانب تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسے بتایا کہ فون کہاں سے آ گیا..

’’کیا واقعی؟‘‘ وہ یکدم بحال ہو گیا ’’غارِ حرا کے صحن سے بات کر رہے ہیں؟‘‘

’’ہاں.. واقعی..‘‘

’’کمال ہے..‘‘

اور سوچا جائے تو یہ واقعی ایک کمال کی بات ہے کہ آپ کے گھر فون کی گھنٹی بجے اور وہ فون براہ راست غارِ حرا کے صحن سے آ رہا ہو..

’’تو پھر ابو..‘‘

’’بیٹے یہاں تو بہت رونق ہے.. یہاں تک کہ موبائل کی سہولت بھی میسر ہے تم بالکل فکرمند نہ ہونا.. میں آج کی رات یہیں گزار رہا ہوں.. بہت رونق ہے میرا خیال ہے ساری رات آنا جانا لگا رہتا ہے.. میلہ لگا رہتا ہے.. کوئی پابندی نہیں کوئی خطرہ نہیں تم بالکل بے فکر ہو جاؤ.. اور ہاں امی کا کیا حال ہے؟‘‘

’’ٹھیک ہے.. اپنی بہو سے لاڈ کر رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ تمہارے ابے کا کچھ نہیں ہو سکتا اسے اس کے حال پر چھوڑ دو..‘‘

’’ہاں کچھ نہیں ہو سکتا..‘‘ مجھے تسلی ہوئی ’’میں صبح آ جاؤں گا انشاء اللہ..‘‘

وہ مطمئن ہو گیا.. اور یہی میں چاہتا تھا کہ وہ میرے لیے فکرمند نہ ہو..

وہ پاکستانی خاندان جو سعودیہ میں ہی مقیم تھا شتابی سے فارغ ہو کر اسی طور شور مچاتا پکنک سے لطف اندوز ہوتا ایک ایک کر کے سرنگ میں غائب ہو گیا اور ہم دونوں پھر سے تنہائی میں چلے گئے..

حرا کی غار کمال کی پوشیدگی تھی..

حضورؐ کے زمانوں سے بھی پہلے جو ’’حنیف‘‘ تھے.. جو تلاش میں تھے.. جستجو میں تھے.. معاشرتی اور مروج مذہبی اقدار سے مطمئن نہ تھے ایک بڑے آدرش کے تمنائی تھے تو وہ سب سے الگ ہو کر غور و فکر کی دنیا میں غرق ہونے کے لیے اگر اس بلند مقام میں پناہ لیتے تھے تو یہ قابل فہم تھا.. جبل نور کی چوٹی سے ذرا نیچے ایک عمیق ڈھلوان میں تھوڑی سی جگہ ہموار اور چند آڑی ترچھی چٹانیں منہدم حالت میں ایک دوسرے کے سہارے قائم اور ان میں ایک کھوہ سا جس میں صرف اتنی گنجائش کہ ایک شخص اطمینان سے لیٹ سکے.. بیٹھ سکے.. یا عبادت کر سکے.. پہاڑ کے دامن میں کھڑا کوئی شخص اگر اوپر دیکھے تو قطعی قیاس نہ کر سکے کہ اس کے سامنے جو ایک چٹان نما بلندی جبل کی چوٹی تک اٹھتی چلی جا رہی ہے وہاں کہیں ایک

غار بھی ہو سکتی ہے.. پورے پہاڑ اور غارِ حرا کو تخلیق کرنے والی چند چٹانوں کی رنگت بھی یکساں ہے..

’’نیاز.. اوپر چوٹی پر.. اس صحن میں اور غار میں اور اس کی چھت پر روزانہ اتنی غلاظت آتی ہے تو اس کی آمد سے جو کوڑا کرکٹ جنم لیتا ہے.. وہی پلاسٹک کی بوتلیں.. خالی پیکٹ اور کارٹن‘ کاغذ اور سگریٹ کی ڈبیاں وغیرہ تو اس کی صفائی کے لیے حکومت کچھ کرتی ہے؟‘‘

’’نہیں صاحب.. حکومت کو اس غار سے کوئی دلچسپی نہیں.. وہ تو چاہتی ہی نہیں کہ یہاں کوئی آئے.. اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے.. اس کی صفائی ہم لوگ مل جل کر کرتے ہیں.. آپ جب آئے ہو تو میں اس وقت یہاں جھاڑو دے رہا تھا.. کوڑا کرکٹ جمع کر کے ہم نیچے لے جاتے ہیں.. پاک جگہ ہے اور پھر ہمارا رزق بھی اسی سے وابستہ ہے.. گھر بھی یہی جگہ ہے یہاں رہتے ہیں تو ہمارا فرض بھی بنتا ہے کہ اسے صاف رکھیں..‘‘

تاریکی اتنی گہری ہو چلی تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی موجودگی کا اندازہ آواز کے رخ سے لگاتے تھے.. کچھ نظر نہ آتا تھا.. اور میں غارِ حرا کی جانب نظر کرتا تھا تو وہاں مزید اندھیرا سیاہ ہوتا تھا..

اس صحن میں کھڑے ہوئے کسی بھی شخص کا واحد مشغلہ بس یہی ہو سکتا تھا کہ وہ دیوار پر ہاتھ رکھ کر نشیب میں واقع اس وسیع وادی کو تکتا رہے جس میں جابجا پہاڑیاں ابھرتی تھیں‘ جبل نور سے کہیں کم بلندی کی تھیں اور ہموار زمینوں پر کہیں کہیں اکا دکا عمارتیں تھیں جن میں سے کچھ روشن تھیں ورنہ پورے منظر پر رات حاوی تھی..

میں نے نیاز کی اس یقین دہانی کے بعد کہ وہ ادھر آ کر سوئے گا اپنا تھیلا غار کے دہانے کے قریب جو ایک ہموار پتھر تھا اس پر رکھ دیا تھا اور ابھی تک اسے کھولا نہیں تھا..

اوپر چوٹی سے کسی نے پکارا..

یہاں صحن میں کھڑے ہو کر میں اوپر کی جانب دیکھتے تو چوٹی کا کچھ حصہ اور وہاں سے نیچے آنے والی ایک دو سیڑھیاں دکھائی دیتی تھیں.. ان سیڑھیوں پر ایک سایہ تھا جس نے پکارا تھا..

جانے کون سی زبان میں پکارا تھا اور نیاز نے بھی اسی زبان میں جواب دیا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا ’’آپ کے لیے رات کا کچھ کھانا وغیرہ لے آؤں..‘‘

’’کہاں سے؟‘‘

’’نیچے سے.. ادھر تو چولہا وغیرہ جلانے کی اجازت نہیں..‘‘

’’نہیں شکریہ.. میرے پاس اللہ کا دیا ہے..‘‘

"تو آپ بیٹھیے میں نیچے جا رہا ہوں کھانا کھانے کے لیے۔" وہ جانے کے لیے سرنگ میں داخل ہونے کو تھا کہ میں نے اُسے روک لیا "نیاز آپ نیچے جاؤ گے کھانا کھانے کے لیے.. میرا خیال تھا ابھی ادھر ہی رہو گے.."

"صاحب کھانا تو کھانا ہے.. اور وہ نیچے ملتا ہے۔" میرا خیال ہے کہ وہ مسکرا رہا تھا.. میری چتا کو سمجھ رہا تھا..

"تو ٹھیک ہے.. کتنے بجے واپس آؤ گے۔" میں خاصا خوفزدہ ہو گیا..

"تین گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے.. نیچے اُترتے اور پھر اوپر آتے.."

ابھی آٹھ بجے تھے.. تو اُس نے گیارہ بجے کے قریب لوٹنا تھا..

وہ چلا تو میں بھی اپنا تھیلا اُٹھا کر ساتھ ہی چلا.. میں تو اُس کے بغیر اس تاریکی میں غار کے قریب تنہا نہیں رہ سکتا تھا.. توبہ.. مجھ میں اتنی برداشت نہ تھی.. "میں بھی باہر چلتا ہوں.. بنگالی بابا کے پاس بیٹھ کر تمہاری واپسی کا انتظار کروں گا.."

"یہاں کیوں نہیں ٹھہرتے.. کوئی بھی نہیں.."

"اسی لیے تو نہیں ٹھہر سکتا کہ کوئی بھی نہیں.."

"غار ایسے خالی کم ملتا ہے کچھ پڑھ لو.."

"میں نے جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا.. چلو.."

وہ پھر مسکرایا ہو گا کہ اُس نے اتنا ڈرپوک زائر پہلے کہاں دیکھا ہو گا..

سرنگ میں داخل ہوئے تو وہاں ظاہر ہے تاریکی کی تہہ مزید دبیز ہو گئی.. اور تارچ کی روشنی اُسے روشن نہیں کرتی تھی بس دھندلا دیتی تھی.. میں نے محسوس کیا کہ سرنگ میں سے واپس جانا نسبتاً آسان ہے..

دوسری جانب برآمد ہوئے تو وہاں بنگالی بُدھا بیک وقت ایک ہاتھ سے توند کھجاتا تھا اور دوسرے ہاتھ سے داڑھی سنوارتا تھا.. اور دوسری جانب صحن کی نسبت تاریکی بہت مدھم تھی.. وہی ہلکی سی لو تھی جو شہر مکہ کی خانہ کعبہ تک جاتی گھنی آبادیوں کی لاکھوں ٹمٹماتی روشنیوں میں سے اُٹھ کر بمشکل یہاں تک پہنچی تھی..

جبل نور کا ایک پاسا جدھر بنگالی بابا کا چھپر تنا تھا قدرے روشنی میں تھا اور دوسرا پاسا جدھر غارِ حرا تھا تاریکی میں کھویا ہوا تھا..

نیاز نے بنگالی بابا کے ساتھ کچھ راز و نیاز کیے جو شاید کھانے کے بارے میں تھے اور پھر مجھے

یہ کہہ کر کہ.. صاحب فکر نہ کرو میں ابھی آتا ہوں.. سیڑھیاں چڑھتا چوٹی کے چھپر تلے معدوم ہو گیا..

میں اسی لڑکھڑاتے بابا بنگالی ساختہ لکڑی کے بنچ پر بچھی گدڑی پر.. تھکی تھیلا گود میں لے کر بیٹھ گیا.. اب میں تھا جبل نور پر اور بنگالی بابا تھا اور وہ ہلکی روشنی تھی جو ہم دونوں کے چہروں پر پھیلتی تھی..

بابا بنگالی گفتگو سے پرہیز کرتا تھا.. مجھے بالکل نظر انداز کیے اسی بُدھا حالت میں بیٹھا رہا اور توند اور داڑھی کو بیک وقت کھجاتا اور سنوارتا رہا..

جہاں میں بیٹھا تھا.. اور جہاں میرے پاؤں دھرے تھے اُن سے آگے بمشکل ایک قدم کا فاصلہ تھا اور اُس کے بعد وہ کھائی تھی جو گرتی تھی تو دم تک سانس نہ لیتی تھی اس لیے ذرا سنبھل کر بیٹھنا پڑتا تھا.. اس بنچ سے دائیں ہاتھ پر چھپر کی حدود میں کھائی کے کنارے تھوڑی سی ہموار جگہ تھی.. میں کچھ حساب کتاب کرتا رہا.. نیاز کی صحن میں موجودگی کے باوجود غار کے اندر تو میں تنہا ہوں گا.. اور اگر وہ نیچے جاتا ہے اور جیسا کہ اُس نے بتایا تھا کہ وہ کبھی نیچے بھی رہ جاتا ہے تو اگر وہ رہ گیا تو میں اس سے تو واپس جانے سے رہا.. میں نے بنگالی بابا کو گفتگو پر مائل کرنے کی نہایت عاجزانہ کوشش کی کہ میں نیاز کے بعد اس کے رحم و کرم پر تھا لیکن اُس نے "ہوں.. ہاں.." کے سوا کچھ نہ کہا.. وہ مجھے پسند نہ کرتا تھا.. میری خواہ مخواہ کی وہاں موجودگی اُسے ناگوار گزر رہی تھی.. میں اُس کی پرائیویسی میں خلل ڈال رہا تھا.. اُسے عادت تھی کہ اوپر سیڑھیوں سے کوئی زائر اُترے.. وہ اُسے تارچ کی روشنی میں سرنگ کا راستہ دکھائے اور پھر چند لمحوں بعد وہ غارِ حرا میں نفل پڑھ کر برآمد ہو اور چلا جائے.. اُسے یہ عادت نہ تھی کہ ایک زائر آئے اور وہ بھی اپنا چھوٹا بیٹری کے ساتھ خود کفیل ہو کر.. سرنگ میں جا کر واپس آئے تو یہیں ٹھہر جائے.. اس کے والی بنچ پر چپک جائے اور جانے کا نام نہ لے..

"بابا.." میں نے نہایت فقیرانہ انداز میں کہا..

"ہوں.." اس نے توند کھجانی موقوف کی لیکن داڑھی بدستور سنوارتا رہا..

"میں اگر اس ہموار سطح پر آپ کے چھپر تلے اپنا مصلیٰ بچھا کر ادھر رات کو سو جاؤں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہو گا.. سو سکتا ہوں؟"

"ہاں سو جاؤ.." یعنی جو جی میں آئے کرو.. میرا دماغ نہ کھاؤ..

"شکریہ بابا جی.. بابا جی.. یہ میرا ملاقاتی کارڈ ہے اگر کبھی پاکستان آئیں تو ملاقات کا شرف بخشیں.. گلبرگ کی فردوس مارکیٹ میں کسی بھی دکاندار سے میرا پوچھ لیں اُن سے میرا ادھار چلتا ہے اس لیے جانتے ہیں کہ میں کہاں رہتا ہوں" میں نے بنچ سے اُٹھ کر اپنا کارڈ بابا کو پیش کیا.. اُس نے وصول کیا اور اپنی گدڑی تلے گھسیڑ دیا "ادھر بہت لوگ آتا ہے.. کارڈ دیتا ہے.. مرا کو کا.. شام کا.. مصر

اور چین کا تو.. ہم کدھر اُن کے پاس جاتا ہے.. ادھر کیوں سوتا ہے.. تم کو اوپر لے جائے گا اُدھر ہوا لگتا ہے.. اُدھر سو جاؤ..''

''آپ اُدھر سوئے گا..''

''ہاں اُدھر سوئے گا.. یا کیا پتہ ادھر سوئے گا.. آج شاید اُدھر سوئے گا..''

''کب سوئے گا بابا؟''

''ابھی غسل کرے گا..''

''کیا کرے گا؟''

''غسل.. پانی کے ساتھ..''

''اچھا.. غسل کرے گا.. تو بابا جی ادھر کوئی نلکا وغیرہ ہے مکہ کارپوریشن کا.. جدھر غسل کرے گا..''

''نہیں بابا..'' یہ بابا ذرا پگھلا.. قدرے فرینڈلی ہوا.. وہ مجھ میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا تھا.. وہ میرے جیسے بے وجہ سوال جواب کرنے والے زائرین کا عادی تھا.. اُس کا رویہ غیر جانب دار تھا کہ میں اگر وہاں بیٹھا رہتا ہوں اور مصلیٰ بچھا کر سو بھی جاتا ہوں تو اُسے کچھ پروا نہ تھی اور اگر رخصت ہو جاتا ہوں تو بھی اُس کی زندگی میں کچھ فرق نہ پڑتا تھا.. تو پہلی بار میرے یہ پوچھنے پر کہ بابا جی ادھر کوئی نلکا وغیرہ ہے وہ ذرا پگھلا ''نلکا کہاں ہوگا بابا.. نیچے سے بوتل منگوایا ہے'' اُس نے منرل واٹر کی ایک بوتل گدڑی تلے سے برآمد کر کے اُس کی نمائش کی ''اِس سے غسل کرے گا..''

''اس سے.. اس ایک بوتل پانی سے آپ سارے کا سارا نہائے گا؟''

''روز روز نہاتا ہے..''

میں نے جان لیا کہ وہ روز روز نہاتا ہے اور اپنے بارے میں کچھ بتایا کہ میں کون ہوں.. کہاں سے آیا ہوں کیا کرتا ہوں.. اور کچھ بڑھا چڑھا کر بتایا.. لیکن میرا خیال ہے کہ وہ کچھ سن نہیں رہا تھا' اپنے قدموں تلے پھیلی وادیٔ مکہ کی رات میں گم رہا.. وہ مجھے توجہ کے لائق نہیں سمجھتا تھا.. لیکن اُس کی توجہ حاصل کرنا میری مجبوری تھی.. اُس کے ساتھ خوشگوار تعلقات استوار کرنا.. اُسے خوشامد اور چاپلوسی سے خوش کرنا میری خواہش تھی کہ اِن لمحوں پورے جبلِ نور پر شاید میرے اور اُس کے سوا اور کوئی ذی روح نہ تھا.. اور اُسے دوست بنا لینے میں میری ایک غرض تھی.. کہ رات کے کسی لمحے.. نیازی کی صحن میں موجودگی کے باوجود غارِ حرا میں مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے.. میں ڈر جاتا ہوں.. یا انہیں بنچ کے قریب زمین پر مصلیٰ بچھا کر سو جاتا ہوں اور رات کے کسی پہر دہشت میں آ جاتا ہوں تو یہی ایک شخص تھا جسے میں مدد کے لیے پکار سکتا تھا..

ڈر جانے میں کوئی شرمندگی نہ تھی..

وہ غار تو ایسی تھی کہ میرے بابا بھی ڈر جایا کرتے تھے.. اسی لیے تو ہماری ماں خدیجہؓ اُن کی احتیاس بندھانے کی خاطر اسی کھائی کے دامن میں جو میرے قدموں سے شروع ہوتی تھی خیمہ زن ہوتی تھیں..

چنانچہ اس بنگالی بابا کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر میں زندگی بھر کا چاپلوسی اور خوشامد کا تجربہ بروئے کار لانے لگا.. مجھے ایک اور غرض بھی تھی.. یہ ایک نہایت انوکھا اور یکتا کردار تھا اور میں اُس کی زندگی کے بارے میں کچھ جاننے کا متمنی تھا..

آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ ایک شخص ہے جس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ذرا آگے ہو کر ایک تاریک سرنگ میں ٹارچ سے روشنی کرتا ہے تاکہ زائروں کو آسانی ہو.. اور وہ سرنگ غارِ حرا کو جاتی ہے.. یہ شخص اور کچھ نہیں کرتا.. برسوں سے ایک بے آباد پہاڑ پر رہتا ہے جہاں پینے کے لیے بھی پانی نہیں ہے اور کھانا بھی ڈیڑھ گھنٹے کی اُترائی کے بعد کہیں دامن میں ملتا ہے.. اور یہ شخص عام طور پر حرا کے قدیم پہاڑ پر تنہا سوتا ہے کئی برسوں سے.. تو کیا اس سے انوکھا اور الگ کردار آپ کے تصور میں آ سکتا ہے؟

یہاں ایک وضاحت گوش گزار کر دوں.. بابا بنگالی کی جو گفتگو میں درج کر رہا ہوں جو مکالمے میں لکھ رہا ہوں وہ قطعی طور پر اتنے واضح اور آسانی سے سمجھ آ جانے والے لہجے میں نہیں تھے.. اُسے اردو کے معدودے چند الفاظ ہی آتے تھے اور وہ بھی ٹھیٹھ بنگالی لہجے میں ادا کرتا تھا.. اس کے علاوہ وہ شُدھ بنگالی میں ہی بولتا چلا جاتا تھا.. میں بہت دیر تک ٹوئیاں مارتا کہ بابا کیا کہہ رہا ہے.. نہایت غور سے ایک ایک لفظ اپنے اندر اُتارتا' کبھی کچھ مفہوم پلّے پڑ جاتا اور اکثر مکمل طور پر بے خبر رہتا.. اور جو تھوڑا بہت سمجھ میں آتا وہ بھی مرحوم مشرقی پاکستان کے ساتھ جو عارضی وابستگی نصیب رہی تھی' اُس کا مرہونِ منت تھا.. تو بنگالی بابا کی جو بول چال میں لکھ رہا ہوں اُس کی ادائیگی ہو بہو یوں نہ تھی.. محض میری سمجھ میں جو آتا تھا اُس کا بیان ہے..

''بابا آپ کا پورا نام کیا ہے؟''

''نور اللہ..'' اُس نے اللہ کو درست عربی مخرج میں ادا کیا ''رہتا بھی جبلِ نور پر ہے تو نور اللہ.. میرا بھائی ہے ہدایت اللہ.. ایک اور بھائی ہے شفاء اللہ.. اور بھی بھائی ہے.. اُن کا نام بھی ایسا ہے..''

''میں یہاں سگریٹ پی لوں..''

''ہاں پی لو.. سب پیتا ہے..''

"تو آپ کتنے عرصے سے.. اپنے بنگال کو تیاگ کر.. بلکہ دنیا چھوڑ کر ادھر بیٹھا ہوا ہے۔"

"بہت برس ہو گیا.. میرا خیال ہے چھ سات برس ہو گیا.. یا شاید آٹھ برس ہو گیا.. کچھ پتہ نہیں۔"

"بنگال میں بال بچہ ہے؟"

"ہاں ہے۔"

"کتنا ہے۔"

"بہت ہے.. بڑا بڑا ہے۔"

"کبھی اُن سے ملتا نہیں؟"

"کیوں نہیں ملتا.. ایک سال وہ ادھر آ جاتا ہے مجھ سے ملنے کے لیے.. ایک سال ہم چلا جاتا ہے۔" یعنی بابا جی مسلسل قیام میں نہ رہتے تھے..

"آپ کا بچہ.. جو بڑا بڑا ہے وہ آپ کو یاد نہیں کرتا کہ بابا ہمارے پاس کیوں نہیں رہتا۔"

"یاد کرتا ہے.. اُن کو پیسہ بھیجتا ہے اس لیے بھی یاد کرتا ہے۔"

"آپ کبھی خانہ کعبہ نہیں جاتا؟"

"جاتا ہے.. جمعہ کا روز نیچے اُترتا ہے.. نیچے اُترنا مشکل کام ہے بوڑھا لوگ کے لیے.. ویگن میں بیٹھ کر کعبہ جاتا ہے اور اُدھر جمعہ کا نماز پڑھ کر شام کو واپس آ جاتا ہے.. ہر جمعہ نہیں.. کبھی کبھی کا جمعہ۔"

"یہ چھپر آپ نے خود بنایا ہے جس کے نیچے رہتا ہے؟"

"نہیں خود کیسے بناتا.. پاکستانی لوگوں نے جو کچھ ادھر اُدھر سے ملا اُس سے بنایا.. نیچے سے کچھ نہیں لایا.. بس یہ دو بانس ہے.. اوپر کچھ پرانا کپڑا ہے اور پلاسٹک کا موٹا والا شیٹ ہے۔"

"بارش ہوتی ہے تو کیا کرتا ہے۔"

"گار کے اندر چلا جاتا ہے.. اُدھر سو جاتا ہے پر اندر گرمی بہت ہوتا ہے۔"

"ویسے آپ ادھر بالکل کھائی کے کنارے رہتا ہے.. چلتا پھرتا ہے رات کے وقت بھی تو ویرانی میں کبھی گرتا نہیں؟"

"نہیں یہ ہمارا گھر کے موافق ہے اس میں نہیں گرتا۔"

اب میں نے ایک نہایت نازک اور ناگزیر سوال کیا جو بہت دیر سے میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا "بابا ادھر حوائج ضروریہ کیسے کرتا ہے؟"

"کیا کرتا ہے؟"

"وہ ٹائلٹ.. پیشاب وغیرہ۔"

نور اللہ ذرا سا اپنے سنگھاسن سے ڈولا تھوڑا آگے ہوا اور ٹارچ روشن کر کے میرے قدموں کے قریب اُس کی روشنی مرکوز کی۔ "ادھر سے نیچے اُترتا ہے.. راستہ بنا لیا ہے.. بس دس بارہ قدم نیچے ہوتا ہے تو اُدھر بندوبست ہے.. جائے گا؟"

"نہیں ابھی نہیں۔"

"تو ہم جاتا ہے.. پہلے نیچے جائے گا بندوبست کے پاس.. پھر آئے گا۔" اُس نے پلاسٹک کی بوتل سنبھالی اور ہولے ہولے اندھیرے میں چلا گیا..

میں تنہا رہ گیا..

ایک ڈولتے ہوئے بنچ پر گود میں تنی تھیلیاں رکھے.. جبل نور کی چوٹی کے عین نیچے ایک کھائی کے کنارے.. ہلکی روشنی میں.. میں تنہا رہ گیا.. وہ ہلکی روشنی میرے چہرے پر سفید پھوار کی مانند چھوتی محسوس ہوتی تھی.. میرے قدموں تلے.. معاف کیجیے گا کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ نیچے دامن میں مکّہ کا شہر تھا.. پھیلا ہوا.. اور اُس سے پرے ایک ہیولیٰ سا تھا ایک پہاڑ کا جس کے اندر غارِ ثور تھا.. جس کے اندر یار تھا اور یارِ غار تھا..

میں نے سوچا کہ اگر نیاز کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو جاتا ہے تو یہیں بنچ کے قریب مصلیٰ بچھا کر پڑا رہوں گا اگرچہ احتیاط کرنی ہو گی.. کروٹ بدلنے سے کھائی میں گرنے کا احتمال تھا..

لیکن صرف اس صورت میں اگر بابا بھی یہیں سو جائے.. اگر وہ اوپر جا کر سوتا ہے جہاں ہوا چلتا ہے تو میں بھی اُدھر چلا جاؤں گا.. تنہا یہاں بھی سونا مشکل تھا..

یقین کیجیے کہ وہ لمحے عجب جمال کے تھے جب میں یکسر اکیلا وہاں بیٹھا ہوا تھا اور وادی تک نیچے بھی ہوئی روشن تھی.. اپنی روشنیاں اوپر میرے چہرے کے لیے بھیجتی تھی.. اُن کی لو سے میں محسوس کر سکتا تھا کہ وہ میرے رخساروں کے مساموں میں جذب ہو رہی ہیں.. ذرا بھی سراسر رخصت ہو گیا اور میرا پورا بدن تھکن سے بے نیاز ہوا.. روح قفس کے ایک پر کی مانند ہلکا پھلکا ہو گیا.. کھل گیا..

جبل نور پر اُس مکمل تنہائی میں ایک رات میں.. بیتی ہوئی یہ چند ساعتیں ایک پوری زندگی تھی..

ایک ایک لمحہ.. بلکہ اُس لمحے کا سوواں حصہ.. بھی اس قابل تھا کہ اُسے تفصیل سے بیان کیا جائے.. میرے آس پاس اُترنے والی رات.. ہر پتھر.. ایک تنہا سوکھا ہوا شجر چوٹی کے عین نیچے معلق..

سیڑھیاں.. چھتیں.. وادیٔ مکہ کی بستیوں میں جو لاکھوں روشنیاں تھیں ہر ایک روشنی.. یہاں تک کہ باہر کی میلی کچیلی گدڑیوں میں سے آتی ہوئی کچھ بو بھی.. اور خاص طور پر وہ لو جو جبلِ نور میں عکس ہوتی اُسے واضح نور کا پہاڑ بنا رہی تھی.. اور یہ مکمل تنہائی.. اس لائق تھے کہ ان کی ایک ایک تفصیل ذہن میں اُتاری جائے. اسے زندگی بھر یاد کیا جائے.. میرے پاؤں تلے.. جو گرز تلے جو سنگریزے تھے اُن میں سے ہر ایک سنگریزے کا لمس بھی بیان کیا جائے.. اُس ہلکی روشنی میں.. مدھم لو میں میرا پورا وجود یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے صحرا کی سرد رات میں سلگتے الاؤ کے قریب بیٹھے ہوئے ایک مسافر کا چہرہ دور سے دکھائی دیتا ہے..

جس منظر میں میں تھا.. اور جو منظر میرے آس پاس اور نشیب میں پھیلا ہوا تھا جو مجھے دکھائی دے رہا تھا اُسے میں کیسے بیان کروں کہ وہ آپ کو بھی ویسا ہی دکھائی دے..

شاید ایک روایت کام آ جائے..

غزوۂ خیبر کے بعد حضرت جویریا جو ایک یہودی سردار کی بیٹی تھیں اور جن کا خاوند مارا جا چکا تھا وہ.. حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے جا رہی ہیں.. حضرت عائشہ صدیقہؓ انہیں جاتے ہوئے دیکھ کر حسد کا شکار ہوتی ہیں اور کہتی ہیں.. بُرا ہو تیرا.. تو جیسے مجھے دکھائی دے رہی ہے.. تو ایسے ہی رسول اللہؐ کو دکھائی دے گی.. کہ حضرت جویریا بے حد خوش شکل تھیں..

تو جیسے یہ منظر مجھے دکھائی دے رہا تھا.. کیسے بیان کروں کہ وہ آپ کو ویسا ہی دکھائی دے..

اور میں اُس منظر کے اندر اُس کو دیکھتا ہوا مسلسل مسرت سے بھیگتا اُس کے کیف کو بدن میں سموتا ایک معصوم بچے کی مانند مسکراتا جا رہا تھا اور تب اُس لمحے میں نے اپنے آپ سے یہ سوال کیا کہ.. اے تارڑ تم کہاں بیٹھے ہوئے ہو..

اور جب یہ سوال میرے ذہن میں آیا اور اس کا جواب آیا کہ جبلِ نور پر.. غارِ حرا میں اُترنے والی سُرنگ کے دہانے پر.. ایک رات میں.. بالکل تنہا..... یہ میں ہوں تو میرے جثے میں ایک جھرجھری سی آ گئی کہ میں کہاں بیٹھا ہوا ہوں..

اور اُس لمحے جب صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع اماں حوا کے شہر جدہ کے ایک کمپاؤنڈ میں.. اُس سوئمنگ پول کے کنارے ایک چھوٹے سے ولا میں.. جس پول کے پانیوں میں شاید اس لمحے وہ متناسب بدن کی رُوسی عورت مسلسل اور بے آواز تیر رہی ہوگی اور ولا کی پہلی منزل پر میری بہو ذیشان سرجری کی ویع کتابوں پر اپنی سر جھکائے آنکھیں جھکائے ان میں غرق ہوگی اور نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھی نہایت مؤدب بیٹھی شاید ٹیلی ویژن دیکھ رہی ہو.. شاید کھانا بنا رہی ہو کہ چکن نوڈلز سے اس کی تسلی نہ ہوئی ہو اور تب اس نے گھر کو ایک ... حال ہی میں خریدے گئے صوفے سفید رنگ کے تھے اور وہ

اپنے لاہور کے گھر میں صوفے پر ٹانگیں سمیٹ کر جسکو اتار کر ٹیلی ویژن دیکھنے کی عادی تھی لیکن یہاں احتیاط کرتی تھی کہ ایسا کرنے سے کہیں ان صوفوں کی سفیدی پر کوئی نشان نہ ابھر آئے اور بہورانی یہ نہ سمجھے کہ ساس صاحبہ تو بالکل پینڈو ہیں جو اس انداز میں بیٹھتی ہیں..

اور بہت دور.. شہرِ مکہ سے شہرِ لاہور تک جتنے فاصلے ہیں اُن کے پار سمیر اس لمحے جانے کہاں مصروف ہوگا.. کسی نئے ریستوران میں قہقہے لگاتا یا اپنے کمرے میں ڈرائنگ کرتا..

اور وہ سب یہ کیسے جان سکتے تھے کہ میں اس لمحے کہاں ہوں..

جبلِ نور پر تنہا ہوں..

تختی رُک سیک گود میں رکھے اُس رات کے انتظار میں ہوں جو میں نے غارِ حرا میں بسر کرنی ہے..

وہ سب یہ کیسے جان سکتے تھے..

ایک سرسراہٹ سی ہوئی..

جیسے میرے آس پاس سے کچھ گزر گیا ہو..

میرے پاؤں کے قریب سے کسی شے کا گزر ہوا ہو..

میرا بدن جو ڈر سے خالی ہو چکا تھا اس سرسراہٹ نے اُسے پھر سے بھر دیا..

کچھ تھا.. لیکن پتہ نہیں کیا تھا..

اور کچھ نہیں بہت کچھ تھا.. سرسراہٹ ایک نہ تھی..

میں نے چونکتے ہو کر نہایت غور سے آس پاس نگاہ کی.. غور کرنے سے وہ کچھ نظر آنے لگا.. تاریکی میں سرسراتے.. چٹانوں سے اُترتے.. میرے اردگرد منڈلاتے.. میری موجودگی کو خاطر میں نہ لاتے کچھ سستی سے ٹہلتے اور کچھ بھاگ دوڑ کرتے چوہا نما کچھ بڑے بڑے سے جانور تھے.. وہ ہماری نانگا پربت، درّہ خنجراب اور دیوسائی میدان میں پائے جانے والے مارموٹ سے تھے.. لیکن اتنے مریدار اور کیوٹ نہ تھے.. اُن جیسے تھے..

میں نے ایسی شکل کے جانور پہلے کبھی نہ دیکھے تھے..

وہ خاصے فرینڈلی تھے.. میرے پاؤں کے آس پاس بے خطر گھومتے تھے.. یکدم ہی نمودار ہو گئے تھے.. کبھی کسی پتھر پر چڑھتے اور کبھی اترائی میں کود جاتے..

میں دم روک کے بیٹھا رہا کہ جانے کیا چیز ہیں کہیں میرے ہلنے جلنے سے مجھ پر حملہ ہی نہ

کر دیں.. پتہ نہیں کیا ہیں.. کیا پتہ آسیب ہیں..

اس ڈر آلود کیفیت میں دم روکے بیٹھا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ چوٹی سے اُترنے والی سیڑھیوں سے ایک لبادے لہراتا جوڑا دھیرے دھیرے اُتر رہا ہے.. ایک دراز قامت اگرچہ فربہ سعودی نوجوان اور اس کی فی الحال ایک اہلیہ.. وہ اتر کر جب مجھ تک.. میرے چھپر تک.. کہ یہ چھپر فی الحال میری عارضی ملکیت میں ہی تھا.. وہ پہنچے تو میں نے بلا سوچے سمجھے بابا بنگالی کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے اپنی چھوٹی ٹارچ روشن کر کے اُن کے لیے تنگ سرنگ کی اندھی تاریکی میں راستہ بنایا.. نوجوان نے عربی میں کچھ کہا.. شاید میرا شکریہ ادا کیا یہ سمجھتے ہوئے کہ میں ازل سے ادھر ہوں اور یہی میرا پیشہ ہے.. وہ دونوں آپس میں کھسر پھسر کرتے سرنگ میں چلے گئے..

اتنی دیر میں بابا بنگالی نہایت فراغت سے توند کھجاتا فارغ ہو کر اوپر آ گیا.. اُس کی منرل واٹر کی بوتل کا کچھ پانی صرف ہو چکا تھا..

وہ میرے پاس بیٹھا نہیں.. اپنی گدڑیوں میں سے ایک لنگوٹ سا برآمد کر کے اُسے سونگھتا اوپر جانے لگا تو میں نے پوچھا ”نور اللہ اب کدھر جاتے ہو؟“

”اب ہم غسل کرے گا.. اوپر جا کر.. بہت پانی ہے.. بوتل چھلکا کر اُس نے بہت پانی کا مظاہرہ کیا اور اوپر جاتی سیڑھیوں کی جانب چلا گیا..

اب میں پھر غار حرا تک جانے والی سرنگ کا اکلوتا نگہبان تھا..

اکلوتا رکھوالا تھا..

پہلے بنچ پر بیٹھا بے دھیان تکتا جاتا تھا بچوں کی مانند مسکراتا جاتا تھا لیکن سعودی جوڑے کو راہ دکھانے کے بعد میں بابا بنگالی کی گدڑیوں پر ہی براجمان رہا.. خوش نصیبی کی جو بادشاہی مجھے حاصل ہو گئی تھی اُس سے روح کو بھگوتا رہا اور لطف اندوز ہوتا رہا.. ہر دو چار لمحوں کے بعد اپنے آپ سے سوال کرتا کہ اے تارڑ کہاں ہو اور میں اپنے آسے پاسے نظر ڈال کر خود سے کہتا کہ یہاں..

طائف میں مسجد عداس کے صحن کے ایک حصے کی جانب اشارہ کر کے مجھے بتایا گیا کہ حضورؐ اس جگہ بیٹھے تھے تو مجھ پر کیسی گزری تھی کہ نظر اس حصے سے ہٹتی نہ تھی اور میری پیشانی مجھ سے بغاوت کرتی تھی کہ مجھے اس حصے کو چھو لینے دو.. وہاں تو حضورؐ کچھ دیر کے لیے ٹھہرے تھے جنہوں نے اُن کے بدن کو خون آلود کیا تھا اُن [illegible] دعا دیتے تھے [illegible] اپنے رب سے کرتے تھے.. عداس کے [illegible]

کر دو انگور کے دانے پیاسے حلق میں اُتارے تھے اور چل دیئے تھے.. اور یہاں.. کوئی ایک حصہ تھا کوئی ایک جگہ تھی.. کہاں کہاں اُن کے نقش پا نہ تھے ہتھیلیوں کے نشان ثبت نہ تھے.. اگر یہ نقش اور نشان نمایاں ہونے کا قصد کر لیں تو جبل نور کا ہر پتھر ہر سنگریزہ دمکنے لگے.. ہر جانب پاؤں کے نشان اور ہتھیلیوں کی شباہتیں یوں روشن ہو جائیں کہ اُن کے عکس میرے بدن کے چپے چپے پر ٹھہر جائیں.. دور سے مجھے کوئی دیکھے تو حیرت میں چلا جائے کہ یہ شخص پاؤں کے نشانوں اور ہتھیلیوں کی شباہتوں سے بنا ہوا ہے.. اس کے بدن کا کوئی حصہ کا لک میں نہیں سارے کا سارا روشن ہے.. اور میں دم روکے ساکت اسی حالت میں تو نہ بیٹھا رہتا.. میں بہت احتیاط سے ذرا پہلو بدلتا.. ذرا سا حرکت کرتا اور یوں وہ پاؤں اور ہتھیلیوں کے عکس بھی میرے بدن پر اپنی جگہ بدلتے.. میرے حرکت کرنے سے وہ ذرا آگے پیچھے ہوتے.. تو مجھے لگتا کہ حضورؐ میرے وجود پر چلتے ہیں.. اُن کے پاؤں میرے بدن پر چلتے ہیں.. اُن کی ہتھیلیاں حرکت کرتی ہیں اور مجھے ڈھارس دیتی ہیں.. خاص طور پر وہ ہتھیلی جس کا عکس میرے ماتھے پر پڑتا ہے اور سر پر نمایاں ہوتا ہے.. تو حضورؐ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں کہ تم نے غم نہیں کرنا' حوصلہ رکھنا ہے اس حیات میں.. میں تمہارے ساتھ ہوں.. جیسے اباجی میرے سر پر ہتھیلی رکھ کر پیار دیتے تھے ایسے حضورؐ اپنی ہتھیلی میرے سر پر رکھ کر مجھے پیار دیتے ہیں.. کندھوں پر جو ہتھیلی عکس ہوتی ہے وہ مجھے تھپکتی ہے.. میں بہت آہستگی سے میرا دایاں ہاتھ جہاں بھی ہے اُس کی ہتھیلی کو کھولتا ہوں جیسے وہ کانچ کی ہتھیلی ہو اتنی احتیاط سے کھولتا ہوں اور وہاں وہی ہے جو میرے من کی مراد ہے.. میری ہتھیلی پر بھی اُن کی ہتھیلی کا ایک حصہ عکس ہو رہا ہے.. اب میں دم روک لیتا ہوں.. اس عکس کو بُت کی مانند ساکت ہو کر وہیں رکھتا ہوں.. کیونکہ سانس لیتا ہوں تو بھی خدشہ ہے کہ وہ ذرا آگے پیچھے نہ ہو جائے.. میں بہت آہستگی سے ہتھیلی بند کرتا ہوں تو وہ مٹھی پر عکس ہوتی ہے لیکن اس کا بہت تھوڑا سا حصہ تو میں فوراً مٹھی کھول کر ہتھیلی پھر پھیلا دیتا ہوں.. بہت غور سے دیکھتا ہوں کہ حضورؐ کی ہتھیلی کا جو عکس ہے کیا اس میں ان کی انگلیاں بھی الگ الگ نظر آتی ہیں اور اگر آتی ہیں تو کیا وہ میری انگلیوں پر بھی سایہ کرتی ہیں.. اور وہ کرتی ہیں.. اُن انگلیوں پر جن میں قلم تھام کر لکھتا ہوں.. خاص طور پر شہادت کی اُس انگلی پر جس کے پوٹے کا ماس.. مسلسل قلم کو گرفت میں لینے سے.. لکھنے سے سخت ہو کر مردہ ہو چکا ہے.. تو وہ پوٹا بھی اُٹھتا ہے.. زندہ ہو جاتا ہے.. مجھے تائید حاصل ہو جاتی ہے..

اُنہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا ہے....

یہ نہیں کہ میں حضورؐ کی ہتھیلیوں کے عکس کا ہی شیدائی بنا رہتا ہوں.. مجھے اُن سے کہیں بڑھ کر ان کے پاؤں کے نقش کی چاہت ہے.. میں اپنے آپ کو دیکھ نہیں سکتا کہ وہ کہاں کہاں میرے بدن پر ہیں.. کوئی اور مجھے دیکھے تو بتائے کہ کہاں کہاں مجھ پر ان کے نقش پا ثبت ہیں.. لیکن اس کے باوجود میں یہ

محسوس کر چکا ہوں کہ جہاں میں چاہتا تھا کہ وہاں ہوں تو وہ وہاں ہیں.. میرے چہرے پر.. میرے ہونٹوں پر.. وہ ثبت ہیں ہونٹوں پر اور میرے رخساروں پر.. اور میری آنکھوں میں اور جب میں پلکیں جھپکتا ہوں تو میرے پپوٹوں پر.. اور نہ صرف میں اُن کے کومل پاؤں اپنے چہرے پر محسوس کرتا ہوں بلکہ اُن پاؤں میں جو چپل ہے اور اُسے جہاں جہاں سے حضورؐ نے اپنے ہاتھوں سے گانٹھا ہے.. تروپے لگائے ہیں.. اُس دھاگے کی ہر گانٹھ اور تروپے کو میں اپنے رخساروں میں ثبت ہوتے محسوس کرتا ہوں..

اگر جبل نور کا ہر پتھر اور ہر سنگریزہ حضورؐ کے نقش اور نشان نمایاں کرنے کا قصد کرے تو ایسا ہی ہو..

بے شک اس سے غار حرا کے واحد رکھوالے کے طور پر.. جبل نور کی چوٹی کے نیچے بابا بنگالی کی گدڑیوں پر براجمان جب میں اُس پہاڑ پر نظر کرتا تھا تو وہ نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا.. اور جو کوئی بھی اُسے دیکھتا اُسے یہی نیم تاریکی نظر آتی لیکن میں اُس ایک نظر کے بعد جب دوسری نظر کرتا تھا تو مجھے اُس کے ہر پتھر پر سنگریزے پر حضورؐ کے نقش پا اور ہتھیلیوں کے نشان نمایاں ہوتے دکھائی دیتے تھے..

بے شک یہ میرے تصور میں دکھتے تھے لیکن تصوراتی نہ تھے.. میں اگر یہاں تک اتنا تردد کر کے آیا تھا تو صرف اُن کے حوالوں سے آیا تھا.. اگر اُن کے حوالے نہ ہوتے تو میں کیوں اتنی مشقت اور جان ماری کر کے یہاں تک پہنچتا.. اگر ہمارے عقیدے میں بھی کوئی کوہ طور ہوتا.. چلئے یہ جبل نور ہی کوہ طور ہوتا اور اس کی بلندی پر وہ جلتی ہوئی جھاڑی ہوتی جس کی پوشیدگی میں سے یہ آواز آتی کہ تم ایک مقدس مقام پر ہو اپنے جوتے اُتار دو اور پھر دس احکام نازل ہوتے.. تو کیا پھر بھی میں یہاں تک پہنچنے کے لیے اتنا تردد کرتا.. نہیں.. میں اتنے رعب میں ہوتا اُس کی ذات کا دباؤ اتنا ہوتا کہ میں سہہ نہ سکتا.. بے شک اُس کا رحیم اور کریم ہونا میری ہمت بندھاتا لیکن میں اُس کے جبر اور قہر کی تاب نہ لا سکتا.. کبھی ادھر کا رخ نہ کرتا.. یہ میرے تصور میں نہ آتا تھا.. مجھ سے ماورا بہت بلند ہر سو چھایا ہوا تھا.. اُس کے سامنے میں ایک بے حیثیت ذرہ ہو جاتا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ وہ اس ذرے پر کبھی نظر کرتا بھی ہے یا نہیں.. میں نے ادھر کا رخ اس لیے کیا تھا کہ جو یہاں آیا کرتا تھا وہ کہتا تھا کہ وہ مجھ جیسا ہے کہ میں تم جیسا ہی ایک انسان ہوں سوائے اس کے کہ مجھ پر وحی اُترتی ہے.. اور میں اُس کے سامنے جاتا تھا تو ایک ذرہ نہیں رہتا تھا.. مجھے وہ آفتاب کر دیتا تھا.. وہ دوست تھا اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اُس دوست کی نشانیاں جبل نور کے ہر پتھر ہر سنگریزے پر نہ دیکھ سکتا [illegible] کسی شک شبے کی گنجائش نہیں کہ وہ تھا.. اور اُس کے بارے میں شک کرتا اگرچہ کفر ہے اور کفر اسی لیے ہے کہ شک سر اٹھاتا ہے.. وہاں تک میری پہنچ نہیں یہ حضورؐ [illegible] یہاں تک پہنچ گیا ہوں

یہ نہیں کہ میں خوش نصیبی کی بادشاہت سے لطف اندوز ہوتا ہوا صرف انہی.. خیالوں میں کھویا رہا نہیں.. میں ہمیشہ کی طرح اس جبل کی اونچائی اور دشواری اور اس کی چوٹی تک پہنچنے والے ممکنہ راستوں کے بارے میں اپنی کوہ نوردی کے تجربوں کو بروئے کار لا کر بہت حساب کتاب کرتا رہا.

حضورؐ یہاں تک کیسے پہنچتے تھے؟

غار حرا کی جانب.. جبل نور کے دوسرے رُخ پر تو ایک عمیق کھائی ہے وہاں سے اوپر چڑھنا ناممکن تو نہیں لیکن مشکل اور پُرخطر تھا تو ادھر سے نہیں..

صرف ادھر سے.. وادی مکہ کی جانب سے.. اُس دامن سے جسے میں دیکھ سکتا تھا کہ وہاں کچھ روشنیاں تھیں..

تقریباً اسی راستے پر جو اب بھی مستعمل ہے..

پہاڑی راستوں کی خاصیت ہے کہ وہ مقامی لوگوں کے صدیوں کے تجربے سے وجود میں آتے ہیں.... ہمیشہ ایک طے شدہ نسبتاً آسان اور کم پُرخطر راستہ وجود میں آتا ہے.. ایک اجنبی ان راستوں سے ہٹ کر کوئی مختصر راستہ اپنائے تب اُسے احساس ہوتا ہے کہ نہیں.. مجھے اسی مستعمل راستے سے آنا چاہیے تھا..

تو حضورؐ وادی مکہ سے چل کر اس دامن تک پہنچتے ہوں گے اور اسی راستے کو اختیار کرتے ہوں گے جسے زائرین آج بھی اختیار کرتے ہیں..

لیکن میرے اندازے کے مطابق.. ایک فرق کے ساتھ..

زائر تو درمیان میں پہنچ کر دائیں جانب مڑ کر اس کھلی جگہ پر پہنچتے ہیں جہاں سے جبل نور کے پار کی وادی نظر آتی ہے اور پھر بائیں ہاتھ پر چڑھتے ہوئے چوٹی تک پہنچتے ہیں..

حضورؐ کو چوٹی پر نہیں.. غار حرا تک پہنچنا ہوتا تھا.. اس لیے غالب امکان یہی ہے کہ وہ اس مقام سے جہاں سے زائر دائیں جانب مڑتے ہیں وہ وہاں سے سیدھے بلندی کی جانب چڑھتے جاتے ہوں گے اور میں اس مقام پر جہاں میں بیٹھا تھا.. اس تنگ سرنگ کے دہانے پر آ جاتے ہوں گے.. چوٹی سے انہیں کچھ غرض نہ تھی..

یہ محض حساب کتاب ہے کہ کوہ نوردی کے حساب سے.. شاید یہ سراسر غلط ہو اور وہ کسی اور رُخ سے آتے ہوں.. لیکن سب اشارے سب گمان یہی گواہی دیتے ہیں کہ ادھر سے ہی آتے تھے اور اس سرنگ تک پہنچ کر جان لیتے تھے کہ غار اس کے پار ہے.. یہاں پہنچ کر وہ اپنا سانس بھی درست کرتے

ہوں گے.. فوری طور پر سرنگ میں داخل نہیں ہو جاتے ہوں گے..

اور سانس درست کرنے کے لیے بھی یہی جگہ تھی.. کھائی کے کنارے.. جہاں بابا بنگالی کا چھپر تھا اور میں تھا..

تو اُن زمانوں میں نہ یہ چھپر تھا اور نہ میں تھا..

اگر میں ہوتا.. تو کیا ہوتا..

اگرچہ میں کیسے ہو سکتا تھا.. لیکن ہوتا تو کیا ہوتا..

میں یہاں اس سرنگ کے دہانے پر راکھی کرتا دیکھتا.. دیکھتا کہ دامن میں سے ایک مضبوط بدن کا کوہ پیما ہمت والا.. اپنے کاندھوں پر کھانے پینے کا کچھ سامان اُٹھائے ایک تھیلے میں.. اور اُس تھیلے کے نیچے اُس کے شانے ہیں اور ایک مہر ہے.. وہ چڑھتا چلا آتا ہے اور بہت کم سانس درست کرنے کے لیے رُکتا ہے.. اگر رُکتا ہے تو پیچھے مڑ کر جبل کے دامن کو دیکھتا ہے جہاں ایک تنہا خیمہ ہے.. اور اُس خیمے کے باہر اُس سے لاڈ کرنے والی اُس کی بیوی خدیجہ فکر مندی میں مبتلا کھڑی اوپر دیکھتی ہے.. شاید اُن کی سب سے چھوٹی بچی فاطمہ بھی اپنی اماں کے برابر میں اُن کا لبادہ تھامے اپنے بابا کو اُس بلندی پر چڑھتے دیکھتی ہے اور اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بابا اوپر کیا کرنے جاتے ہیں..

اور جب وہ مضبوط بدن چوڑے شانوں والا کوہ پیما جبل پر چڑھتا.. میرے قریب آ جاتا ہے وہ اپنے دھیان میں چڑھتا آ رہا ہے اس لیے ابھی میں اُس کی نگاہ میں نہیں آیا لیکن میری نگاہ میں تو اُس کے سوا اور کچھ نہیں.. میں اس کے سراپے نین نقش اور قد بُت کو محویت سے دیکھ رہا ہوں اور اوپر اپنی جانب آتے دیکھ رہا ہوں کہ وہ مضبوط کوہ پیما کھدّر کے کرتے اور تہبند میں ملبوس ہے اور اونٹ کے سخت چمڑے سے بنی ہوئی چپلیں پیوند زدہ ہیں اور گانٹھی گئی ہیں..

خوب رُو شخص ہے..

بونا سا قد ہے جو کہ پیمائی کے لیے انتہائی موزوں ہے..

اُس کے بڑے سر پر سیاہ گھنگھریالے بال ہیں جن میں پسینے کی نمی ہے اور کچھ بال کشادہ جبیں پر بکھرے ہوئے ہیں..

بھنوئیں خمیدہ ہیں اور بالوں سے بھری ہوئی ہیں..

اور دونوں بھنوؤں کے اندرونی کنارے ایک دوسرے سے پیوست ہیں..

اور کیسی سحر کر دینے والی سیاہ اور بڑی بڑی آنکھیں ہیں جن کی سیاہی کے بعد نہایت کھلی ہوئی سفیدی اور سفیدی کا [illegible] آنکھیں کسی جالاب اور ہی ہیں..

اور آنکھوں سے زود فہمی کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں..

پلکیں لمبی اور سیاہ ہیں اور آنکھوں کی جھیلوں پر سیاہ تتلیوں کی مانند تیرتی ہیں.. کبھی پر سمیٹتی ہیں کبھی کھول دیتی ہیں..

ناک ستواں اور سیدھی ہے..

میں اُس کے دانت تب نمایاں ہوتے دیکھتا ہوں جب ایک گہرا سانس لینے کی خاطر وہ اپنا دہن وا کرتا ہے اور دیکھتا ہوں کہ دانتوں میں ریخیں ہیں جیسے باریک خط کھینچ دیا گیا ہو..

داڑھی خوب گھنی ہے..

گردن لمبی ہے مگر خوبصورت ہے..

سینہ کشادہ.. اور بدن کی رنگت کھلی ہوئی جس پر پسینے کے قطرے موتیوں کی مانند پھسلتے ہیں..

ہتھیلیاں نرم و گداز ہیں اور چپلوں میں گھسے پاؤں بھی نازک لگتے ہیں..

بدن ذرا آگے جھکا ہوا.. بے شک ایک جبل پر چڑھتے ہوئے ہر شخص ذرا آگے جھکا ہوتا ہے لیکن یہ شخص جب کھڑا ہوتا ہے تب بھی اُس کا بدن آگے جھکا ہوا لگتا ہے..!

اور رفتار میں تیزی ہے مگر ہر قدم اپنی جگہ پر جم جاتا ہے..

چہرے پر گہرے تفکر کی علامتیں دکھائی دے رہی ہیں..

ایسا جاذب اور خوش چہرہ کوہ پیما میں نے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا تھا جو مضبوط بھی ہے اور اُس کا سراپا کومل بھی دکھائی دیتا ہے..

وہ کوہ پیما عین میرے سامنے چڑھائی کے آخری پتھر کو تھام کر اوپر پہنچ جاتا ہے..

یہ تو میرے حضوؐر ہیں..

میرے سامنے کھڑے ہیں..

میں منہ کھولے ایک فاتر العقل بچے کی مانند مسکراتا ہوا انہیں تکتا رہتا.. آنکھیں نہ جھپکتا.. میرا یہ تن سارا آنکھیں ہوتا تو بھی میں کوئی ایک آنکھ بھی نہ بند کرتا.. ساری کھلی رکھتا.. اور جتنی لاکھ ہزاروں آنکھیں میری ہوتیں اُن میں اُن کا نور بھرتا جاتا اور میں بھی روشن ہو جاتا..

تو کیا اتنی روشنی کے باوجود بھی میں اپنی چھوٹی ٹارچ جلا کر اُن کے لیے اس سرنگ کے اندھیرے کو کم کرتا.. بے شک اُن دنوں تو یہ ٹارچ ابھی ایجاد بھی نہیں ہوئی تھی اور نہ اس کی کچھ حاجت تھی کہ بابا کا تن بدن وجود سارا روشنی تھا.. میں اُنہیں کیا راستہ دکھاتا راستہ تو انہوں نے مجھے دکھانا تھا..

اور اگر میں ٹارچ جلا کر سرنگ کے اندھیرے میں کچھ روشنی کرتا تو کیا وہ بھی میرے وجود سے

غافل اُس سعودی جوڑے کی مانند میرا شکریہ ادا کر کے مجھ سے کچھ کہے بغیر اندر چلے جاتے..

اگر اُن زمانوں میں.. میں یہاں اسی مقام پر بیٹھا ہوتا تو کیا ہوتا..

وہ قدرے حیران تو ہو جاتے کہ یہ کون ہے.. اس حرا کے گھر کے باہر اس بلند تنہائی پر جہاں میرے شب و روز گزرتے ہیں جہاں میں کائنات کے نقشے اور نظام اپنے ذہن میں اتار کر اپنے دھیان میں گم کچھ سمجھنے اور سلجھانے.. کی سعی کرتا ہوں.. سوال کرتا ہوں اور جواب کا منتظر ہوں تو یہاں اس سرنگ کے داخلے پر یہ کون ہے.. کہاں سے آ گیا ہے.. پہلے تو یہاں کوئی نفس نہ تھا.. یہ کون ہے جو دور کے شہروں سے آیا لگتا ہے.. ایک رنگ برنگا تھیلا گود میں رکھے.. چھدرے سفید ہو چکے بالوں' چوڑے ماتھے اور نیم سرخی میں ڈوبی ہوئی آنکھوں والا بھدا سا بوڑھا' حواس باختہ مسکراتا مجھے تکتا کہاں سے آ گیا ہے..

وہ ضرور حیران ہوتے..

رُک جاتے.. کچھ دیر ٹھہر جاتے.. میرے قریب کھڑے ہو جاتے..

اور اگر وہ ٹھہرتے.. اور کھڑے ہوتے تو میں یونہی بابا بنگالی کے چھپر تلے گدڑیوں پر بیٹھا تھوڑا رہتا.. کھڑا ہو جاتا.. اگرچہ اُن کا قد تقریباً میرے جتنا ہی ہے لیکن وہ مجھ سے کہیں دراز قامت لگتے.. اور میں مسرت اور سنانے کے اُسی اظہار میں منجمد منہ کھولے مسکراتا.. منہ اٹھا کر انہیں دیکھتا.. کہ وہ مجھ سے کہیں بلند قامت والے ہوتے.. میں سر اُٹھائے اپنے اوپر ایک سائبان کی صورت دیکھتا اور میرے بدن کو بہت آرام ملتا..

وہ میرا حال جان جاتے.. میرے حال کے محرم جو تھے.. جان جاتے کہ یہ بندہ مجھے دیکھ کر حواس کھو بیٹھا ہے اگرچہ سیہ کار ہے لیکن مجذوب ہو چکا ہے.. مجھے دیکھ کر.. اگر میں نے اس سے بات نہ کی تو یہ قیامت تک یونہی منہ کھولے مسکراتا رہے گا..

تو وہ کھڑے ہو جاتے اور میرا حال احوال دریافت کرتے..

وہ اگرچہ میرا حال بھی جانتے تھے اور احوال سے بھی خوب ہی واقف تھے لیکن بھولے بن کر پوچھتے کہ کیسے ہو.. بچوں کا کیا حال ہے اور خاص طور پر بیٹی کا پوچھتے کہ وہ کیسی ہے.. طواف کے دوران وہ یاد آ گئی تھی تو اتنا کیوں روئے تھے.. میں اگر کچھ کہتا تو یہی کہتا کہ بابا بیٹیوں سے لاڈ پیار کرنے کی ریت بھی تو آپ ہی نے ڈالی ہے.. بی بی فاطمہ سے کیوں اتنا پیار کیا تھا.. لیکن میں چپ رہتا.. وہ کہتے رہتے اور میں سنتا رہتا..

اور پھر یقیناً پوچھتے کہ تم کب سے اس سرنگ کے رکھوالے ہوئے ہو..

میں کیا جواب دیتا.. تو میں کیا جواب دیتا..

تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا.. میں تمہیں پہچان نہیں پا رہا.. کون ہو؟

میں اپنی چھوٹی ٹارچ گرفت میں لیے.. اُن سے چھپائے شرمندہ سا کھڑا رہتا.. اور پھر کچھ نہ سوجھتا تو کہتا.. آپ کیسے مجھے پہچان سکتے ہیں بابا.. آپ نے کبھی مجھے دیکھا ہی نہیں.. بابا آپ کی ڈاچی قصوی جو میرے وجود کی گلیوں میں چھن چھن کرتی گزرتی ہے میں اس کے پیچھے چلنے والا اس کی مینگنیاں سمیٹنے والا ہوں.. آپ نے مڑ کر کبھی دیکھا ہی نہیں اس لیے آپ پہچان نہیں رہے.. میرے اس تھی تھیلے میں منرل واٹر کی بوتلیں ہیں.. کھجوریں اور سینڈوچ ہیں.. دودھ ہے.. اور ایک سیب بھی ہے.. تو میں نے سوچا کہ آپ کو تو بھوک پیاس کا دھیان ہی نہیں رہتا.. میں ذرا دھیان رکھوں.. کچھ پیش کروں..

تو شاید وہ کہتے.. ذرا نیچے جبل نور کے دامن میں دیکھو وہاں اونٹ کے سیاہ بالوں سے بنا ہوا جو خیمہ نظر آ رہا ہے اُس میں تمہاری ماں خدیجہ مقیم ہیں..

ہاں سر.. میں نے انہیں دیکھا تھا.. وہ خیمے سے باہر فکر مندی اور تشویش کی حالت میں آپ کو جبل پر چڑھتا دیکھ رہی تھیں.. جونہی آپ یہاں پہنچے ہیں تو وہ خیمے کے اندر چلی گئی ہیں.. میں دیکھ رہا تھا.. لیکن بابا یہ تھوڑی سی خوراک تو آپ رکھ لیں..

تم پوری بات نہیں سنتے.. وہ خفا نہیں ہوتے میری سادگی پر مسکراتے ہیں.. خدیجہ کے ہمراہ میری ننھی سی بیٹی فاطمہ بھی ہے.. اُسے مکہ میں کس کے پاس چھوڑ کر آتے وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ چلی آئی ہے.. تو کبھی کوئی خادم میرے لیے کھانے پینے کا سامان لے کر اوپر آتا ہے اور غار کے باہر رکھ جاتا ہے.. اور کبھی فاطمہ اصرار کرتی ہے کہ بابا کا کھانا میں لے کر جاؤں گی..

اس پر میں بہت حیرت کا اظہار کرتا ہوں.. بی بی فاطمہ تو بس بالڑی سی ہیں.. چھوٹی سی ہیں تو حضور وہ کیسے کھانا اُٹھا کر اپنے کومل طوک ابھرے ناتواں بدن کے ساتھ اس بلندی تک آتی ہوں گی..

اس لیے کہ وہ کائنات بھر میں سب سے زیادہ مجھ سے پیار کرتی ہے.. وہ کہتے..

اسی لیے تو آئندہ برسوں میں جب میں اُسے ایک خبر سناؤں گا تو وہ روئے گی اور جب ایک اور نوید دوں گا تو وہ ہنسنے لگے گی.. خبر اپنے رخصت ہو جانے کی اور نوید یہ کہ فاطمہ سب سے پہلے تم میرے پاس آؤ گی.. بابا یہی کہتے..

تو میں بی بی فاطمہ کے سامنے کہاں ٹھہر سکتا تھا..

لیکن پھر بھی رہ نہ سکتا.. اپنی محبوط الحواسی کا بہانہ کرتا اُن سے کہتا.. بابا نہ میں مومن ہوں مسلمان میں اور نہ میں کافر ہوں کفر کی راہوں میں.. نہیں جانتا کہ میں کون ہوں.. پر یہ جانتا ہوں کہ آپ کی ڈاچی قصوی کی مینگنیاں سمیٹنے والا ہوں.. آپ نے مڑ کر نہیں دیکھا نہ دیکھیں میں تو سمیٹنے سے باز آنے

والا نہیں.. نہ ہی میں یہ کام کسی غرض سے کرتا ہوں.. تو آپ کچھ تو کرم کیجیے اور میرے تھیلے میں سے کچھ لے لیں.. یہ میں نے کھٹمنڈو کے تھمل بازار سے خریدا تھا ایک تبتی حسینہ کی دکان سے اور اس میں ایک چیپسی بھی ہے.. شاید آپ پسند فرمائیں.. سگریٹ تو آپ نہیں پیتے ہوں گے.. ویسے وہ بھی لایا ہوں.. اور جناب کھجوریں بھی ہیں.. اُن میں سے ایک تو چکھ لیجیے پلیز..

یہ اجوئی ہے جو میرے منہ میں گھلی جاتی ہے؟.. وہ قبول کر لیتے..

تو میں کہتا.. پتہ نہیں سرکار میری بہو نے جدہ کی ایک سپر مارکیٹ سے یہ کھجوریں خریدی تھیں..

خوش قسمت ہو کہ تمہاری بہو بھی ہے.. میرے قاسم طیب اور طاہر تو جو آئے اور ابراہیم جنہوں نے ابھی آنا ہے انہوں نے مجھ سے بچھڑ جانا ہے.. وہ زندہ رہتے تو کبھی نہ کبھی میرے حجرے میں بھی ایک بہو کے قدم آتے.. وہ رنجیدہ ہو جاتے ہیں..

اور میں موضوع بدلنے کی خاطر کہتا ہوں.. جناب کھجور کے بعد دودھ کا ایک گھونٹ بھرنا تو لطف دیتا ہے.. یہ دیکھیے امریکی کمپنی کا پیک شدہ خالص دودھ ہے.. جبلِ نور کے دامن میں جو سٹور ہے وہاں سے خریدا تھا تو بہت سرد تھا لیکن اب نیم گرم سا ہو گیا ہے..

تو وہ میرا دل رکھنے کی خاطر ایک گھونٹ تو بھر ہی لیتے..

اگر میں اُن زمانوں میں ہوتا..

تو اپنے بابا کو اس تنہائی میں سامنے پا کر جو کچھ میں کہتا اور سنتا.. اُس کی تفصیل بیان کرنے پر آ جاؤں تو جب تک سانس ختم نہ جائے اور جب تک کہ دنیا بھر کے سمندروں کی روشنائی کا آخری قطرہ میرے قلم میں قیام کرے.. میں بیان کرتا چلا جاؤں..

میں اُن زمانوں میں نہیں تھا.. لیکن تھا.. بابا کی موجودگی زمان و مکاں کی قیود سے ماورا عشق کے محلوں میں ہمہ وقت ہے.. یہ محض تصور کی کرشمہ سازیاں نہیں.. انسان اگر عشق کے اُن محلوں میں داخل ہونے کا صدقِ دل سے آرزومند ہو تو سب در کھلے ہیں.. لیکن ان کے اندر عبادت کے تکبر والے اور گھمنڈ میں پابند لوگ نہیں جا سکتے.. صرف اُن کے لیے در کھلے ہیں جو نہیں جانتے کہ وہ مومن ہیں یا کافر.. شرط یہ ہے کہ قصویٰ کے پیچھے پیچھے چلنے والوں میں سے ہوں..

یہ بے شک ایک واہمہ ہو سکتا ہے اور اس کا جواز آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے لیکن اُس رات جب بھی میں نے دودھ کی اس بوتل کو منہ لگایا.. اُس پر اپنے لب جمائے تو میرے لب جیسے سُن ہو گئے ہوں.. اُن میں جان کم رہتی ہو کہ مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے بابا نے اسی بوتل سے

ایک گھونٹ بھرا تھا..

اور جیسا کہ ایک بار بابا نے دودھ کے ایک پیالے میں سے ایک گھونٹ بھرا تھا اور اُن کے بعد سب صحابہؓ نے اُسی پیالے سے سیر ہو کر اپنی بھوک بجھائی تھی اور پھر بھی وہ پیالہ لبریز رہا.. اسی طور اُس شب میری بوتل کا دودھ بار بار گھونٹ بھرنے سے بھی ختم نہ ہوا.. اور اُس نے سپیدۂ سحر تک میرا ساتھ دیا اور بالآخر آخری قطرے ابوہریرہ کی ایک بلی کے کام آئے..

مجھے ان زمانوں سے واپس لے آئیں وہ گھٹی گھٹی آوازیں اور ان کی گونج جو سرنگ کے اندر سفر کرتی تاریکی میں مجھ تک آنے لگیں.. وہ سعودی نوجوان جو کچھ دیر پہلے اپنی بیوی کے ہمراہ اندر گیا تھا اور اتنی دیر میں میں نے زمانوں کی سیر کر لی تھی سنبھلتا.. احتیاط کرتا پہلے باہر آیا اور میں نے اس دوران اپنی ڈیوٹی سرانجام دی اور ٹارچ کی روشنی اُس کے لیے مہیا کی.. وہ دراز قامت تھا اور مجھ سے بھی کہیں فربہ تھا تو اُسے سرنگ کے پتھروں میں سے گزرتے ہوئے یقیناً دشواری ہوئی ہوگی اور باہر آتے ہی اُس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس بھرا.. اور فوراً ہی اُس کی سیاہ پوش پردہ پوش بیوی بھی برآمد ہو گئی..

نوجوان میرے قریب رُکا اور میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ میری خدمت کے عوضانے کے طور پر کچھ پیش کرنے کو ہے.. اور پھر شاید اس نے میرے چہرے پر صدقہ اور خیرات وصول کرنے والوں کی کیفیت نہ دیکھی تو مجھ سے باتیں کرنے لگا..

میں نے کچھ اپنے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ سرنگ کا اصلی رکھوالا غسل کرنے گیا ہے اور میں اُس کی جگہ ڈیوٹی دے رہا ہوں.. ویسے بعد میں مجھے خیال آیا کہ اگر وہ مجھے کچھ رقم عطا کر دیتا تو اچھا ہوتا.. کیسی زبردست کمائی ہوتی.. حضورؐ کے گھر کا راستہ دکھانے کا جو معاوضہ ملتا وہ یا معاوضہ بھی کسی کو ملا..؟

اُس سعودی کی انگریزی اتنی ہی رواں اور زبردست تھی جتنی کہ میری عربی اور اس کے باوجود ہم نے کچھ گفتگو کر لی.. اس دوران وہ بڑے بڑے براؤن یا سیاہ رنگ کے مارموٹ یا نیولے جو کچھ بھی تھے کھائی میں سے اوپر آ کر میرے قدموں کے قریب بے خطر لوٹنیاں لگانے لگے.. تو میں نے سعودی سے ان کے بارے میں پوچھا کہ کیا جانور ہیں.. اُس نے عربی میں جو نام بتایا میں نے اُسے بار بار دہرا کر اپنے تئیں یاد کر لیا کہ ان کا حوالہ دوں گا لیکن وہ ذہن سے اُتر گیا ہے.. البتہ یہ یاد ہے کہ اُس مردِ عرب نے اُن کا نام نہایت رغبت سے لیا اور پھر کہنے لگا.. حرام.. حرام..

ظاہر ہے نیولے یا سانڈے جو کچھ بھی تھے اتنے کریہہ المنظر تھے تو حلال کیسے ہو سکتے تھے

لیکن اُس نے فوراً ہی ایک اضافہ کیا۔ ''یہ.. اِدھر مکّہ میں حرام.. مگر جدہ.. طائف.. ریاض میں حلال حلال...''

یہ منطق میری سمجھ میں نہ آئی.. جانور یا تو حرام ہوگا یا حلال.. یہ تو نہیں لاہور میں حرام ہے اور پشاور میں حلال ہے.. پھر اُس نے جو توجیہہ دی' اُس سے کھلا کہ ایسا ہی ہے.. اگرچہ اس کے لیے شہر سعودی عرب کے درکار ہیں پاکستان کے نہیں.. جو کچھ اس نے اشاروں.. انگریزی.. عربی کی ٹوٹ پھوٹ میں کہا' اس کا سلیس متن یہ تھا کہ یہ بڑا چوہا' نیولا یا مارموٹ جو ہے اِدھر مکّہ میں اور اس کے نواح میں حرام ہے کیونکہ یہ حرم کا علاقہ ہے اور یہاں کسی جاندار کی جان نہیں لی جا سکتی.. ورنہ ہے یہ حلال اور کھایا جا سکتا ہے..

میں اگر بھوک کی وجہ سے مرنے کو ہوتا تو شاید پھر بھی ایک گدھا وغیرہ تو مجبوراً کھا جاتا لیکن اس نیولے کو ہرگز نہ کھاتا.. مر جاتا لیکن نہ کھاتا لیکن عرب کھاتے ہیں اور چٹخارے لے کر کھاتے ہیں' مردِ عرب نے بھی چٹخارہ لے کر ہی اظہار کیا کہ کیا بتاؤں کیسا لذیذ ہوتا ہے.. اُس نے ''لذیذ'' کا لفظ بہت بار دوہرایا.. اور اس دُکھ کا بھی اظہار کیا کہ شوق سے کھاتا ہوں لیکن یہ کہاں روز روز نصیب ہوتا ہے..

وہ جوڑا رخصت ہو گیا..

اب میں پھر تنہا تھا..

لیکن اس تنہائی کی مدت طویل نہ تھی بابا نور اللہ سیڑھیوں سے اُترتا ہشاش بشاش کچھ پڑھتا ہوا یا گنگناتا ہوا نیچے میرے پاس آ گیا.. اور اُس کی واپسی سے مجھ شے کی ایک دن کی بادشاہت کا اختتام ہو گیا..

''غسل کر آیا بابا..'' میں نے پوچھا..

''ہاں مجا آ گیا..''

''پانی کافی تھا؟''

''ہاں پونی بوتل تھا.. اُس میں سے بھی تھوڑا بچا کر لایا ہے.. خوب غسل کیا..''

بابا بنگالی سے بھی میں نے ان بڑے چوہوں کے بارے میں استفسار کیا تو وہ کہنے لگا ''ہم تو نہیں کھاتا.. عرب بہت کھاتا.. اِدھر کا کچھ لوگ ان کو پکڑتا ہے اور عرب لوگ کو بیچتا ہے.. پندرہ بیس ریال میں ایک چوہا بیچتا ہے..''

''لیکن حرم کی حدود میں تو یہ حرام ہے؟''

''ان کو مارتا نہیں صرف پکڑتا ہے.. اِدھر سے زندہ لے کر جاتا ہے اور عرب اِدھر نہیں کھاتا.. طائف اور جدہ میں جا کر ذبح کرتا ہے.. ان کو پکاتا ہے تو بہت بُو آتا ہے.. صرف ہم کو بُو آتا ہے عرب کو نہیں آتا..''

بابا بنگالی اپنی متعدد ٹارچوں کے سیل چیک کرنے لگا.. جن کے سیل کمزور پڑتے محسوس ہوتے ان میں نئے سیل ڈال کر ٹارچ کو روشن کر کے سرنگ کے اندر روشنی ڈالتا..

میں خاموش بیٹھا رہا.. شہروں کی ماں مکّہ سے اوپر آنے والی روشنی میں چہرہ روشن کیے..

فروغ مے سے نہیں فروغ کعبہ سے روشن کیے..

بابا اپنی بیٹری چیکنگ سے فارغ ہوا تو کہنے لگا ''کار میں نہیں جائے گا.. ابھی تو اُدھر بالکل کھالی پڑا ہے.. کوئی نہیں.. جائے گا..''

''نہیں نہیں جائے گا..''

''کچھ پڑھے گا نہیں..''

''نہیں..''

بابا میرے یوں منکر ہونے پر کچھ حیران ہوا..

''لوگ اِدھر پڑھنے آتا ہے گار فُل ہوتا ہے.. گار خالی ہے تو تم کیوں نہیں پڑھتا..''

''جو یاد تھا پڑھ لیا.. اور کچھ یاد نہیں..''

''تو بار بار پڑھ لو.. کیوں نہیں پڑھتا..''

میں نے سوچا اب انکار کیا تو شاید بابا ناراض ہو جائے اور مجھے اپنے ہیجر سے بے دخل کر دے چنانچہ میں نے اُسے دل کی بات بتا دی ''بابا مجھے اکیلے اندر جاتے ہوئے ڈر آتا ہے..''

''ڈرتا ہے..؟''

''ہاں.. جان نکلتی ہے اُدھر تنہا جانے سے..''

''دیکھو ڈر کا کوئی بات نہیں.. اِدھر ہمارا گھر ہے.. اِدھر ہم بہت سالوں سے رہتا ہے اور اِدھر کوئی خطرہ نہیں.. میرا بڑا والا ٹارچ لے جاؤ رات کو ون کرے گا..''

''یار بابا جی.. ڈر پوک مانو ہوں بابا.. اِدھر گار میں کوئی نہیں.. صحن میں اندھیرا ہے تو.. اُدھر جہاں جبرئیل اترتے تھے.. میرے حضورؐ بیٹھتے تھے.. میں اتنی رات میں اکیلا کیسے اُدھر جاؤں.. آپ میرے ساتھ چلو.. صرف تھوڑی دیر کے لیے.. میں دو نفل پڑھ لوں گا.. پھر دونوں واپس آ جائیں گے..''

بابا نور اللہ نے ہاں ناں میں کچھ جواب نہ دیا.. کہ اس کے لیے اس سرنگ کے آخر میں محض

ایک غار تھی وہاں کون اُترتا تھا کون بیٹھا کرتا تھا اُسے اس سے کچھ سروکار نہ تھا.. یہ روزگار کا ایک وسیلہ تھا.. اور طویل قربت عقیدت کو مٹا بھی دیتی ہے..

میں نے ایک اور کوشش کی "بابا.. آپ میرے ساتھ چلو.. مہربانی.."

"چلے گا.. ابھی نہیں پھر چلے گا.." اُس نے مجھے ٹرخا دیا..

نیاز کو گئے ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی..

"بابا یہ نیاز اوپر نہیں آیا اب تک.."

"آ جائے گا.. نہیں آئے گا تو سو جائے گا نیچے کہیں.."

یہ میرے لیے بہت بری خبر تھی..

"وہ آپ کا کھانا بھی تو لائے گا.."

"نہیں لائے گا تو ہم بھی سو جائے گا.. کل کھائے گا.."

چنانچہ یہ ارادہ مصمم کر لیا کہ اگر نیاز نہیں لوٹتا تو میں اکیلا تو غار میں جانے کا نہیں.. بابا بنگالی سے چپکا رہوں گا.. جہاں یہ جائے گا ہم بھی ساتھ جائے گا..

اتنی دیر میں شہر مکہ سے صدائیں آنے لگیں.. ایک دل کو چھو لینے والا ترنم بلند ہونے لگا.. اللہ اکبر.. اللہ اکبر.. یہ صدائیں اُس لَو میں لپٹی ہوئی ہم تک آنے لگیں جو ہمارے چہروں پر تھی.. یہ اذان خانہ کعبہ کی تو نہیں تھی.. شہر مکہ کی سینکڑوں دیگر مساجد سے اٹھنے والی اذانوں کی مشترکہ سمفنی تھی..

"نماز پڑھے گا.."

"ہاں جی.."

"غار میں پڑھے گا.." یہ اُس نے صرف مجھے چھیڑنے کی غرض سے کہا..

"نہیں جی.." میں مسکرانے لگا..

"تو اوپر آ جاؤ.. اوپر ہوا ہے.."

بابا بنگالی کے چھپر سے اُٹھ کر اپنا تنی تھیلا سینے سے لگائے میں اس بابا کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھتا جبل نور کے بلند ترین مقام پر آ گیا..

چوٹی چہار ایستادہ چھپر اب بھی ویران پڑا تھا..

صرف ہم دونوں تھے..

چوٹی سے ذرا ادھر کھلی تھا یعنی جہاں سے سیڑھیاں اترتی تھیں وہاں کھائی کے عین برابر میں

سیمنٹ کا بنا ہوا ایک چوکور تھڑا تھا.. 10X10 کے قریب.. یہ تھڑا اس مختصر مسجد کے فرش کی یادگار تھا جو ترکوں نے اس مقام پر تعمیر کی تھی اور جسے ڈھا دیا گیا تھا.. در و دیوار کا نشان نہ تھا.. فرش ہنوز باقی تھا.. جیسے ہمارے پرانے مکانوں کے سیاہ ہو چکے پکے سیمنٹ کے فرش ہوا کرتے تھے.. چوکور تھڑا ایسا تھا..

مختلف مساجد سے بلند ہونے والی اذانوں میں تھوڑا بہت وقفہ تھا اس لیے یہ صدائیں اب تک بلند ہوتی ہم دونوں جبل نور کے تنہا مکینوں تک مسلسل آ رہی تھیں..

چونکہ اتنی باقاعدگی سے مسلسل نمازیں ادا کرنے کا کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا تھا اس لیے نفل نمازوں اور سنت فرض کے حساب کچھ آگے پیچھے ہو جاتے تھے تو میں نے نور اللہ سے پوچھا "بابا عشاء کی نماز میں کتنے فرض ہیں؟"

"نہیں جانتا.." وہ اپنی بنیان میں ہاتھ ڈال کر نہایت سرشاری سے توند کھجا رہا تھا..

"نہیں جانتا.."

"دو فرض ہے اور بس.."

"بابا مجھے تو کچھ یاد آتا ہے کہ چار فرض ہیں.."

"ہاں چار ہے.. پر تم سفر میں ہوں تو قصر ہے.. اس لیے دو فرض ہے.."

"میں تو سفر میں نہیں ہوں.. جدہ سے آیا ہوں.."

"جبل نور چڑھ کر ادھر آیا ہے ناں تو اس سے بڑا کیا سفر ہوگا.. دو فرض.."

"میں اگر چار پڑھ لوں تو کوئی حرج ہے.."

"نہیں.." وہ پہلی بار کچھ غصے میں آ کر بولا "قصر ہے.. صرف دو پڑھ.."

میں ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ بابا نور اللہ نے ترکوں کی مسمار شدہ مسجد کے فرش پر کھڑے ہو کر نماز پڑھی.. فارغ ہوتے ہی فرش کے جس کنارے سے کھائی گرتی تھی وہاں لیٹ کر چند لمحوں میں ہی بے سدھ ہوا اور خراٹے لینے لگا..

اب اس منظر کی ایک مختصر تصویر بنانے کی اجازت ہو تو یہ تصویر کچھ یوں بنتی ہے کہ وادی مکہ کی بلند ترین چوٹی جبل نور پر ہم دونوں.. میں اور بابا نور.. نہ صرف چوٹی پر بلکہ اس پہاڑ کے پورے وجود پر صرف ہم دونوں فرد ہیں.. اور یہاں بھی اس مقام پر بھی مکہ کی روشنیاں ہمارے چہروں پر چراغاں کرتی ہیں.. اور بابا نور گسل کے مزے لوٹ کر نماز عشاء ادا کر کے اس تھڑے کے عین کنارے جہاں سے کھائی شروع ہوتی ہے وہاں بے سدھ نیند میں گم ہے بلکہ خراٹے بھی لے رہا ہے..

تو میں کم از کم جاگنے والوں میں تنہا ہوں..

اُس پکے 10X10 فٹ کے چوکور تھڑے پر کھڑا ہوتا ہوں..

میرا خیال ہے کہ میرا وضو اب تک قائم ہے مگر کچھ پتہ نہیں.. زیادہ کھوج بھی نہیں کی کہ پانی کمیاب تھا اور تیمم کا کچھ تجربہ نہ تھا کہ کیسے کیا جاتا ہے..

کھڑے ہو کر میں کانوں کو چھوتا ہوں.. ہاتھ باندھتا ہوں.. نیت کرتا ہوں کہ منہ وِل کعبہ شریف..

اور کعبہ شریف میرے سامنے ہے..

بالکل سامنے تو نہیں.. کہیں نیچے.. اور جبل نور سے دور شہر کی روشنیوں میں ایک کھلونا.. ایک ماڈل.. ایک منی ایچر تصویر.. ایک جادوگری کوہ قاف کے دامن میں واقع ایک ناقابل یقین سحر کی صورت نظر آ رہا ہے.. آنکھ کا دھوکا.. ابھی ہے ابھی آنکھ جھپکو تو پھر نہ ہوگا..

اور کیا واقعی منہ وِل کعبے شریف ہے؟.. نہیں.. ہرگز نہیں.. زندگی میں پہلی بار نہیں کہ سامنے دیکھتا ہوں تو سیاہ آسمان ہے.. جس پہاڑ میں غارِ ثور ہے رات کی سیاہی میں اُس کا ایک موہوم سا وجود نظر آتا ہے.. کعبہ تو بہت نیچے ہے.. سامنے نہیں ہے.. میری نگاہ سیمنٹ کے فرش پر پڑتی ہے اور وہاں سے نیچے گرتی وادیٔ مکہ کی روشنیوں کے درمیان خانہ کعبہ کے سحر تک جاتی ہے.. وہ سامنے نہیں.. بہت نیچے ہے..

تو اس تصویر میں.. جبل نور کے کل وجود پر صرف میں ایک تنہا شخص ہوں جو ہاتھ باندھے کھڑا ہوں..

نہ مجھ پر رقت طاری ہوئی کہ کہاں یہ مقام اور کہاں میں اللہ اللہ.. نہ آنسو بہے.. نہ اپنی خوش بختی پر نازاں ہوا اور نہ ہی گناہوں کے دھلنے کا کچھ احساس ہوا.. البتہ اُس رات کی بلند تنہائی میں یہ جی چاہا کہ یونہی اس منظر میں کھڑا رہوں.. یہ فرض کبھی اختتام کو نہ پہنچیں.. ابد تک کھڑا رہوں.. اس کیفیت کا لطف لیتا رہوں.. لیکن کہاں تک طول دیتا' بالآخر سلام پھیرا اور پھر کھڑا ہو گیا.. مبہوت اس منظر کو اپنے اندر اُتارتا رہا.. کہ مجھے عمر خضر ملنے کا امکان تو ہو سکتا تھا ایسی تنہائی اور یہ منظر دوبارہ ملنے کا امکان نہیں ہو سکتا تھا..

اسے جی بھر کے بھی نہیں دیکھا جا سکتا تھا..

جی کیسے بھر سکتا تھا..

میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میری پنڈلیاں اور شانے احتجاج کر رہے ہیں.. بے چینی سے پنڈلیاں کروٹ لیتی ہیں اور شانے درد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھلے مانس پچھلے تقریباً دس گھنٹے سے تم نے ہمیں [illegible] چوٹی تک جبل نور کی کٹھن چڑھائی ہم سے کروائی.. پھر

صحن میں کھڑے رہے.. کبھی سرنگ کی چوکیداری کروائی کہیں باقاعدہ ستانے کا موقع ہی نہیں دیا.. واقعی تھکاوٹ کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہ ملا تھا اور اب جا کر جو احساس ہوا تو بدن پتھر کا لگنے لگا چنانچہ مناسب یہی جانا کہ کچھ دیر کے لیے استراحت فرمائی جائے..

میں نے بابا بنگالی کے تتبع میں اسی تھڑے کی دوسری جانب.. یعنی بابا تو کھائی کے کنارے نیند کرتا تھا اور میں تھڑے کی دوسری جانب جس کے برابر سے راستہ نیچے جاتا تھا وہاں اپنا تھیلا سر کے نیچے تکیے کے طور پر جما کر لیٹ گیا.. سیمنٹ میں ہلکی سی ٹھنڈک تھی.. اور ایسے رُخ پر لیٹا جہاں سے کعبہ کا روشن کھلونا روپ آنکھوں کے سامنے موجود رہتا تھا.. اب آنکھیں بند کون کرے..

سو چا کھلی آنکھوں کے ساتھ بھی تو استراحت فرمائی جا سکتی ہے..

لیکن اب یہ تھا کہ وہ چوہے یا مار موٹ مجھے استراحت فرمانے نہ دیتے تھے..

کبھی میرے پاؤں کو چھوتے.. انہیں سونگھتے کھسر پھسر کرتے گزر جاتے.. اور کبھی اُس چٹان پر رینگتے جو غارِ حرا کے صحن سے نظر آتی ہے.. اور کبھی میرے اور بابا جی کے درمیان تھڑے پر قلابازیاں لگانے لگتے..

یوں لیٹنے سے ایک اور مسئلہ بھی درپیش ہوا.. عام زندگی میں تو اتنا خیال کبھی نہیں رکھا لیکن جب نانی جان حیات تھیں تو خیال رکھنا پڑتا تھا کہ وہ ڈانٹ دیتی تھیں کہ ہائے ہائے قبلے کی جانب پاؤں کیے لیٹے ہو.. کچھ شرم حیا ہے تم میں کہ نہیں.. دن میں کئی بار شامت آ جاتی تھی.. وہ رخصت ہوئیں تو ہم بھی بے احتیاط ہونے لگے.. اور یہاں مسئلہ یہ درپیش تھا کہ قبلہ کو نظر انداز کر دینا ممکن نہ تھا وہ تو سامنے بلکہ نشیب میں روشن تھا.. اور میں جان بوجھ کر اُسے نظر کے سامنے رکھ کر لیٹا تھا.. اگر یوں لیٹا تھا تو پاؤں اُس کی جانب ہو گئے تھے.. شرمندگی ہوئی کہ محض منظر کے چاؤ میں کھلے عام بے ادبی ہو رہی ہے.. چنانچہ اپنا تھیلا اُٹھایا' دوسری جانب ہو کر سر کعبے کی جانب اور بدن جبل نور کی چوٹی کی طرف.. اب صرف چوٹی کا پتھر نظر آتا تھا.. یہاں بھی مسئلہ درپیش رہا کہ میرے سر کے اُس حصے میں جہاں بال کم ہو رہے ہیں وہاں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ کعبہ وہاں مسلسل دستک دیتا ہے کہ میں یہاں ہوں اور تم منہ موڑے بے رُخی برتتے ہو.. ایسا بلند روشن اور یکتا دیدار کہ صرف تم وہاں سے مجھے دیکھو.. میرے نبیؐ کے پہاڑ پر اس لمحے تنہا تم ہو تو مجھے دیکھو اپنی آنکھوں میں زندگی بھر کے لیے اس دیدار کو بھر لو کہ پھر یہ دیکھنے کو نہیں ملے گا.. بے شک ہم نے تمہیں پھر سے بلا لیا.. ایک انعام کا بہانہ بنا کر بلا لیا اور بے شک تم یہاں پہنچتے ہی پھر سے بلاوے کی عرضیاں ڈالنے لگے.. اگر کوئی عرضی منظور ہو جاتی ہے.. تو میرا اور آیندہ بھی تم پہ وا ہو سکتا ہے لیکن ایسا کبھی نہیں ہونے کا جواب ہو رہا ہے.. تم کبھی یوں اس بلند مقام سے.. اس رات میں جب کہ تم ایسے سیاہ

اعمال والے کا بھی چہرہ جبلِ نور کے ہم رنگ ہو رہا ہے.. ایسا کبھی نہ دیکھو گے.. تو دیکھ لو..

خواہش تو میری بھی یہی تھی اب اُدھر سے بھی اشارہ آ گیا تھا.. چنانچہ میں پھر اُٹھا تپتی ہتھیلیاں اُٹھا کر پھر اُسی مقام پر چوٹی کی جانب جا رکھا اور اُس پر اپنا سر رکھا اور اُس روشن مکعب کے دیدار کو اپنے سامنے کیا.. البتہ پاؤں میں نے سمیٹ لیے.. گھٹنے سینے کے ساتھ لگا لیے جیسے ماں کی کوکھ میں بچہ سمٹا ہوتا ہے.. تا کہ وہ.. وَل کعبے شریف نہ ہوں..

یہ اکتوبر کی تاریخ تھی.. اکتوبر 2003ء

اس اونچائی پر اُن نیولوں کی سرسراہٹیں تو مسلسل تھیں لیکن ہوا ذرہ بھر نہ سرکتی تھی نہ سرسراتی تھی.. خنکی کا ہلکا سا لمس بھی نہ تھا.. ویسے اتنی گرمی بھی نہ تھی کہ بدن بے چین ہو جائے.. البتہ تھڑے کے ننگے سیمنٹ میں کچھ ٹھنڈک تھی..

اگرچہ اس بلندی تک وادیٔ مکّہ میں رواں ٹریفک کا شور شدت سے نہ آتا تھا.. یہاں آتے آتے اُس کا دم گھٹتا تھا اور وقفوں سے مدھم مدھم آتا تھا لیکن اب محسوس ہوتا تھا کہ اُس میں بھی کمی آ رہی ہے..

میں بندوبست تو کر سکتا تھا لیکن جان بوجھ کر کیمرہ نہ لایا تھا.. تا کہ میری توجہ نہ بھٹکے.. میں ہمہ وقت نئے زاویوں کی تلاش میں نہ رہوں.. ہر شے کو کیمرے کی آنکھ سے نہیں اپنی آنکھ سے دیکھوں.. ان پتھروں اور منظروں کو ہمہ وقت اس نظر سے نہ دیکھوں کہ کدھر سے اور کہاں سے بہترین رُخ بنتا ہے ایک عمدہ تصویر کے لیے..

کوئی کیمرہ اس لائق نہ تھا کہ وہ ان کے مقابلے میں اہمیت اختیار کر جاتا.. میں ان پتھروں اور منظروں کو ایک ایسی شے نہیں بنانا چاہتا تھا جس کی تصویریں اُتاری جاتی ہیں.. ان کا مقام کہیں آگے تھا' برتر تھا.. میں انہیں مجروح نہیں کرنا چاہتا تھا.. اس کے علاوہ میں اپنی دیگر کوہ نوردیوں کی مانند تصویریں اُتار کر بعد میں اپنی سٹڈی ٹیبل پر پھیلا کر اُن کی مدد سے منظر کی تفصیل اور کیفیت بیان نہیں کرنا چاہتا تھا.. اُن پر انحصار نہیں کرنا چاہتا تھا.. میں یہ تصویریں پتھروں اور منظروں کی اپنے اندر اُتارنا چاہتا تھا.. تا کہ یہ بیان ایک نقش کے سکوت سے مستعار نہ لیا گیا ہو بلکہ جو کچھ میں اپنی آنکھوں سے اپنے وجود میں جذب کرتا ہوں قلم پکڑتے ہوئے وہ اُس کی جب سے پھوٹے بے شک اُس میں ہر پتھر کا حدود اربعہ.. ساخت اور ہر مقام کی لمبائی چوڑائی ٹھیک تلی نہ ہو.. بھلا ب کتاب میں تھوڑی بہت کسر رہ جائے.. لیکن بیان میرے بدن کا ہو.. اُس کے اندر جو تصویریں نقش ہوتی تھیں اُن کا ہو..

بابا بنگالی مسلسل کئے بعد کی گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا اور آس پاس سے غافل تھا.. بلکہ

کا فل تھا.. کا فل سوتا تھا..

دیدار بے شک جیسا بھی بے مثل ہو آنکھیں بالآخر جھکتی ہیں تو میں کچھ دیر آنکھیں بند کر کے اونگھنے کی سعی کرتا رہا لیکن بند آنکھیں بھی کھلی رہتی کہ اُن میں سے خانہ کعبہ کا روشن کھلونا رخصت نہ ہوتا..

میں ایک پُرمسرت اطمینان اور شرابور شانتی میں تھا.. کہ بہ شرطِ زندگی میں آج کی رات تو انہی چٹانوں اور پتھروں میں گزاروں گا.. جن میں بابا کے سانسوں کی مہک تھی.. اُن کی ہتھیلیاں اور پاؤں تھے.. بے شک غارِ حرا کے اندر نہ سہی.. اس کے صحن میں نہ سہی.. یہیں کہیں.. یہاں بھی اس تھڑے پر بھی.. یا بابا بنگالی کے چھپر کے برابر میں جو ہموار جگہ ہے اُس کے سنگریزوں پر ہی سہی.. یہ رات تو یہیں بسر ہوگی.. اور یہ اطمینان مجھے بے انت مسرت اور سرخوشی سے سرشار کرتا تھا اور میں اس خیال میں اپنی مسکراہٹ پر اختیار نہ رکھتا تھا..

ایک اور سادگی یا حماقت کا اقرار کر لوں.. میں خانہ کعبہ کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھتا کبھی کبھار اپنا دایاں بازو فضا میں بلند کر کے جیسے اُسے.. ہیلو.. کہتا.. اور پھر مسکرانے لگتا.. اور کبھی بایاں بازو اُٹھا کر.. باقاعدہ قدرے بلند آواز میں.. تھینک یو سر.. کہتا..

میں یہاں اس بیان میں اپنی قصہ گوئی کی علت اور کہانی کہنے کی عادت کو جہاں تک ممکن ہے.. میرے بس میں ہے.. بروئے کار لانے سے نہ صرف اجتناب اور گریز کر رہا ہوں.. بلکہ مبالغے سے بھی حتی الامکان قطع تعلق کرتا ہوں اور اُس شب کو ممکنہ مکالموں اور بے جا تقدس میں ڈوب کر وہاں تک نہیں لے جاتا جہاں تک وہ نہیں تھی.. اپنی خصلت اور فطرت پر جہاں تک ایک مٹی کے انسان کے لیے ممکن ہے قابو پا کر مکمل ایمانداری سے اُس رات کو جوں کا توں بیان کرنے کی سعی کر رہا ہوں.. اور اس کے باوجود کہیں میں جذبات میں بہہ جاتا ہوں.. بھول جاتا ہوں تو اسے درگزر کرنا آپ کے اختیار میں ہے.. کہ میں نے نہ تو اُس شب کے بارے میں.. اُس شب میں کوئی نوٹس تیار کیے اور نہ ہی ایک ایک لمحے کی تفصیل یاد رکھنے کی کوشش کی..... اُن لمحوں کو جذب کرتا رہا.. انہیں یادداشت کی بھٹی پر چڑھا کر پختہ نہیں کیا..... اُن سے گوندھی ہوئی مٹی سے بہت بعد میں حرا کا ایک کوزہ بنایا.. اپنے تئیں جو دیکھا ہو وہ ہو بہو بنایا.. ویسا بنانے کی کاوش کی.. اُس کوزے پر وہ رنگ نہیں لگائے جو وہاں نہیں تھے.. داد حاصل کرنے کی خاطر نہ رنگ آمیزی کی اور نہ ہی اپنی کاریگری کے جوہر دکھائے.. اُسے اپنے تئیں جوں کا توں.. ہو بہو بنایا.. وہ جیسا تھا اُسے ویسا ہی بنانے کی کاوش کی..

چنانچہ اب میں یہ بھول رہا ہوں کہ یہ بابا بنگالی تھا جس نے کروٹ لے کر آنکھیں کھولیں اور میں اُسے واضح طور پر دیکھ نہیں سکتا تھا.. کہ وہ بجلی لو کے باوجود اندھیرے میں تھا.. اُس پر.. جو رات اُتر

رہی تھی اُس کی سیاہی غالب تھی تو اُس نے کہا کہ.. بابا گار میں نہیں جائے گا.. اکیلا پڑا ہے.. جاؤ..

یا وہی تنگی تھیلا سرہانے دھرے خانہ کعبہ کے روشن جمال کو آنکھوں میں اُتارتے ہوئے میرے ذہن میں ایک جھما کا سا کوندا.. کہ تم یہاں بیکار لیٹے ہو.. اُس گھر کو تکے جاتے ہو جس کا سیاہ کعب یہاں سے دکھائی نہیں دیتا ایک شائبہ دیتا ہے.. اسی گھر کو تکے جاتے ہو اور وہ گھر خالی پڑا ہے جہاں ایک شمع نے اُجالا کیا تھا.. پورے جبلِ نور پر صرف تم ہو جو اُسے آباد کر سکتے ہو.. اُسے چند لمحوں کے لیے اپنا گھر بنا سکتے ہو.. اور تم ہو کہ یہاں بیکار لیٹے ہو.. بہت معتوب کیا اپنے آپ کو.. اُن زمانوں میں صحن کے ہجوم میں کود جانے کا سوچتے تھے اور اب وہ صحن خالی پڑا ہے اور تم بیکار لیٹے ہو.. اپنے آپ کو سرزنش تو بہت کی..

نیچے سرنگ میں داخل ہوتے بھی خوف آئے گا کہ بابا بنگالی بھی ادھر خراٹے لے رہا ہے وہاں اپنی ٹارچ کے ساتھ موجود نہیں.. اور سرنگ کے اندر تو گھٹا ٹوپ اندھیرا ہوگا.. چٹانیں حائل ہوں گی.. اور دوسری جانب نکلوں گا تو نہ صرف صحن تاریکی میں تنہا بھائیں بھائیں کر رہا ہوگا بلکہ غار کی روپوشی میں پتہ نہیں کون ہو کیسا ہو.. تو وہاں تک پہنچ بھی گئے تو کیا ٹھہر سکو گے.. سہہ سکو گے..

ان تمام سوالوں کے جواب اگرچہ ”نہیں نہیں“ میں آتے چلے جاتے تھے لیکن میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ دیکھو بھائی نہ اُس سُرنگ میں نہ صحن میں اور نہ غار کے اندر کوئی ڈر ہے کہ یہ بابا کا گھر ہے.. یہ سب تمہارے ڈرپوک بدن کے واہمے ہیں تو ذرا ہمت کرو.. جاؤ تو سہی.. اگر ڈر نے تمہیں جکڑ کر تمہیں بہت ہی بزدل کر دیا تو بے شک دوہائی دیتے ہوئے بھاگ آنا اور یہیں بابا بنگالی کے پاس آ بیٹھنا.. زیادہ سے زیادہ ہارٹ فیل ہو جائے گا تو یہ ہونا ہے کبھی نہ کبھی.. نہ گئے تو ذرا اس پچھتاوے کا حساب کرو جو تمہیں عمر بھر ہوتا رہے گا.. تو اٹھو.. شاباش!

اُٹھا تو ذرا لڑکھڑایا کہ وادیٔ مکہ کی روشنیاں مزید گہرائی میں چلی گئیں.. میں نے یہاں تک آنے کے لیے خاص طور پر ایسے جوگر پہنے تھے جن کے تسمے نہ ہوں تا کہ انہیں بار بار کھولنے اور باندھنے کا جھنجھٹ نہ ہو.. ایسے آپس میں چپک جانے والے فلیپ ہوں کہ پاؤں جوگرز میں ڈال کر انہیں پل بھر میں بند کیا جا سکے.. چنانچہ اپنے جوگر جو میں نے لیٹتے ہوئے قریب دھرے تھے اور جنہیں متعدد نیولے سونگھ چکے تھے پل بھر میں پہنے تنگی تھیلا کمر پر بوجھ کیا.. تھیلے میں جو دودھ کی بوتل تھی جس کے کونے میری کمر میں چبھتے تھے وہ اب اذیت نہ دیتے تھے کہ اس میں سے بابا ایک گھونٹ بھر چکے تھے..

جبلِ نور کی چوٹی پر جو چھپر تھا وہاں بابا بنگالی راج کرتی تھی کوئی نہ تھا.. وہاں جو دو چار افراد

کاروبار کرتے تھے اور جن میں نیاز بھی شامل تھا نیچے جا چکے تھے چوٹی کے برابر میں سیمنٹ کے تھڑے پر مجھے تو یہی لگتا تھا کہ ابھی نہیں تو تھوڑی دیر میں یہ کروٹ بدلے گا تو کھائی میں جا گرے گا بابا بنگالی بے سدھ سوتا تھا.. تھکن کے مزے لوٹتا تھا..

میں تھڑے سے ہٹ کر دوسری جانب نیچے اُترنے کے لیے پہلی سیڑھی تک آیا.. سیڑھیوں پر بے شک وہ ہلکا نور تھا جو شہرِ مکہ کا عکس تھا لیکن میں نے چھوٹا ٹارچ آن کر لی اور اپنے عمر رسیدہ گھٹنوں کا خیال کرتا احتیاط کرتا ایک سیڑھی پر اُتر کر دونوں جوگر پہلے جما کر پھر دوسری پر قدم رکھتا.. یہ کتنی سیڑھیاں ہوں گی جو سرنگ تک پہنچاتی تھیں.. شاید بیس کے قریب ہوں گی.. ان سیڑھیوں پر سے اُترنا تنہا ایک رات میں.. یہ بھی ایک منفرد احساس تھا.. جیسے میکسیکو کے گھنے جنگلوں میں مایا تہذیب کے کھنڈروں میں کچھ فلائٹ اور گھاس بھری سیڑھیاں ہوں جن پر صدیوں سے کسی اور نے قدم نہ رکھا ہو.. اور کوئی قدم رکھے اور نہ جانتا ہو کہ یہ سیڑھیاں اُسے کہاں لے جائیں گی.. لیکن میں جانتا تھا..

میں بابا بنگالی کے چھپر تلے آن پہنچا جہاں میں ابھی ابھی رکھوالا ہوا تھا.. اور یہ کیا کہ چھپر تلے غارِ حرا میں اُترنے والی سرنگ کے سیاہ دہانے اور تنگی کو دیکھ کر مجھے ڈر نہیں آیا.. میرے دل میں کوئی ہول نہیں اُٹھا.. میں نے ٹارچ کا رُخ اس کی سیاہی کی جانب کیا اور اطمینان سے اندر چلا گیا.. اپنے سر کو جھکی ہوئی چٹانوں سے بچاتا.. پتھر جو فرش میں اُبھرے ہوئے تھے اُن پر چڑھتا اُترتا.. میں وہاں تک پہنچ گیا جہاں ایک دیوہیکل بولڈر اس سرنگ کو تقریباً بلاک کر دیتا تھا.. لیکن میں آگاہ ہو چکا تھا کہ اس چٹانی دیوار کے دائیں جانب سے گزرنے کا نسخہ یہ ہے کہ اس کے قدموں میں جو ایک پتھر ہے اُس پر اپنا بایاں پاؤں جما کر ذرا اونچا ہو کر اور سانس تھوڑا سکیڑ کر بولڈر اور دیوار کے درمیان میں جو ایک چھوٹی سی جگہ ہے جو مختصر خلا ہے اُس میں سے گزرا جا سکتا ہے.. سو میں گزر گیا..

اور یہاں سے آگے روشنی دکھائی دینے لگی..

اگرچہ عام آنکھوں کے لیے وہاں تاریکی تھی لیکن سرنگ کے گہرے اندھیرے کی عادی آنکھوں کے لیے آگے روشنی واضح تھی..

میں صحن میں نکل آیا..

سُونا تاریک اور چپ.. کہیں کوئی آہٹ تک نہ تھی ہوا کی بھی سرسراہٹ نہ تھی جیسے ہر شے نیند میں ہو..

لیکن میں نے اُس لمحے جب سرنگ سے باہر آ کر صحن میں قدم رکھا ہے تو اُسے یکسر فراموش کر دیا ہے کہ راستے میں تنگی سرنگ سے نکل کر مجھے خیال آ گیا کہ میرے بابا بھی تو اسی سرنگ میں سے

نکل کر یوں صحن میں داخل ہوتے ہوں گے.. کوئی ایک بار نہیں.. برس ہا برس تک بار بار.. وہ بھی تو میری طرح اپنا سر جھکی ہوئی چٹانوں سے بچاتے.. قدموں تلے جو پتھر ناتراشیدہ اُبھرے ہوئے ہیں اُن کا دھیان رکھتے.. غالباً نہیں یقیناً اُس بڑے بولڈر کو راہ میں حائل پا کر اُس کے اور دیوار کے درمیان جو مختصر خلاء ہے اُس میں سے گزر کر.. اور اُسی چھوٹے پتھر پر پاؤں رکھ کر.. اپنا بایاں پاؤں رکھ کر ذرا بلند ہو کر اُس خلاء میں سے گزرتے ہوں گے تو اُس پتھر پر اُن کی چپل جمتی ہوگی جسے وہ خود گانٹھتے تھے.. اگرچہ ان چودہ سو برسوں میں کروڑوں نہیں اربوں لوگوں نے یہی سرنگ اختیار کی اُسی پتھر پر پاؤں رکھ کر پار ہوئے لیکن میرے لیے اُن سب کا کوئی وجود نہ تھا.. اُن کے پاؤں کا کوئی نشان نہ تھا.. ابھی بابا نے وہاں قدم رکھا تھا تو اُن کے فوراً بعد میں نے اُن کے نقشِ پا پر اپنا قدم جمایا تھا.. البتہ ایک فرق تھا کہ میں تو بمشکل اپنی توند سمیٹ کر اُس خلاء میں سے گزرا تھا اور وہ ایک تو خیز چیتے کے پیٹ والے تھے ہوا کے ایک جھونکے کی مانند آسائش سے گزر جاتے ہوں گے..

اور وہ بھی تنہا.. میری طرح آتے ہوں گے..

تو جب وہ سرنگ پار کر کے اس صحن میں داخل ہوتے ہوں گے تو پہلے کیا کرتے ہوں گے.. اُن کے ہاتھوں میں ایک عصا بھی ہوگا جو ان دنوں رواج تھا اور خاص طور پر پہاڑ پر چڑھنے کے لیے ایک واکنگ سٹک کا کام دیتا ہوگا تو پہلے وہ اُس عصا کو رکھتے ہوں گے اور پھر وہ اپنی کمر پر بوجھ کیے ہوئے تھیلے کو اُتارتے ہوں گے.. یقیناً جہاں یہ دیوار ہے جو تب نہیں تھی صحن کا کنارا تھا اس کنارے کے قریب جا کر وہاں سے نیچے جھانکتے ہوں گے.. اُن زمانوں میں تو یہاں نہ صرف بندر بلکہ بڑے بن مانس بھی پائے جاتے تھے تو شاید یہ جاننے کے لیے جھانکتے ہوں گے کہ کہیں آس پاس کوئی شریر بندر تو نہیں جو اُن کی خوراک کا تھیلا اُٹھا کر لے جائے.. اور یہ تو نہیں کہ وہ فوراً کھوہ میں جا بیٹھتے ہوں.. وہ کچھ دیر اس صحن میں ٹھہرتے ہوں گے..

میں تا دیر اُس سرنگ کو جو اس تاریکی میں کم کم دکھائی دیتی تھی دیکھتا رہا کہ جب بابا اُس میں سے برآمد ہوتے ہوں گے تو کیسے لگتے ہوں گے.. اچھے لگتے ہوں گے..

یہ صحن چند فٹ نہیں.. بالکل مختصر سا ہے.. شاید 8X8 فٹ کا ہوگا..

اور میں نے ابھی تک جان بوجھ کر غار کی جانب نگاہ نہ کی تھی کہ کہیں ڈر پھر سے غالب نہ آ جائے..

میں نے آگے بڑھ کر صحن کی دیوار پر کہنیاں ٹکا کر نیچے نگاہ کی.. بندر جا چکے تھے یا کہیں ہو بیٹھے تھے.. اور پھر اُسی ... جو وادی پھیلی تھی اُس میں کہیں کہیں روشنیاں تھیں اور پہاڑیوں کے

اندھار سیاہی میں تھے.. بار بار یہاں کھڑے ہو کر نیچے جھانکتے ہوں گے تو کیا دیکھتے ہوں گے.. اُن زمانوں میں جو چراغ جلتے تھے اُن کی روشنی یہاں سے کہاں دکھائی دیتی ہوگی.. ویرانی اور بے آبادی اور تاریکی کے سوا اور کیا دیکھتے ہوں گے..

ابھی تک میں ڈر کی جھجک میں تھا..

خوفزدہ نہ تھا لیکن خوف نے ابھی تک دامن چھوڑا نہ تھا..

مقام کی وحشت اب بھی مجھے اسیر کرتی تھی..

یعنی میں عام زندگی کے اطمینان میں سانس نہ لیتا تھا.. ہر سانس کے ساتھ تھوڑا بہت ڈر کچھ ہچکچی کھلی ہوئی آتی تھی..

اور پھر شاید اس لیے کہ مجھے یہاں رات گزارنے کی منظوری مل گئی تھی..

تو اس منظوری سے منسلک ایک خیال مجھ پر اُترا.. جیسے یہ مقدس زمین ہے اپنے جوتے اُتار دو.. کہ اس مقام پر نہ کوئی آسیب ہو سکتا ہے نہ کوئی بدروح اور نہ ہی کوئی آفت والے جنات.. خوفزدہ کیوں ہو.. ڈرتے کیوں ہو.. وحشت کس بات کی کہ اس مقام پر جہاں جبرئیل آتے تھے.. جہاں بابا آتے تھے جن کے لیے وہ آتے تھے.. اور جو اُن کا گھر تھا.. تو وہاں کسی آسیب بدروح یا جنات کی جرأت ہے کہ کوئی آئے.. کسی میں سکت ہے.. اگر خدا کے گھر کے بعد کوئی ایسا گھر ہے جو ان واہموں اور خدشوں سے پاک ہے تو یہ ہے.. تو بے خوف ہو جاؤ..

تو میں ایسا بے خوف ہوا.. نڈر ہوا کہ زندگی بھر کبھی ایسا تو نہ ہوا تھا..

اور میں نے جبلِ نور کے دامن میں پہنچ کر اس پر پہلا قدم رکھنے سے پیشتر جو ایک اطمینان بھرا سانس لیا تھا پہلی بار ویسا اطمینان والا بے خوف سانس لیا..

غارِ حرا تاریکی میں تھی لیکن اُس کے فرش پر سنگِ مرمر کی جو چند سلیں تھیں اُن کی سفیدی دکھائی دے رہی تھی..

میں نے ٹارچ کی روشنی پہلی بار غار کے اندر پھیلائی صرف یہ اطمینان کرنے کی خاطر کہ اندر کوئی اور تو نہیں..

سب سے پہلے میں نے اپنا تنگ تھیلا کمر سے اُتارا.. غار کے دہانے کے دائیں جانب ایک ہموار پتھر تھا اُس پر رکھا.. پھر اپنے جو گرز کے فلیپ جدا کر کے انہیں اُتارا اور اسی پتھر پر رکھ دیے.. اگر چہ یہ بے ادبی تھی لیکن اس کے سوا چارہ نہ تھا.. اگر اس غار کو گھر بنانا ہے تو شب بھر کے لیے تو اس کے سوا

اور کوئی چارہ نہ تھا۔ تھیلے کے برابر میں میں نے ٹارچ رکھ دی تاکہ ضرورت پڑنے پر ہاتھ بڑھا کر اُسے حاصل کیا جا سکے۔۔یعنی خوراک اور پانی سرہانے رکھ لیا۔۔

اور پھر غارِ حرا کے فرش پر۔۔اگرچہ وہاں پہلے سے ایک بوسیدہ اور لاکھوں نوافل کی جبینوں سے گھسا ہوا ایک مصلیٰ بچھا ہوا تھا جو مجھے پہلے نظر نہ آیا تھا اُس پر اپنی بہو رابعہ کا عطا کردہ اُس کے بابا کا جائے نماز بچھا دیا۔۔جیسے مجھے خدشہ ہو کہ کیا پتہ کوئی اور آ جائے اور قابض ہو جائے۔۔نیلی رنگتوں اور سرو کے درختوں کے نقوش والا جائے نماز وہاں بچھا کر جیسے میں نے اس گھر میں اپنا سامان رکھ دیا ہو اور اگر کوئی آئے تو اُسے کہہ دیا جائے۔۔کہ اس کھوہ میں تو صرف ایک بندے کی گنجائش ہے۔۔میں پہلے آ گیا ہوں۔۔

اپنے ذاتی جائے نماز پر کھڑے ہو کر۔۔اس یکتا تنہائی اور نیم تاریکی میں جب میں نے نفل ادا کرنے کی نیت کی۔۔اور منہ دل کعبے شریف کیا۔ تو مجھے مکمل یکسوئی حاصل نہ ہوئی کہ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں جبلِ نور کے کل وجود پر۔۔بابا بنگالی کے خفتہ وجود کے سوا۔۔یکسر تنہا غارِ حرا میں ہوں۔۔ میری نظر جائے نماز پر نہ تھی۔۔میں غیر شعوری طور پر سامنے اُدھر دیکھتا تھا تنگ ہوتی غار کے آخر میں نظر آتی ایک مختصر شگاف میں سے پھوٹتی روشنی کو دیکھتا تھا کہ اس میں سے خانہ کعبہ کا سراپا نظر آئے گا کہ روایت یہی تھی۔۔لیکن وہاں کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا سوائے ایک چھوٹے سے شگاف کے۔۔جس میں سے وادیٔ مکہ کی چند بجھتی ہوئی روشنیوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔۔

میں نے سلام پھیرا اور وہیں اُسی حالت میں بیٹھ گیا۔ میری پشت صحن کی جانب تھی اور میرے شانوں کا رُخ کھوہ کی نیم تاریکی کے سامنے تھا۔۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں لیکن اب غارِ حرا میں بیٹھے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ یہ روایتی معنوں میں ایک غار ہرگز نہیں ہے۔۔ایک قدرتی آماجگاہ نہیں ہے۔۔ان گنت صدیوں پیشتر کسی قدرتی آفت کے نتیجے میں جبلِ نور کی ہی چند چٹانوں نے جگہ بدلی۔۔اِدھر آن گریں اور ایسے زاویے اور انداز میں آن گریں کہ اُن کے درمیان میں ایک کھوہ وجود میں آ گئی۔ کھوہ کے اوپر اور دائیں بائیں بڑے بڑے پتھر آڑے ترچھے ایک دوسرے کے ساتھ ٹیک لگائے ایک دوسرے کے سہارے لاکھوں برسوں سے اسی حالت میں قائم ہیں اور اسی لیے غارِ حرا ایک عام غار کی مانند مکمل طور پر بند اور ہوا سے عاری مقام نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے کے سہارے آرام کرتے پتھروں کے درمیان میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے شگاف ہیں جن کے راستے سے ہوا کا چلن جاری رہتا ہے۔۔اور گھپ اندھیرے میں بیٹھے ہوئے بھی ان شگافوں میں سے کہیں کہیں کی روشنی نازل ہوتی رہتی ہے۔۔اور چھت میں جو ایک شگاف ہے اُس

میں سے آسمان کا ایک ٹکڑا ابھی دکھائی دے جاتا ہے۔۔

غار کے اندر ذرا سا جھک کر اپنے سر کو چٹان سے بچاتے ہوئے داخل ہونا پڑتا ہے۔۔

غار کے داخلے پر جہاں میں نے مصلیٰ بچھایا تھا وہاں بس ایک ہی مصلے کی گنجائش تھی۔۔البتہ بائیں ہاتھ پر فرش سے دو تین انچ بلند تھوڑی سی ہموار جگہ ہے جس پر سنگِ مرمر کی چند سلیں جڑی ہیں اور جب بہت زیادہ ہجوم ہو جائے تو کوئی شخص سمٹ سمٹا کر اپنے سر اور دائیں کندھے کو بچا کر بمشکل نفل پڑھ سکتا ہے ورنہ گنجائش نہیں ہے۔۔

جہاں میرا مصلیٰ ختم ہوتا تھا اس کے آگے غار تنگ ہونے لگتی ہے اور اس روزن یا شگاف پر جا ختم ہوتی ہے جو ایک تختی سے نصف سائز کا ہوگا۔۔جہاں سجدہ کرتے ہیں یعنی مصلیٰ کا آخر وہاں سے آگے جانے کے لیے رینگنا پڑتا ہے لیکن دو چار ہاتھ بعد اس کا حجم اتنا تنگ ہو جاتا ہے کہ آپ کا سر اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔۔اور اس تنگ جگہ کے آخر میں وہ شگاف ہے۔۔اسی شگاف کے بارے میں روایت ہے کہ حضورؐ یہاں عبادت کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو اس میں سے خانہ کعبہ نظر آتا تھا۔۔عین ممکن ہے کہ چودہ سو برس پیشتر یہ شگاف قدرے بڑا ہو اور پھر قدرتی طور پر چٹانوں کے کھسکنے سے یا کسی زلزلے کے باعث یہ مختصر ہو گیا ہو۔۔بہرطور اب اس میں سے خانہ کعبہ نظر نہیں آتا۔ شہرِ مکہ کی چند روشنیاں البتہ نظر آتی ہیں۔۔یا پھر ایسا ہے کہ جیسے اس شب میں نے تجربہ کیا کہ آپ غار کے بائیں جانب جو چٹان ہے اس کے ساتھ رخسار لگا کر گردن ایک خاص زاویے پر اکڑا کر ذرا ترچھے ہو کر ایک خاص زاویے سے شگاف کو دیکھیں تو کعبہ کا ایک مینار اور وہ بھی کسی حد تک نظر آ جاتا ہے۔۔اور اس حالت میں آپ زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتے۔۔

تو ایک شگاف ہے تنگ ہوتی غار کے آخر میں۔۔

اس کے علاوہ مصلیٰ کے عین اوپر۔۔دو شگاف ہیں۔۔اور پھر دائیں ہاتھ پر بھی چٹانوں میں ایک روزن ہے۔۔تاریکی میں یہ غار کے گہرے سکوت میں قدرے نمایاں ہوتے ہیں اور ہوا کی مدھم سرسراہٹ ان کے راستے سے در آتی ہے۔۔

ان کے علاوہ ایک اور قدرے بڑا شگاف ہے جو غار کے اندر بیٹھنے سے نظر نہیں آتا کیونکہ یہ کھائی کی جانب غار کے دہانے پر ہے۔۔یہ اندر داخل ہونے سے پیشتر دائیں جانب دیکھا جا سکتا ہے۔۔ لیکن آسانی سے نہیں۔۔اسے تلاش کرنا پڑتا ہے۔۔غار کے دہانے پر جو چٹانیں ہیں ان کے ساتھ پھر رخسار جما کر ایک خاص زاویے پر جھک کر اسے دریافت کیا جا سکتا ہے۔۔اور بہت کم لوگ ہیں جو یہ شگاف تلاش کر سکے کہ اس تک جھانکنے اور کوشش کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔۔اور ان لوگوں کے پاس وقت نہ تھا

اور میرے پاس پوری رات تھی جس میں میں نے بس اسی قسم کی تحقیقی حرکتیں کرنی تھیں.. اور بس یہ وہ شگاف ہے کہ آپ چٹان کے ساتھ رخسار جوڑ کر ایک خاص زاویے سے دیکھیں تو خانہ کعبہ اس میں ایک تصویر کی مانند جڑا نظر آنے لگتا ہے.. رات کو تو یہ منظر اپنی روشن خوبصورتی سے پریشان کر دیتا ہے، گنگ کر دیتا ہے کہ مکمل تاریکی میں سیاہ چٹانوں کے فریم کے درمیان میں یہ ایک ایسا خواب ہوتا ہے جو آپ جاگتے میں دیکھ رہے ہوتے ہیں.. لیکن آپ بہت دیر تک اطمینان سے اس منظر کو مسلسل نگاہ میں نہیں رکھ سکتے کہ وہاں اس زاویے پر چٹان کے ساتھ رخسار جوڑے تادیر کھڑا رہنا ممکن نہیں ہوتا..

جیسے کوئی مکین اپنے گھر کا.. چاہے وہ ایک شب کا گھر ہی کیوں نہ ہو.. اُس کا تفصیلی جائزہ لیتا ہے کہ دروازہ کہاں ہے.. کھڑکیاں کتنی ہیں اُس کا حدود اربعہ جاننا چاہتا ہے ایسے ہی اگر میں بابا کے گھر میں ایک شب کا مہمان تھا تو اُس گھر کے روزن کھڑکیاں اور شگاف تو میں نے تفصیل سے دیکھنے تھے اور بیان کرنے تھے.. اور شاید اس لیے بھی کہ ان کی تفصیل آج تک کسی نے بیان نہیں کی.. یہ فرض مجھے سونپا گیا ہے..

شاید آپ کو یہ گمان گزرے کہ میں یہ تفصیلی معائنہ ایک عمارتی انجینئر کی طرح نہایت ٹھنڈے دماغ سے کاروباری انداز میں کر رہا تھا.. نہیں جی.. ایسا کرتے ہوئے ان شگافوں کو ہر پہلو سے دیکھتے ہوئے.. کبھی جھکتے کبھی چٹانوں سے چمٹ کر انہیں تلاش کرتے ہوئے میرا بدن اور میرے حواس اگرچہ ڈر سے خالی تھے پر وہ نہ تھے جو جبلِ نور کے تھڑے پر تھے.. یہ کوئی اور بدن تھا.. ہر چند ساعتوں کے بعد ایک عجیب سی تھرتھراہٹ میں تھرانے والا بدن.. اپنے بابا کی موجودگی کا احساس کرنے والا کچھ حواس باختہ بدن تھا.. میں ہمہ وقت ہوشیار اور آگاہ تھا کہ میں کہاں ہوں اور جانتا تھا کہ یہ ساعتیں.. میری بقیہ زندگی بھر کی ساعتوں پر حاوی رہیں گی..

اور نہ ہی محض مشاہدے اور غار کے جغرافیے کو ذہن نشین کرنے کا یہ عمل مسلسل تھا..

نہیں.. میں کچھ دیر بیٹھا رہتا اور پھر یکدم بدن میں ایک برق سی کوند جاتی... ایک گھبراہٹ طاری ہو جاتی کہ ہیں بیکار بیٹھے ہو.. اُٹھو.. اور کچھ نہ کرو تو اس غار کے پتھروں کو چھونے لگو.. اُن پر ایک نابینا کی مانند ہاتھ پھیرو کہ شاید کہیں تمہاری انگلیوں کے پوٹوں تلے "اقراء" کے حرف ابھرنے لگیں گے اُسی ہیئت میں.. اُسی رسم الخط میں.. جس میں وہ اُترے تھے.. اور میں اُٹھ کر اُس گھبراہٹ اور سراسیمگی میں اُٹھ کر پھر سے اُن پتھروں کو تاریکی میں ٹٹولنے لگتا.. اُن پر ہاتھ پھیرتا.. اُن کی ہیئت کا اندازہ لگانے لگتا..

اور ... یکدم یہ خیال بدن میں آ ... کے ایک بادبانی کشتی کی مانند تیرنے لگتا کہ تم جائزہ

لے رہے ہو.. پتھروں کے حساب کتاب کر رہے ہو.. غارِ حرا کی رات میں تنہا ہو تو اُس کی جانب رُخ نہیں کرتے جو ان پتھروں میں رہائش کرنے والے کو محبوب جانتا تھا تو میں.. منہ دل کعبے شریف.. نیت کرتا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا..

نوافل ادا کرتے ہوئے.. اُس غار کی تاریکی میں تنہا کھڑے ہوئے یوں تو مجھے قواعد کے مطابق بھوک پیاس سے بے نیاز ایک روحانی کیف میں مستغرق ہونا چاہیے تھا لیکن میں ایسا کور بخت تھا کہ میرا بدن مجھ سے باغی ہو کر دوہائی دینے لگا "ثواب اپنی جگہ، یہ مقام بھی اپنی جگہ.. لیکن مجھے بھوک لگی ہے.. مجھے پیٹ کا کچھ ایندھن دو.. کھلاؤ پلاؤ.. خالی پیٹ مجھ سے عبادت بھی نہیں ہوتی.. یکسوئی منتشر ہوئی جاتی ہے..

پہلے تو ازحد شرمندگی ہوئی پھر خیال آیا کہ شرمندگی کی کوئی بات نہیں.. پیٹ میں روٹیاں نہ ہوں تو سب گلاں کھوٹیاں ہوتی ہیں، بے شک یہ غارِ حرا کی گلاں ہوں.. اور کیا بابا یہاں بھوکے پیاسے بیٹھے رہتے تھے.. وہ بھی تو اپنے ستو.. کھجوریں اور دودھ کاندھے پر بوجھ کر کے یہاں تک لاتے تھے.. اور اماں خدیجہ بھی تو نیچے سے اُن کے لیے کھانے پینے کا سامان کبھی کسی خادم کے ہاتھ اور کبھی اپنی بالڑی فاطمہ کے ہاتھ یہاں بھیجتی تھیں تا کہ گلاں کھوٹیاں نہ ہوں.. تو شرمندہ نہ ہو کہ یہ بھی تو سنتِ رسولؐ ہے..

سلام پھیر کر میں وہیں بیٹھ گیا البتہ دوزانو ہو کر نہیں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا.. میری پشت صحن کی طرف تھی اور میرے شانوں کا رُخ تنگ ہوتی کھوہ کے آخر میں جو روزن کھلا تھا اُدھر کو تھا..

میں اگر برگزیدہ ہوتا، پارسا اور خود کو یادِ الٰہی میں فراموش کر دینے والا ہوتا تو مجھ میں یہ طلب پیدا ہی نہ ہوتی.. لیکن میں نہ تھا.. میں تو اپنے بابا کے نقشِ قدم پر چلنے والوں میں سے تھا.. اگر اُن کو بھوک لگتی تھی تو مجھے بھی لگ رہی تھی..

چنانچہ میں نے ہموار سطح پر رکھے تنگ تھیلے کو اٹھایا اور اُس کا گلا گھونٹنے والی تنی کو کھینچ کر اسے آزاد کیا..

لیکن تھیلے کو کھولنے سے پیشتر میں نے اپنا رُخ موڑا.. چہرہ صحن کی جانب کیا اور پشت دل کعبے شریف کی کہ آپ نے اگر تن تندور کی آگ بجھانی ہو تو آپ ایک عارفی کی تجلی کو سامنے نہیں رکھتے، کچھ عمل الٹا، کچھ آسمان اور ہوا کے طلب گار ہوتے ہیں جو صرف صحن کی جانب رُخ کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی تھی..

اگرچہ میں ثابت تو نہیں کر سکتا.. اور نہ ہی سیرت کی کسی کتاب میں یہ تفصیل ملتی ہے لیکن میں

جانتا ہوں کہ بابا کو بھی جب بھوک ستاتی ہوگی تو وہ اپنے گیان میں سے باہر آ کر صحن کی جانب چہرہ کر کے ہی اپنے خوراک کے تھیلے کو کھولتے ہوں گے.. اگر وہ اُٹھ کر صحن میں نہیں جا بیٹھتے ہوں گے تو.. اس کا مجھے یقین ہے..

میں نے اپنے تئیں شعوری طور پر یہ سعی کی تھی کہ میں غارِ حرا میں قیام کے لیے وہ خوراک لے کر جاؤں جو میرے بابا لے کر جایا کرتے تھے.. جدہ میں ستو نہیں ملتے تھے لیکن کھجوریں وافر تھیں بے شک اجوا نہ تھیں.. بے شک دودھ کسی بکری یا اُونٹنی کا نہ تھا کسی امریکی ملٹی نیشنل کا تیار کردہ گائیوں وغیرہ کا تھا.. پر دُودھ تو تھا..

تو میں نے بسم اللہ کھجوروں سے کی.. کیا یہ میرا وہم تھا کہ غارِ حرا میں بیٹھے ہوئے.. چوکڑی مار کر بیٹھے ہوئے ان میں مٹھاس اور طرح کی تھی.. کیا اجوا کی مٹھاس غار کی ہواؤں میں اب تک موجود تھی.. کھجوروں کی گٹھلیاں میں نے سنبھال کر رکھ لیں..

پھر دُودھ کی بوتل کا ڈھکن کھول کر ایک لمبی ڈیک بھری.. دودھ ابھی تک قدرے ٹھنڈا تھا اور گاڑھا تھا اور میرے بُجثے میں ایک آہستہ رو سفید آبشار کی مانند اُترا.. بوتل وہی تھی.. جس کے بارے میں میں گمان کرتا تھا کہ بابا اس میں سے ایک گھونٹ بھر چکے ہیں.. اُن کے شیریں لب اس کے منہ کو چھو چکے تھے اور یہ دودھ اُن کا جھوٹا تھا.. جو میں نے پیا تبھی تو اس نے مجھے ایک کیف سے بھر دیا تھا.. پھر میں نے ایک چھوٹا سا چکن سینڈوچ نہایت لطف اندوز ہوتے ہوئے کھایا.. اس گھپ اندھیرے میں ایک سیب کو اپنے دانتوں سے آشنا کیا..

پھر دُودھ کے دو گھونٹ بھرے..

ضیافت مکمل ہوگئی اور یہ کیسی شاندار ضیافت تھی..

نہ کوئی جبل نور کی چوٹی پر دکھائی دیتا تھا.. صحن ویران پڑا تھا.. اور رات کے دس بجنے کو تھے.. اور بندر سو چکے تھے اور بکریاں گھروں کو لوٹ چکی تھیں اور وہ مارموٹ بھی شاید اپنے بلوں میں پوشیدہ ہو چکے تھے.. میں نے اس گھر میں اتنے اطمینان اور بے پروائی سے ڈنر کیا جیسے ازل سے یہی میرا ڈیرہ ہے.. ہمیشہ سے یہیں رہتا آیا ہوں.. اس مقام کے سوا میں نے آج تک کوئی اور خوراک کہیں اور تو نوش نہیں کی..

یہ ایسی شاندار ضیافت تھی..

یہ اقرار کرنے میں کچھ حرج نہیں کہ بے شک دنیا بھر میں.. اس عمر تک جو اپنے بابا کی عمر سے

تجاوز کرنے کو ہے.. اب تک جہاں کہیں بھی میں کسی دسترخوان پر بیٹھا اور جو کچھ بھی کبھی رغبت سے کھایا وہ سب کچھ.. اس شب کے حرا کے سادہ طعام کے سامنے.. ہیچ تھا.. سب کچھ ہیچ.. بے معنی' بے روح اور کھانے کے سوا..

اور طعام کے بعد مجھے حسب عادت سگریٹ کی طلب ہوئی..

یہاں تو نہیں..

غار کے اندر تو نہیں..

گھر کے اندر تو نہیں..

باہر صحن میں.. جہاں کھلی فضا ہے.. ہوا ہے.. میں نے ایک سگریٹ سلگا لیا..

بے شک کچھ معترضین ہوں گے جن کی جبینوں پر تقدس آمیز شکنیں اُبھریں گی کہ یہ کیسا بے ادب ہے کیسے مقام پر دھواں کشی کر رہا ہے.. اُن کا اعتراض کسی حد تک شاید بے جا نہیں ہے.. لیکن میں اعتراف کرنے والوں میں سے ہوں.. میں نہایت آسانی سے اس قصۂ شب میں سے سگریٹ نوشی حذف کر سکتا تھا.. لیکن کیوں کروں..

جو گزری سو وہی ہو بہو بیان کیوں نہ کروں..

میں دیوار پر کہنیاں ٹکائے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا.. جس کھائی میں آج شام بندر کبھی اس چٹان پر اور کبھی اس پتھر پر کودتے تھے.. جہاں ہنومان مہاراج راج کرتے تھے اُس سے کہیں نیچے گہرائی کے دامن کے آگے جو وادی پھیلی ہوئی تھی اُس کے اکا دُکا مکانوں میں سے بیشتر کی روشنیاں بجھ چکی تھیں اور اُن سے پرے جو پہاڑیاں تھیں وہ تاریکی میں چلی گئی تھیں..

ذہن میں کیا کیا خیال تیرتے تھے.. کبھی کچھ کبھی کچھ.. عینی اس لمبے آئرلینڈ میں کیا کر رہی ہوگی.. سلجوق شاید اپنی ماں کے ساتھ بیٹھا دُکھ سکھ پھول رہا ہوگا.. رابعہ تو یقیناً پڑھائی میں مشغول ہوگی اور بے بی سمیر بھی یقیناً کسی ریستوران میں دوستوں کے ساتھ قہقہے لگا رہا ہوگا.. بہن بھائی کیا کر رہے ہوں گے.. ابا جی اور امی کی قبروں کے گرد بہت تاریکی ہوگی.. کیا وہ سب بھی میرے بارے میں اس لمحے کچھ سوچتے ہوں گے.. پھر ایک اور خیال آیا اور میں مسکرانے لگا..

اے تارڑ! تم تو یہاں پہنچ کر دوہائی دینے کی تیاری کر رہے تھے.. تمہارا خیال تھا کہ ڈر تمہیں نگل لے گا.. تم سہہ نہ سکو گے.. ہول تمہیں گرفت میں لے لے گا.. تم برداشت نہ کر سکو گے اور اب مزے سے یہاں کھڑے سگریٹ پھونک رہے ہو..

وہ وحشت کہاں گئی جس کے تابع تم نے بابا سے درخواست کی تھی کہ وہ اس صحن میں آ کر

سوئے.. نہ سویا تو میں یہاں ٹھہرنے کا نہیں..

سب وا ہے.. ہول اور وحشتیں رخصت.. اور میں جیسے اپنے گھر میں بے خوف اور بے خطر ہوتا ہوں.. لیکن نہیں یہ مثال درست نہیں کہ میں اگر اپنے گھر میں کبھی تنہا ہو جاؤں اور رات ہو اور بے شک تمام روشنیاں جل رہی ہوں تو بھی مجھے وہاں تنہائی سے خوف آتا ہے.. میں سو نہیں سکتا اور ہر آہٹ پر جاگ جاتا ہوں... یہاں میں شانت اور بے ڈر ایسا تھا جیسے کسی کوہستانی سفر سے واپسی پر میں اپنی والدہ سے لپٹ جاتا تھا اور اُن کے دوپٹے میں سے ماں کی جو مہک آتی تھی اُسے سونگھتا ایک اطمینان اور کیف میں چلا جاتا تھا.. میں یہاں ایسا ہو چکا تھا..

میں نے کاہے کو نیاز سے درخواست کی کہ وہ یہاں رات گزارے..

میں تو یہاں اپنی ماں کی مہک میں آسودہ تھا..

میں اپنے گھر میں تھا.. اپنی گار میں تھا..

میں تسلی اور امن میں تھا.. آس پاس خوف نہ تھا ماں کے دوپٹے کی مہک تھی..

جب میری والدہ کا انتقال ہوا تو میں نے خواہش کی کہ اُن کا کوئی دوپٹہ کوئی چادر سنبھال لوں.. تا کہ کبھی زندگی کا آزار سہا نہ جائے تو اُسے ناک سے لگا کر اس میں رچی ہوئی ماںتا کے بدن کی خوشبو کو سونگھ کر کچھ لمحوں کے لیے اُن کے پاس چلا جاؤں.. پھر سوچا کہ یہ بے سود ہے.. جس بدن سے وہ مہک پھوٹتی تھی وہ تو مٹی میں مٹی ہو گیا.. اُس مہک کی سپلائی تو ہمیشہ کے لیے منقطع ہو چکی.. ایک دوپٹے میں وہ کب تک ٹھہری رہے گی وہ بھی خالی ہو جائے گا.. تو فائدہ..

اور یہاں میں نے پھر اُس مہک کو محسوس کر لیا تھا..

ڈر سے خالی ہو جانے کا سبب وہی تھا.. کہ بابا کے اس پتھریلے گھر میں کوئی بھوت پریت.. کوئی جادو ٹونا.. سحر.. کوئی واہمہ.. کوئی وسوسہ جرأت نہیں کر سکتا کہ اس کے آس پاس بھی پھٹک جائے.. تو ڈر کس بات کا..

ایک اور جواز بھی تھا.. مجھے یہاں.. اس آس پاس.. چار چفیرے.. آلے دوالے میں آئے ہوئے چار گھنٹے ہو چکے تھے اور میں مانوس ہوتا جاتا تھا.. ہر پتھر.. اُس پتھر کے سائے.. صحن کی سنگریوں.. اس کی دیوار کی اینٹوں کی کھردری بناوٹ اُن کی موٹائی چوڑائی.. غار پر جھکی آڑی ترچھی ایک دوسرے کے سہارے آرام کرتی چٹانوں کی اندھیرے میں ابھرتی شکلوں.. صحن سے ملحق جبل نور کی چوٹی تک پہنچتی چٹان کی ہیئت.. ان سب سے واقف ہوتا جاتا تھا.. ڈر اَن جانے کا ہوتا ہے.. جسے جان لیا جائے وہ اپنا ہو جاتا ہے.. اس سے کوئی [illegible]

سگریٹ ختم کرنے کے بعد میں نے اس کا اختتام کھائی کے نیچے پھینک دیا.. اگرچہ یہ آلودگی کے ضمن میں آتا تھا لیکن وہاں پہلے سے ہی بہت ڈبے اور پلاسٹک کی بوتلیں تھیں تو میری اس ایک انچ کی ملفلق آلودگی سے کیا فرق پڑتا تھا..

میں نے سوچا کہ غار پر تو میرا قبضہ ہو چکا ہے.. میرا رہائشی سامان اس میں سجا ہے اور اگر بفرضِ محال کوئی آ بھی گیا تو جان جائے گا کہ یہاں کوئی آباد ہے تو ابھی سے نیند میں چلے جانے کو ہی نہیں چاہتا تو کیوں نہ بابا بنگالی کی خیریت دریافت کی جائے.. نیاز کا پتہ کیا جائے.. ذرا ہوا خوری کی جائے..

میں چھوٹا ٹارچ روشن کر کے سرنگ میں چلا گیا.. اور اس کی روشنی بھی آشنا ہو رہی تھی کہ میں کس پتھر پر پڑ رہی ہوں.. اور جس ہاتھ نے مجھے تھام رکھا ہے وہ جب بھی مجھے متوازی حالت سے ذرا اونچا اور افقی سطح پر کرتا ہے تو جو پتھریلی جھکی ہوئی چھت ہے اس میں کہاں کہاں نوکیلی اور کھردری چٹانیں ہیں جنہیں میں نے روشن کرنا ہے..

کیا یہی وہ سرنگ تھی جس میں تنہا داخل ہونے سے میری روح فنا ہوتی تھی؟

نہیں.. یہ تو اب میرے گھر کا راستہ تھا..

جونہی میں سرنگ کے دوسری جانب بابا بنگالی کی جھگی میں آ نکلا.. تو میرا چہرہ پھر سے اس لو کی لو میں آ کر منور ہو گیا جو وادیٔ مکہ کے کوچہ و بازار کی روشنیوں سے جنم لیتی مدھم مدھم یہاں تک پہنچ رہی تھی.. سیڑھیاں طے کرتا ہوا جب میں اوپر سیمنٹ کے تھڑے تک پہنچا تو بابا بنگالی کو خراٹے آمیز بے سدھ نیند میں نہ پایا بلکہ وہ آلتی پالتی مارے ایک رغبت بھرے انہماک سے لبنانی روٹی کے ساتھ مرغ روسٹ نوش کرنے میں مگن تھا.. اتنے رغبت بھرے انہماک سے کہ اُسے میری آمد کا بھی علم نہ ہوا.. اور جب علم ہوا تو بھی بدستور مرغ نوشی میں مشغول رہا اور میری جانب دیکھے بغیر کہنے لگا
''کھانا کھائے گا؟''

''آپ بسم اللہ کرو..'' اگرچہ وہ کر چکا تھا ''میں ابھی ابھی کھا کر آیا ہوں..''

''نیچے جا کر کھایا ہے؟''

''نہیں.. ساتھ لایا تھا.. گار میں بیٹھ کر کھایا ہے..''

''کیا کھایا ہے؟''

''کھجور.. سینڈوچ.. سیب اور دودھ..''

''مرغ کھائے گا..''

"نہیں.. شکریہ!"

"اچھا.." اُس نے کہا اور پھر کھانے میں جُت گیا..

وادیٔ مکہ کی رہائشی بستیوں کی نصف سے زیادہ روشنیاں گل ہو چکی تھیں لیکن اُن کے درمیان وہ منی ایچر خانہ کعبہ.. وہ کھلونا سا کعبہ.. بدستور ایک زیبائشی ماڈل کی مانند نور کے ایک الاؤ کی مانند دمک رہا تھا.. میں نے بہت کوشش کی کہ اس کے درمیان جو سیاہ پوش گھر ہے اُس کا تعین کر سکوں لیکن کر نہ سکا.. روشنیوں کی اتنی چکا چوند تھی کہ کوئی ایک بناوٹ اُن میں سے الگ ہو کر دکھائی نہ دیتی تھی.. کبھی شائبہ سا ہوتا تھا کہ درمیان میں ایک سیاہی کی جھلک واضح ہوتی لگتی ہے اور پھر وہ شائبہ اگلے ہی لمحے منظر کی روشنیوں کے انبار میں گھل جاتا تھا..

وہ بھورے مارموٹ اپنی بلوں میں نہ گئے تھے.. ابھی تک تھڑے کے قریب جو چند پتھر تھے اُن پر مسخریاں کرتے رینگتے اُچھلتے آس پاس ہی منڈلاتے تھے.. شاید بابا بنگالی کے ڈنر کی باقیات یعنی روسٹ مرغ کی ہڈیوں وغیرہ کی چاہت میں منڈلاتے تھے..

اور ہاں میں بھول گیا..

یکسر بھول گیا..

میں نے آپ کے گوش گزار کیا تھا کہ اس تحریر کو لکھتے ہوئے میرے پاس نوٹس، حوالوں یا تصاویر کا کوئی سہارا نہیں..

صرف یادداشت کو سہارا بناتا ہوں..

اپنے آپ میں اُتر کر.. آس پاس سے غافل ہو کر.. اپنے گھر.. سٹڈی ٹیبل پر روشن لیمپ.. رات کے اس پہر جب کہ سردی کی شدید لہر میری سٹڈی کو.. بلکہ شیلف در شیلف ڈھول جمع کرتی جو کتابیں چھت تک جاتی ہیں اُن میں جو حروف ہیں اُنہیں بھی منجمد کرتی ہے.. تو میں ہیٹر کی کمی کو محسوس کرتا.. ٹھٹھرتی اُنگلیوں میں قلم کو قائم کرتا سعی کرتا ہوں کہ غارِ حرا کی اُن ساعتوں کو اپنے ذہن کے پردے پر متحرک کروں اور اُنہیں بیان کرنے کی کوشش کروں.. اور یادداشت کے اوراق اس سعی کے دوران آگے پیچھے ہو جاتے ہیں.. تو ایسا ہو ہی جاتا ہے.. ایسا اس طرح ہوا کہ میں ایک ورق بھول ہی گیا تھا.. بہت نادر ورق.. جو آپ کو شاید قطعی طور پر اہم نہ لگے اور آپ میری سادگی پر مسکرانے لگیں..

اس ورق پر ایک بلی ہے..

ابھی کچھ دیر پہلے جب نمازِ عشاء کی ادائیگی کے بعد کھائی کنارے بابا بنگالی خراٹے لیتا تھا اور میں مخالف سمت میں تھڑے کے کنارے پر آرام کرتا تھا اور وہ بڑے چوہے میرے پاؤں کو سونگھتے تھے تو

ان کے سوا کچھ بلیاں بھی وہاں محوِ خرام تھیں.. کم از کم پانچ چھ محوِ خرام تھیں.. اپنے حسن کے تکبر میں نخرے کرتی ہوئی بلیاں.. اور اُن میں سے کوئی ایک بلی آہستگی سے میرے قریب آئی.. دبے پاؤں آئی.. مجھے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ملاحظہ کیا.. اور میری آنکھیں بجھی بجھی تھیں اور اُس کی ہیروں کی مانند تاریکی میں لشکتی تھیں.. وہ میرے چہرے کا معائنہ کرتی رہی اور ظاہر ہے میں نے حرکت نہ کی تا کہ وہ ڈر نہ جائے.. اور پھر نہایت بے خوفی سے وہ بلی میری بائیں ٹانگ کے برابر میں اپنا کندھا جوڑ کر بے حد پیار سے اُسے رگڑنے لگی..

جیسے بلیاں اپنے مالک کے بدن کی قربت کی خواہش میں ہولے ہولے لاڈ کرتی رگڑتی ہیں..

اب میں اس بلی کو.. جبل نور کی بلی کو.. کو کیا کہہ سکتا تھا..

اسے نہ تو دفع دور کہہ سکتا تھا اور نہ شو شو کر کے بھگا سکتا تھا کہ حرم کی حدود میں رہنے والی بلی تھی اور محترم بلی تھی.. چنانچہ میں خاموش لیٹا اُسے اپنی ٹانگ کے ساتھ مزے کرتا تکتا رہا.. کچھ دیر بعد وہ اس عمل سے اُکتا گئی اور اسی بے رُخی سے جیسے وہ آئی تھی چلی گئی اور اندھیرے میں تحلیل ہو گئی..

ایک بلی کی یاد کا یہ ورق اس لیے اہم ہے کہ یہ اُس کی پہلی اور آخری نمود داری نہیں تھی.. ابھی اس نے اس بیانیے میں ایک نہایت تاریخی کردار ادا کرنا تھا..

تو ابھی ابھی اس گمشدہ بلی ورق کی دریافت سے پہلے بابا نور اللہ نے کھانے کی صلح ماری تھی اور میں نے اُسے آگاہ کیا تھا کہ میں ابھی ابھی غار میں کھا کر آیا ہوں اور اس نے صرف "اچھا.." کہا تھا اور کھانے میں جُت گیا تھا..

چھپر تلے کی تاریکی میں سے کوئی شخص نمودار ہوا..

میرے قریب اپنائیت سے آیا..

یہ نیاز تھا..

اس نے بھی پہلا سوال یہی پوچھا کہ.. کھانا کھا لیا ہے..

بابا بنگالی جبل نور کے دامن میں واقع کسی ریستوران کا کھانا.. نیاز کا لایا ہوا کھانا.. کھانے میں ہمہ تن مشغول تھا..

بالآخر جب فارغ ہوا تو شاپر بیگ کو سمیٹا اور اس میں کچھ ہڈیاں کھنکتی تھیں اور اُسے نہایت احترام سے جبل نور کی کھائی میں لڑھکا دیا.. وہیں بیٹھے بیٹھے ذرا سا آگے جھک کر کہ وہ کنارے پر براجمان

تھا.. اور پھر اُٹھ کھڑا ہوا "اب سوتا ہے"

"اپنے چھپر تلے سوتا ہے؟" میں نے پوچھا..

"نہیں.. اُدھر فجر کو آئے گا.. اب جرا نیچے جو کھلا جگہ ہے جدھرا اپنا دوسرا لوگ سوتا ہے اُدھر اوا میں سوتا ہے.." یہ کہہ کر اُس نے ایک تسلی آمیز ڈکار لیا' اپنی بڑھتی توند پر ایک تشکر آمیز ہاتھ پھیرا اور یہ پوچھے بغیر کہ تم کہاں سوتا ہے.. میری موجودگی سے سراسر غافل ہو کر چوٹی کے چھپر میں گم ہو گیا..

نیاز نے ایک بوسیدہ سا کھیس سینے سے لگا رکھا تھا..

"تارڑ صاحب.." اُس نے صرف اتنا کہا..

"ہاں بھئی.." میں نے بھی صرف اتنا ہی کہا.. لیکن اپنی جگہ سے ہلا نہیں..

میں اُس کی بے وجہ عنایت کا اتنا ممنون تھا کہ اُسے ہرگز.. اس لمحے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ برادر عزیز نیاز تم بے شک اُس کھلی جگہ پر جا سوؤ جہاں بابا بنگالی جا رہا ہے اور جہاں تمہارے رفیق ہوا کے جھونکوں میں رات کرتے ہیں کیونکہ مجھے تمہاری ہمسائیگی کی ضرورت نہیں میں ڈر سے آزاد ہو چکا ہوں..

"فجر کے ٹائم اٹھتا ہوں.." وہ کہنے لگا "اس ٹائم حاجی لوگ آنے لگتے ہیں.. پھر سارا دن دوڑ دھوپ کرتا ہوں.. فوٹو اُتارتا ہوں.. شام کو جوس اور منرل واٹر کے دو کریٹ نیچے سے اوپر لانا میری ذمہ داری ہوتی ہے.. اُنہیں ڈھوتا ہوں.. اور پھر رات ہوتی ہے تو تھوڑے آرام کے بعد نیچے کھانا کھانے اور بابا نور اللہ کا کھانا لانے کے لیے چلا جاتا ہوں.. تھک جاتا ہوں.. تو چلیں.."

"چلیں.."

میں اُسے نہیں روک سکتا تھا.. نہیں منع کر سکتا تھا کہ نہیں.. نہیں چلیں.. مجھے اب تمہاری موجودگی درکار نہیں' تم میرے لیے فالتو ہو چکے ہو کہ میں نے ہی اُس کی منت سماجت کی تھی.. اور اگر وہ اُس وقت انکار کر دیتا تو میں کب کا نیچے جا چکا ہوتا..

میرے ذہن میں مسلسل یہ شک تو سر اُٹھاتا تھا کہ یہ بندہ اتنا بے غرض نہیں ہو سکتا جتنا دکھائی دیتا ہے.. ضرور کل سویرے یہ مجھ سے کچھ ریال نکلوا لے گا.. ایک بھاری ٹپ کا امیدوار ہو گا تبھی تو اتنا ہمدرد اور مددگار ہے ورنہ میرا کیا لگتا ہے.. جیسے تاریخی نوعیت کی حامل عمارتوں.. ریلوے سٹیشنوں اور ایئر پورٹوں کے باہر بیٹھے ہوئے منتظر جو گائیڈ اور ٹیکسی ڈرائیور ہوتے ہیں.. ہاتوں میں موہ لیتے ہیں اور پھر آپ کو کنگال کر دیتے ہیں تو اس مقام پر جہاں تاریخ کا آغاز ہوا تھا یہاں جو شخص ہو گا اور اگر صرف ایک رات کے لیے بھی کوئی اتنا ہمدرد ہو سکتا ہے.. لیکن ایسا نہیں تھا.. اُس میں جو بے غرضی تھی اُسے صرف میری

خود غرضی مشکوک بناتی تھی ورنہ.. یہ اُس کی خصلت اُس کی جبلت تھی کہ وہ میرا ساتھ دے رہا تھا.. کسی بھی لالچ یا فائدے کے لیے نہیں کہ ایسے لوگوں کی گفتگو نہایت لچھے دار اور سحر انگیز ہوتی ہے جب کہ نیاز بہت کم بولتا تھا ایک سادہ شخص تھا.. اور جب وہ جبل نور کے تھڑے سے اُترتی سیڑھیوں پر میرے آگے آگے اُتر رہا تھا تو اُس کے اُترنے سے میں نے بھانپ لیا کہ یہ شخص کوئی غرض نہیں رکھتا..

آخری سیڑھی کے بعد جب بابا بنگالی کا چھپر آیا تو اُس نے میرا انتظار کیا کہ میں ہر سیڑھی پر نیم اندھیارے میں دیکھ بھال کر قدم رکھتا تھا..

تاریکی بڑھ گئی تھی.. نیچے سے بلند ہونے والی لو مزید مدھم ہو چکی تھی..

ہم دن میں نہ تھے ایک رات میں تھے..

"چلیں صاحب.." وہ سرنگ کے دہانے پر میرا منتظر تھا..

چھوٹی ٹارچ جس کی روشنی کی مدد سے میں سیڑھیاں اُترا تھا اب میں نے اُس کا رُخ سرنگ کے اندرون کی جانب کیا اور نیاز کے ہمراہ اندر چلا گیا.. بے خطر اور ہر پتھر سے آشنا ایک ایسے کوہ پیما کی مانند جو بہت بار ان راستوں پر چل چکا ہے.. بے جھجک راستے کے ہر پتھر سے آگاہ چلتا ہے..

جب ہم صحن میں داخل ہوئے تو نیاز کہنے لگا "صاحب آپ تو ایکسپرٹ ہو گیا ہے.. لیکن آپ کا سامان کہاں ہے.. اوپر تو نہیں چھوڑ آئے.."

"نہیں.. غار میں ہے.."

نیند اُس پر غالب آ رہی تھی.. ہم تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے.. صحن کی دیوار کے ساتھ لگ کر تاریکی میں ڈوب جانے والی وادی پر نظر کرتے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے.. اور پھر اُس نے سرنگ کے قریب صحن میں سے جبل نور کی چوٹی تک اُٹھتی چٹان کے پہلو میں اپنا کھیس بچھایا' بازو دکھیڑ کر اُس پر سر رکھا اور لمحوں میں بے سدھ ہو گیا.. نیند میں چلا گیا.. اُس چٹان کے برابر میں اُس کا ایک ساکت حصہ ہو کر اوجھل ہو گیا..

تاریکی نے اُسے گم کر دیا تھا..

اگرچہ وہ موجود تھا لیکن ظاہر نہ تھا..

اگر کوئی بھی شخص سرنگ کے راستے صحن میں داخل ہوتا تو اُسے اُس کی موجودگی کا شک بھی نہ ہوتا.. وہ چٹان سے لگا اندھیرے میں اوجھل ہو چکا تھا.. ظاہر نہ تھا..

تو دراصل یہ وہ ساعت تھی جب میری رات کا آغاز ہوا تھا..

جب نیاز کی موجودگی کے باوجود میں یکسر شہروں کی ماں مکہ کے بزرگ اور سب سے برتر پہاڑ.. جبلِ نور پر.. یوں تنہا ہوا جیسے انسان قبر میں تنہا ہوتا ہے.. شاید یہ مثال درست نہیں اُترتی.. کہ قبر میں تو حساب کتاب ہوتا ہے اور انسان اپنی مرضی سے تو ہرگز وہاں نہیں جاتا.. یہ تو بابا کا گھر تھا یہاں کیسا حساب کتاب اور یہاں میں خواہش کر کے بڑے تردد سے آیا تھا.. تو یہ مثال درست نہیں.. دراصل یہ ایک ایسی تنہائی تھی جس کی کوئی مثال نہیں..

مجھے ابھی غار کے اندر جا بیٹھنے یا جا کھڑے ہونے کی کوئی جلدی نہ تھی کہ میرے پاس پوری رات تھی..

البتہ یہ رات میری توقع سے قدرے برعکس تھی..

اس رات کی خواہش کرتے.. اس خواہش پر دم نکلتے.. ہزاروں نہیں بس اس خواہش پر دم نکلتے میں نے سوچا تھا کہ اگر یہ کبھی ممکن ہو گیا تو میں غارِ حرا کی رات میں اُس پر جو آسمان کا خیمہ تنا ہو گا اُسے تا دیر دیکھتا رہوں گا.. اور اُس آسمان پر ستارے ہوں گے.. میں رات بھر اُن ستاروں کے چلن کو.. اُن کی مدھم مسافت کو نظر میں رکھوں گا.. کہ کیسے وہ دھیرے دھیرے غار کے آسمان پر اپنا سفر مکمل کرتے ہیں.. کہ میری نگاہ کا زاویہ وہی ہو گا جو میرے نبی کی نگاہوں کا تھا.. جس جگہ پر وہ کھڑے ہوتے تھے بیٹھتے تھے وہیں کھڑے ہو کر بیٹھ کر گویا اُنہی کی نگاہوں سے ستاروں کی چال کا مشاہدہ کروں گا کہ سرِ شام وہ کہاں نمودار ہوئے.. پھر جب رات اُتری تو وہ کیسے ٹمٹمائے اور آسمان کے کون سے حصے میں.. یوں ہر ساعت کے گزرنے سے وہ بھی نامعلوم انداز میں حرکت کرتے رہیں گے اور میں اُن پر نظر رکھوں گا صرف اس لیے کہ میری آنکھیں بابا کی آنکھیں ہو جائیں اور میں بھی اُنہی ستاروں کو اُسی مقام سے اُسی زاویے پر دیکھتا رہوں.. شب بھر کے سفر کا مشاہدہ کرتا رہوں..

یہ رات میری توقع سے قدرے برعکس اس لیے ہو گئی کہ آسمان پر ابھی تک ستارے نہ تھے.. چاند جو جبلِ نور کی چوٹی پر سے ابھی تک جھانکتا تھا اور غارِ حرا کے اس صحن میں اپنی بجھی بجھی روشنی بچھاتے کو تھا اُن کو ظاہر نہ ہونے دیتا تھا..

آج چاند کی بارہویں تاریخ تھی.. مہینہ شعبان کا..

مجھے پہلی بار اس کی بجھی بجھی چاندنی نے دُکھ دیا..

میرے لیے ستاروں کی مسافت زیادہ اہم تھی..

واقعی.. اِدھر اس کنجِ تنہائی میں ہوا کم کم آتی تھی..

کہ یہ جگہ بلندی پر نہ تھا پہاڑ کے دامن میں پوشیدہ تھا..

یکدم ایک اور وسوسے نے آن گھیرا.. تم ڈر سے تو آزاد ہو گئے ہو موت سے تو نہیں.. اگر یہاں موت آ گئی تو پھر کیا ہو گا.. اس عمر میں چل چلاؤ کا چلن ہو جاتا ہے.. کچھ پتہ نہیں کب چٹھی آ جائے.. اا کیہ آئے اور بلاوے کی چٹھی یہیں تھما دے.. دل یکدم ساکت ہو جائے.. کھلی آنکھیں ایک لمحے دیکھتی ہوں اور دوسرے لمحہ مردہ اور پتھر ہو جائیں.. کسی شریان میں کوئی اٹک آ جائے.. دماغ کی کوئی رگ بوسیدہ ہو کر ڈھے جائے.. چل چلاؤ کے ان موسموں میں کچھ بھی ہو سکتا تھا یہاں کچھ ہو گیا تو کیا ہو گا.. لیکن اس وسوسے اس دھڑکے سے بھی یکدم اُسی لمحے میں نجات مل گئی.. یہ بے اثر ایسا ہوا کہ جیسے کبھی تھا ہی نہیں.. اور اسے بے اثر اس خیال نے کیا کہ قربت مرگ تو ہے.. دو چار پل.. نہیں تو دو چار دن یا چلو دو چار برس ہی سہی.. آئے گی تو سہی.. تو اگر یہیں آ جائے.. غارِ حرا میں.. اپنے بابا کے ڈیرے پر تو کم بخت تجھے اور کیا درکار ہے.. تمہیں کوئی قلق ہو گا دنیا چھوڑ جانے کا..

بے شک میں نے ہرگز یہ تمنا نہیں کی کہ مجھے یہیں موت آ جائے لیکن میں اس کے وسوسے سے یوں یکسر آزاد ہوا کہ پھر آئندہ دنوں میں کبھی ایسا نہ ہوا.. ہمیشہ اس ڈر کا اسیر رہا.. صرف وہ ایک رات تھی جب میں اس کے خوف سے یکسر آزاد ہوا..

میں کیمرے کے علاوہ جان بوجھ کر اپنے ہمراہ گھڑی بھی نہیں لایا تھا.. صرف اس لیے کہ بابا کے زمانوں میں وقت کی رفتار کا تعین کرنے کے لیے یہ پیمانہ نہیں ہوا کرتا تھا.. گزرتے لمحوں کا حساب چاند ستارے اور ہوائیں تھیں.. شامیں راتیں اور سویریں تھیں..

تو میں بھی انہی قدرتی پیمانوں پر انحصار کرنا چاہتا تھا.. جیسا کہ بابا کیا کرتے تھے..

اس لیے میں نہیں جانتا تھا کہ اُس ساعت جب نیاز اُس چٹان کے برابر میں لیٹ کر سیاہی میں اوجھل ہوا اُس لمحے دنیا بھر کی گھڑیوں کی سوئیاں کہاں اور کون سے ہندسے پر تھیں..

وقت چل بھی رہا تھا یا تھم چکا تھا نہیں جانتا..

جبلِ نور کے چھجے سے ذرا دائیں جانب ایک مدھم روشنی والا بجھا بجھا سا چاند اُبھرتا تھا.. چودھویں کا نہ تھا کہ شب بھر رات چاہتا.. بارہویں کا تھا.. اور اس کے باوجود شب بھر رہا چاہتا..

اُس بے نور چاند کی اوٹ میں.. یا آس پاس.. دور پار کوئی ستارہ نہ تھا.. مجھے آس تو یہی تھی کہ غارِ حرا کی رات میں میرے اوپر ایک ستاروں سے اُلجھا ہوا اور اٹا ہوا.. بے شمار اور بے حساب ستاروں بھرا آسمان ہو گا.. ایسے ستارے جو دریائے سندھ کی ایک شب میں اُس کے پانیوں پر کشش سے تاکے ہوئے دوپٹے کی مانند بچھے دکتے اور بجتے دکھائی دیتے تھے لیکن اس بجھے ہوئے چاند نے اُن کو بھی بجھا رکھا تھا.

کہیں کوئی سرسراہٹ نہ تھی.. نہ ہوا تھی اور نہ زندگی کی کوئی علامت.. بس ایک گہری خاموشی تھی.. ایک خاموش نپ چپ تھی.. ایک بھید بھرا سناٹا تھا جس میں صحن کی دیوار پر ہاتھ رکھے میں تاریکی میں گم ہو چکی وادی کو تکتا تھا.. کہیں دو چار ٹمٹماتی روشنیاں تھیں ورنہ ہر سو اندھیرا راج کرتا تھا.. دیوار سے گرنے والی کھائی کا کوئی ایک پتھر بھی سجھائی نہ دیتا تھا.. کوئی ایسا پتھر جس پر کچھ دیر پہلے ہنومان جی کودتے اور اٹکھیلیاں کرتے تھے..

ایک گہری چپ تھی جو ایک سیاہ لبادے کی مانند مجھے ڈھانپ کر مزید چپ ہو جاتی تھی..

اوپر.. جبل نور کے تقریباً ہر پتھر پر جس کا رخ غارِ حرا کی جانب تھا بھدے انداز میں جو 'اقراء باسم ربک' پینٹ کیا ہوا تھا وہ بھی تاریکی میں نظر نہ آتا تھا.. نہ صرف وہاں بلکہ غار کے اندرون میں ہر پتھر پر نہایت بھدے انداز میں سرخ پینٹ سے ''غارِ حرا'' یا ''اقراء'' لکھا ہوا تھا.. کسی پینٹ کرنے والے برش یا شاید کسی ٹہنی کو پینٹ میں ڈبو کر ان پتھروں کا ستیاناس کیا گیا تھا.. یہاں تک کہ غار کے اندر لوگوں نے اپنی حاضری کی گواہی کے طور پر اپنے نام کھودے ہوئے تھے.. مار کرتے ''اللہ وسایا.. گاؤں دین پناہ'' اور ''نعمت گل خان.. مانسہرہ'' قسم کے نام لکھے ہوئے تھے.. آپ جان گئے ہوں گے کہ اس قسم کی نایاب خطاطی کے جوہر صرف پاکستانی ہی دکھاتے ہیں..

صد شکر کہ یہ قباحتیں اور بدنمائیاں رات کی تاریکی میں دکھائی نہیں دے رہی تھیں.. چٹانوں اور غار کے اندرون کے پتھروں پر یہ آنکھوں کو دکھ دینے والی تحریریں نظر نہ آتی تھیں..

تاریکی نے اُن عبارتوں کو اوجھل کر کے جبل نور غارِ حرا کے اندرون اور اس کے ماتھے اور صحن کو وہی شکل وہی ہیئت عطا کر دی تھی جس شکل اور ہیئت میں بابا اُنہیں دیکھا کرتے تھے..

میں جب بابا کی دیکھی جانے والی شکلوں.. پتھروں اور چٹانوں کے درمیان یکسر تنہا ہوا ہوں تو ایک اور خیال وارد ہوا کہ تم اب اس رات میں اس مقام پر تنہا ہو گے تو اب کیا کرو گے.. کون کون سی دعائیں پڑھو گے.. کتنے نفل ادا کرنے کا ارادہ ہے.. کیا کیا اپنے ذہن میں لاؤ گے.. تصور کے پردے پر کون سی تصویریں مصور کرو گے.. بابا کے گھر میں رہو گے تو کیسے اُن سے رابطہ کرو گے.. کس کس کو یاد کرو گے.. سچی بات ہے کہ میں نے اس سلسلے میں کچھ منصوبہ بندی نہ کی تھی.. ساری توجہ اسی لگن میں صرف ہو گئی کہ کیسے پہنچوں گا.. رات گزار سکوں گا یا نہیں.. عبادت کا بھی کچھ خاص خیال نہ آیا.. صرف یہی چاؤ دل میں پلتا تھا کہ بابا کے گھر میں رہنا ہے.. اُن کی خوشبو کو محسوس کرنی ہے.. اُن کے اٹھنے بیٹھنے کے انداز اپنانے ہیں.. اور شب کے گزرنے کا یوں مشاہدہ کرنا ہے جیسے بابا کرتے تھے..

میں تنہا ہوا تو پہلے یہی سوچ آئی کہ ابھی تو پوری رات پڑی ہے.. اوپر تھڑے پر مار سوتوں اور قرائوں نے چین نہ لینے دیا تھا اور کعبہ کا کھلونا آنکھیں بند نہ کرنے دیتا تھا تو اب کچھ دیر آرام کر لیا جائے.. چڑھائی کے دوران جو رگیں کھنچ کر پتھر ہو رہی ہیں اور پنڈلیوں کے مٹھوں میں جو بے چینی ہے اس کا مداوا کیا جائے.. تو یہ آرام کیسے کیا جائے..

غارِ حرا میں بچھے اپنے مصلے پر ٹانگیں پھیلا کر سونے کی سعی کروں.. نیند سے ناتا جوڑنے کی کوشش کر دیکھوں..

پھر بدن میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی کہ.. یہ تو ایسی رات نہیں.. تمہاری حیات کی ہزاروں معمولی راتوں ایسی رات تو نہیں.. یہ تو کچھ اور ہی معاملہ ہے.. کوئی اور رات ہے.. جو نہ پہلے کبھی آئی اور نہ آئے گی..

اب ہوا یہ کہ قطعی طور پر.. غیر ارادی طور پر جیسے باب السلام میں داخل ہو کر بابا کی آرام گاہ تک چلتے ہوئے کچھ فلمی قسم کی نعتیں بدن میں جھومنے لگی تھیں بالکل ویسے کیا ناواجب اور بے ادبی کی حد میں داخل ہوتا ایک تیز دھن والا فلمی نغمہ میرے ذہن میں گونجنے لگا..

'ساقیا آج مجھے نیند نہیں آئے گی
سنا ہے تیری محفل میں رت جگا ہے'

جیسے حسرت کی ایک کچھ کے نزدیک عامیانہ اور فاسقانہ غزل نے روضۂ رسولؐ میں سارا ساتھ یوں دیا تھا کہ ظاہری معانی یکدم بے معنی ہو کر رہ گئے.. اور انجمن جمالِ یار سے.. روشن ہو گئی.. تمام تو ایسے ہی اس عامیانہ فلمی گانے کی معانی کچھ اور ہو گئے اور ہر مصرعہ میری کیفیت کے اظہار کے لیے مامور کر دیا گیا..

گزارش حوضِ کوثر کے ساقی سے ہو رہی تھی..

اے ساقیِ کوثر..

مجھے نیند نہیں آئے گی..

سنا نہیں.. یہ یقین ہے کہ آج تیری اس محفل میں تیرے اس گھر میں رت جگا ہے..

بے شک رگوں اور پنڈلیوں میں بے چینی تھی جو دور ہوئی.. کہ ساقیا آج مجھے نیند نہیں آئے گی.. آرام طلبی کی خواہش رخصت ہو گئی.. نہ آنکھوں میں نیند تھی اور نہ بدن میں کچھ تھکاوٹ..

تو اس رت جگے کا آغاز کیسے کروں..

ایسے کروں کہ جب بابا اپنے گھروندے کرتے اور تہجد میں ملبوس سرنگ میں سے گزر کر صحن

میں داخل ہوتے ہوں گے تو کیسے داخل ہوتے ہوں گے.. یہاں سے اس رت جگے کا آغاز کروں..

میں واپس دو چار قدم سرنگ کے اندر گیا اور پھر رُخ صحن کی جانب کیا.. سرنگ کے اندر سے صحن کچھ کچھ دکھائی دے رہا تھا.. اگر رات کو آتے تو ایسے دکھائی دیتا ہوگا.. پھر میں نے آرام سے وہی دو چار قدم اٹھائے تو سرنگ کی تاریکی سے آگے آ گیا.. صحن میں آ گیا.. وہیں قدم رکھنے کی کوشش کی جہاں سرنگ میں سے باہر آتے ہوئے کوئی بھی شخص قدرتی طور پر رکھ سکتا تھا.. چار پانچ قدم آگے جو دیوار تھی وہ تب نہ تھی.. تو وہ احتیاط سے کنارے تک جاتے ہوں گے.. کھائی میں جھانکتے ہوں گے.. پھر اپنی توجہ غار پر مرکوز کرتے ہوں گے.. لیکن پہلے اپنا خوراک کا تھیلا کمر سے اُتار کر کہیں رکھتے ہوں گے کہ غار کے اندر اتنی جگہ ہرگز نہیں کہ وہاں کچھ سامان بھی رکھا جا سکے.. اور اُسے کہیں قریب رکھنا تھا صحن میں نہیں کہ وہاں وہ مارموٹ بھی اُن دنوں ہوں گے اور شاید بندر بھی.. اور بندر تو ہر شے اٹھا کر لے جاتے ہیں.. اور قریب ترین جگہ غار میں بیٹھے ہوئے شخص کے لیے غار کے دہانے کے دائیں جانب جو ہموار پتھر تھا وہی ہو سکتی ہے.. چنانچہ وہ اپنی گٹھڑی اسی ہموار پتھر پر رکھتے ہوں گے جہاں میرا اتفاق تھیلا پڑا تھا اور جو گر پڑے تھے.. کیسے؟.. یوں جھک کر.. اور میں جھکا اور جیسے جھک کر وہاں اپنا تھیلا رکھا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا..

اب میرا رُخ غار کی جانب ہے.. غار کی چھت کے پتھر میرے سر سے ذرا نیچے.. دو چار انچ نیچے جھکے ہوئے ہیں.. میں سیدھا کھڑا چلتا ہوا اندر نہیں جا سکتا.. مجھے اپنی پیشانی کو بچانا ہے.. تو جھکتا ہوں.. گردن نیوڑھا کر اندر داخل ہونے کے لیے جھکتا ہوں.. جھکتے ہوئے یہ تو نہیں کہ میرے ہاتھ لٹکے ہوئے ہیں میں اُن سے کوئی کام نہیں لے رہا.. بلکہ میں انہیں کسی نہ کسی نزدیکی پتھر پر رکھوں گا سہارے کے لیے.. جیسے کوئی بھی شخص ایک کھوہ کے اندر جاتے ہوئے سر جھکا کر کہیں نہ کہیں اپنے ہاتھ رکھتا ہے سہارے کے لیے..

اور وہ کہیں نہ کہیں.. ایک ہی جگہ ہوتی ہے جہاں قدرتی طور پر لاشعوری طور پر.. بغیر سوچے سمجھے.. خودکار طریقے سے ہاتھ رکھا جاتا ہے..

نہ زیادہ اونچائی پر اور نہ ہی نیچے.. بس وہ شخص وہاں ہاتھ رکھتا ہے جہاں پر وہ خود بخود جاتے ہیں بدن کو سہارا دینے کے لیے..

یہ نہیں کہ ہر انسان ایک مختلف جگہ پر ہاتھ رکھتا ہے اندر داخل ہونے کے لیے.. بے شک قد کی مناسبت سے ایک دو بالشت کا فرق آتا ہو لیکن ہمیشہ غیر شعوری طور پر ہاتھ ایک ہی مقام پر پڑتا ہے..

اور بابا کا قد بھی میرے جتنا تھا.. بلکہ میرا قد.. یہ فنا ہو جانے والا قد بھی اتنا تھا.. تو اس میں کچھ زیادہ شک نہیں کہ جب بھی.. اور سینکڑوں بار وہ اس کھوہ میں داخل ہوئے تو اُن کے ہاتھوں نے انہی چٹانوں پر اپنی ہتھیلیاں جمائی ہوں گی جہاں میں اپنی ہتھیلیاں رکھتا تھا.. یہ تصوری کرشمہ

ساری سے دُور بہر طور ایک حقیقت ہے جسے جھٹلانا مشکل ہے..

اُنہوں نے متعدد بار فرمایا کہ میں بھی تم جیسا ایک انسان ہوں صرف اس فرق کے ساتھ کہ مجھ پر وحی اُترتی ہے..

اور اللہ کی توصیف ہو کہ یہ کیسا فرق ہے.. جو سب کائناتوں میں انہیں سب انسانوں کا شہزادہ بناتا ہے..

تو ایک انسان یونہی لاشعوری طور پر اس کھوہ میں داخل ہوتے ہوئے انہی پتھروں کا سہارا لیتا تھا جن پر میری ہتھیلیاں تھیں..

اُس شب..

غارِ حرا کی اُس رات میں..

سینکڑوں نہیں تو درجنوں بار میں غار میں سے نکلا.. صحن میں آیا اور پھر سے اُس کے اندر داخل ہوا.. جان بوجھ کر بار بار..

کبھی ایک بچے کی بے پروا چلبلاہٹ کے ساتھ جس میں تجسس ہے..

کبھی ایک گھٹنوں تک آتی ہوئی داڑھی والے خمیدہ کمر بزرگ کی مانند..

کبھی یونہی.. جیسے برفیلی بلندیوں پر کوئی کوہ نورد اپنے سامنے ایک کھوہ دیکھتا ہے تو اس کے اندر جائے بغیر رہ نہیں سکتا..

تو میں کبھی یونہی خالی الذہن ہو کر.. جیسے یونہی ٹہلتا ہوا وہاں آ نکلا تھا اور اُسے سامنے پا کر.. کہ چلو اس غار میں جھانکتے ہیں اس کے اندر قدم رکھتے ہیں..

کبھی سرسری طور پر جیسے وہ کوئی بھی غار ہو.. چلو اس میں بدھ عہد کی نشانیاں سنبھالے کوئی غار ہو.. فرانس یا سپین کی وہ غار ہو جس کے اندر قدیم ترین انسانوں نے مصوری کی ہو..

میں سو رنگ سے..

سو ڈھنگ سے..

بار بار غارِ حرا میں داخل ہوا..

صرف اس لالچ میں کہ کبھی نہ کبھی تو میرا ہاتھ وہیں ثبت ہوگا جہاں بابا نے ہاتھ رکھا تھا.. عین اس مقام پر میری ہتھیلی اُن کی ہتھیلی سے مل جائے گی..

اور یقیناً ایسا ہو گیا ہوگا..

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ مجھ سے پیشتر اس غار میں کروڑوں لوگ داخل ہوئے ہوں گے..

ہزاروں نے یہاں رات بسر کی ہو گی..

اور اُن سب نے غار میں داخل ہوتے ہوئے شاید انہی پتھروں پر ہاتھ رکھے ہوں گے..

لیکن اُن سب کے لمس کو دوام حاصل نہیں تھا..

دوام صرف بابا کے ہاتھوں میں تھا.. اُن کے لمس میں تھا..

صرف اُن کا نقش باقی ہے.. اس کے سوا.. فنا فنا!

تو میں اُس نقش پر.. ہاتھ رکھتا تھا اور وہ میرا ہاتھ تھام لیتے تھے یہ احساس ہوتا تھا.. اور اُن کے اور میرے درمیان جو کروڑہا نقش تھے وہ فنا میں جا چکے تھے جیسے میرے اس نقش نے بھی مٹ جانا تھا.. لیکن مٹ جانے سے پیشتر بابا کی ہتھیلی کی گرمی جو اس پتھر میں دہکتی تھی اُسے محسوس کرنا تھا اور اس کے بعد اگر مٹ جانا تھا تو کیا غم.. اس گرمی نے تو روزِ حشر تک ساتھ دینا تھا.. آتشِ دوزخ سے میری سفارش کرنی تھی کہ تو اس پر اثر نہ کر.. اس پر میرا اثر ہو چکا ہے..

شاید میرے قاری کو گمان گزرے کہ میں قدرے تفصیل میں چلا ہی جاتا ہوں.. تو وہ نہیں جانتا کہ میں تو دل پر جبر کر کے بیان مختصر کرتا ہوں.. سرسری کرتا ہوں.. ورنہ سب سمندروں کی روشنائی ختم ہو جاتی اور سب درختوں کی قلمیں بیکار ہو جاتیں تب بھی اُس شب کی ایک ساعت کا بیان مکمل نہ ہوتا.. میں تو مختصر کرتا ہوں..

اندر داخل ہوا..

یعنی جھک کر اپنے سر کو بچاتا پتھروں کا سہارا لیتا.. دو قدم اٹھائے تو اندر داخل ہوا..

فرش پر جو مصلیٰ بچھا تھا اُس پر اگلا قدم آیا..

ظاہر ہے میں ننگے پاؤں تھا..

دہانے کے قریب ہموار سطح والے پتھر پر میرا تھیلا ڈھلکا ہوا پڑا تھا.. برابر میں میرے جوگر دھرے تھے.. سگریٹ تھے.. اور ٹشو پیپر تھے.. اور ٹارچ تھی..

پہلی بار، یعنی جب نیاز خوابیدہ ہو کر چٹان کا حصہ ہو گیا.. میں تنہا ہو گیا.. جبلِ نور کی رات میں ہوا.. غار میں داخل ہو گیا تو تا دیر کھڑا رہا.. سر کھجاتا رہا کہ اب کیا کروں..

[illegible] کرتا ہے وہ تو کر چکا تھا..

تو اب کیا کروں.. حرا کی غار کے ہر پتھر.. ہر مسام.. اور ہر ابھار کو چوموں.. کہ وہاں تو اُن کے لمس تھے.. [illegible] اور اُن کی سانسوں کی پھوار اپنے گالوں پر بھی چھڑکتے محسوس

کروں.. کیا کروں..

بہت سے لوگ ہاتھوں میں کیلکولیٹر لیے پھرتے ہیں..

اس مقام پر ایک نماز پڑھنے سے چالیس ہزار نمازوں کا ثواب ہو گا..

یہاں دو نفل پڑھ لینے سے جنت کے محلوں میں جگہ مل جائے گی..

ایسے لوگ جو مجھ سے برتر.. عقیدے میں مجھ سے بڑھ کر پختگی رکھتے ہیں..

کہیں ذرہ بھر گنجائش شک کی نہیں رکھتے جن کا روزِ حشر کچھ حساب کتاب نہ ہو گا اور میرے تو رجسٹر کے رجسٹر کھل جائیں گے اور کوئی بھی بڑے سے بڑا چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ اُن میں سے میری بخشش کا کوئی ایک جواز بھی تلاش نہ کر پائے گا..

میں شروع سے ہی حساب کے پرچے میں رعایتی نمبروں سے پاس ہونے والا تھا..

تو یہاں بھی کچھ حساب کرتا اُسے کتاب کرنا میرے بس میں نہ تھا کہ میں بابا کے گھر میں پہنچ کر اپنے نامۂ اعمال میں نوافل اور نمازوں کے طویل اندراج کر لیتا.. چنانچہ میں نے یہ پرچہ جو میرے بس میں نہ تھا خالی چھوڑ دیا.. غار میں داخل ہوا تو مصلیٰ پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا.. دو نفل ادا کر لوں.. وہ بھی کر لیے.. تو اب کیا کروں.. اب میں لیٹ گیا.. صحن کی جانب پاؤں کر کے.. تپتی ہتھیلی کو سرہانے رکھ کر.. اس پر اپنا سر رکھ کر لیٹ گیا..

غارِ حرا کے صحن میں ایک دھندلی مگر چاندنی تھی..

میرے پاؤں تک آتی کچھ مگر چاندنی تھی اور میرا بقیہ وجود تاریکی میں تھا..

جہاں میں لیٹا ہوا تھا وہاں بائیں جانب جو چٹان اٹھتی تھی اُس کے ساتھ لگ کر لیٹا ہوا تھا..

اور دائیں جانب سنگِ مرمر کی دو چار سلوں کے پہلو میں جو پتھر غار کا حصہ اُس کی دیوار تھے انہیں ہاتھ بڑھانے سے میں چھو نہیں سکتا تھا..

تب میں نے اپنے بدن پر.. اور برابر میں جو خالی جگہ تھی.. وہاں وہاں اس گھپ اندھیرے میں چاندنی کے کچھ مختصر جزیرے دیکھے.. نیم روشن دھبے دیکھے..

غار کے اندھیارے میں وہ میرے بدن پر اور برابر میں سنگِ مرمر کی سطح پر ٹھہرے ہوئے تھے..

کل چار پانچ جزیرے تھے..

غارِ حرا کی سیاہی میں..

غار کو جن آڑے ترچھے پتھروں نے وجود دیا تھا.. اُن کے درمیان میں جو چھوٹے چھوٹے

شگاف تھے جن سے ہوا آتی تھی اب اُن میں سے چاندنی نازل ہو رہی تھی..

اسی چاندنی کے یہ جزیرے تھے..

میں گھٹا ٹوپ غار کے اندرون میں لیٹا ہوا اور وہ مجھ پر اور برابر کے فرش پر اور ہاں سامنے والی چٹان پر بھی روشن ہوتے تھے..

آج سے چودہ سو برس پیشتر وادیٔ مکہ میں سرِ شام جو چراغ جلائے جاتے تھے.. وہ کب کے گل کر دیے گئے ہوں گے.. چند ایک قندیلیں جو روشن کی جاتی ہوں گی انہیں رات کے اس سمے تک بجھا دیا جاتا ہوگا اور وادیٔ مکہ پر مکمل تاریکی کا رواج ہوتا ہوگا..

تو اُن زمانوں میں بھی..

کہ چاند تو اپنی گردش اور خصلت نہیں بدلتا.. اس غار کے اندر چاند کی انہی راتوں میں شگافوں کے راستے داخل ہونے والی چاندنی میں یہی جزیرے عین انہی مقامات پر جہاں وہ تھے تب بھی نمودار ہوتے ہوں گے..

یعنی میں یہاں صرف آج نہیں تھا.. چودہ سو برس پیشتر بھی ہو سکتا تھا..

تب بھی رات کی ان ساعتوں میں یہی جزیرے انہی مقامات پر نمودار ہوتے تھے..

اگر کوئی شخص میرے قد بُت کا تب یہاں لیٹتا تھا تو یہی جزیرے اُس کے بدن پر بھی روشن ہوتے تھے..

چاندنی کے آگے وقت تھم گیا تھا..

عجیب انہونا منظر تھا..

جو بہت سوں نے دیکھا تو ہوگا لیکن کبھی بیان نہ کیا اس لیے یہ میری حیرت کے سمندر پر بچھی ہوئی چاندنی کی ایک ایسی کشتی کی مانند ساکت تھا جسے میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا..

اور جو پہلے کبھی نہ دیکھا ہو اور کبھی گمان بھی نہ ہوا ہو کہ ایسا دیکھا جانا ممکن ہے تو وہ منظر ایک معجزے کی قربت میں ہو جاتا ہے..

میں جانتا ہوں کہ میں بہت بار بہت منظروں اور بہت کیفیتوں کے بارے میں یہ کہہ چکا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک منظر اور ہر کیفیت کے بارے میں میں ایک کتاب لکھ سکتا ہوں.. تو اس میں قطعی طور پر میں اپنے زورِ بیان کے گھمنڈ میں ایسا نہیں کہتا.. جہاں مجھ سے کچھ بیان ہی نہیں ہو پاتا تو وہاں اُس بیان میں زور کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.. یہ تو وہ منظر ہے وہ کیفیت ہے جو ایک کتاب کی صورت ہوتی تو چاندنی کے ان جزیروں اور حیرت کے سمندروں پر ساکت جو یہ بچھی ہوئی چاندنی

کی کشتیاں ہیں.. یہ خود ایک کتاب ہیں اور میرا عجزِ بیان چند حرفوں سے آگے جانے کی سکت نہیں رکھتا..

یہ چند جزیرے چاندنی کے.. غارِ حرا کی رات میں.. یونہی تو میرے بدن کو ایک حیرت اور کیف میں مبتلا نہیں کرتے تھے.. دنیا بھر میں اسی ساخت کی ہزاروں غاریں ہوں گی جن میں شگاف ہوں گے اور اُن میں سے چاندنی اُترتی ہوگی..

فرق صرف یہ ہے کہ یہ چاندنی.. اس کے نیم روشن دھبے بابا کے بدن پر بھی ایسے ہی اُترتے ہوں گے جیسے میرے بدن پر اُتر رہے تھے..

وہ جب کبھی یہاں آتے تھے.. اس غار میں ہمہ وقت تو عبادت اور سوچ بچار میں مگن تو نہیں رہتے تھے.. آرام بھی کرتے تھے.. تو شب کے انہی لمحات میں چاندنی کے یہ جزیرے.. شگافوں میں سے نازل ہوتے.. اُن کے کھدر کے کرتے میں سے سرایت کرتے اُن کے بدن پر بھی پڑتے ہوں گے.. اور کیسے شرمندہ ہوتے ہوں گے کہ یہ بدن تو ہم سے بھی کہیں منور اور روشن ہے اور ماند پڑ جاتے ہوں گے.. اور چاندنی کے یہ چھاپے وہیں وہیں اُن کے وجود پر ٹھہرتے ہوں گے جہاں وہ میرے بدن پر نمایاں ہو رہے تھے..

جہاں جہاں.. چاندنی کے یہ چھاپے میرے دکھتے بدن پر رکھے ہوئے تھے..

میں.. حرکت نہ کرتا تھا کہ کہیں یہ آگے پیچھے نہ ہو جائیں.. میرے بدن سے گر نہ جائیں..

گر گئے تو کھو جائیں گے.. دوبارہ نصیب میں نہ آئیں گے..

غار میں اس کے سوا کسی اور پہلو سے یا انداز میں لیٹا نہیں جا سکتا تھا جیسا میں لیٹا ہوا تھا.. گنجائش نہ تھی.. تو چھاپے چاندنی کے وہیں وہیں تھے جہاں آج سے چودہ سو برس پیشتر وہ چاند کی بارھویں رات کے اس پہر میرے حضورؐ کے کرتے پر اُترتے تھے..

تاریکی میں.. چاندنی کے یہ دھبے.. اسی سائز کے تھے جس سائز کے شگاف میں سے وہ گزر کر وارد ہو رہے تھے..

ان میں سے صرف دو روشن نشان مجھ پر ٹھہرے ہوئے تھے.. میرے بدن پر.. ایک سینے پر ذرا نیچے ثبت تھا اور دوسرا دائیں بازو پر.. لیکن مکمل طور پر نہیں.. اس کا کچھ حصہ فرش پر بھی نمایاں ہو رہا تھا..

چاندنی کے بقیہ دھبے.. ایک میرے سر کے پیچھے ایک پتھر پر رکا ہوا تھا.. دوسرا سنگِ مرمر کی سلوں کے برابر میں جو پتھر دیوار تھا اس کے درمیان میں ٹھہرا ہوا تھا.. اور ان کا حجم مختلف تھا اس شگاف کی

مناسبت سے جس میں نقب لگا کر وہ غار میں داخل ہو رہے تھے..

موسم کسی حد تک معتدل تھا.. ہلکی گرمی تھی لیکن بدن کو بے چین نہ کرتی تھی..

پسینے کا باعث نہ بنتی تھی..

اور ایسا خوشگوار بھی نہ تھا کہ وجود کے لیے سرخوشی کا سبب ہو..

صحن دھیرے دھیرے چاندنی سے بھر رہا تھا..

اور صحن میں پھیلی ہوئی چاندنی جو میرے دونوں پاؤں کو روشن کرتی تھی.. دھیرے دھیرے سرکتی تھی.. اور اب میری شلوار کے پائنچوں تک آ گئی تھی..

میں اپنے پاؤں ذرا سمیٹ لیتا تو چاندنی کا وہ حصہ فرش پر بچھ جاتا..

بائیں ہاتھ پر سنگ مرمر کی سلوں کے آگے غار کے دہانے پر جو ہموار پتھر تھا اُس پر میرا سامان پڑا تھا اور جوگر پڑے تھے.. اُن میں سے ایک جوگر چاندنی میں آیا ہوا تھا..

اگرچہ باہر چاندنی تھی اور غار کے اندر وہ چند دھبوں کی صورت موجود تھی لیکن اس کے باوجود اندرون خاصا تاریک تھا.. اتنا تاریک کہ ہموار پتھر پر جوگرز کے علاوہ میری ٹارچ.. دودھ کی بوتل، تسبیح اور بال پوائنٹ وغیرہ رکھے ہوئے تھے.. وہ بالکل نظر نہ آتے تھے اور اُن میں سے کسی ایک کو گرفت میں لینے کے لیے ذرا ٹٹولنا پڑتا تھا..

تنگی کھیس کا رنگین دھاریوں والا تھیلا تکیے کا کام دے رہا تھا اور میرے سر کو بقیہ بدن سے بس اتنا اونچا رکھتا تھا کہ میں اطمینان سے اگر صحن کو دیکھتا ہوں تو مسلسل دیکھتا رہوں.. اس میں اُترتی ہوئی چاندنی کی لو میں جو کچھ دکھائی دے رہا تھا.. سامنے کی چٹان جس کے سائے میں نیاز رو پوش تھا.. اور صحن کا فرش.. انہیں بھوکی نظروں سے تکتا رہوں کہ.. بابا یہیں استراحت فرماتے شاید کسی پتھر کو سرہانے رکھ کر یا شاید میری طرح اپنی پوٹلی پر سر رکھے اسی حالت میں اس صحن کو ہو بہو دیکھتے تھے جیسے میں دیکھتا تھا..

بہرصورت یہ طے ہے کہ بابا ماہِ رمضان اسی غار میں گزارتے تھے..

آج شعبان کی بارھویں تاریخ تھی..

تو رمضان کے مہینے کی بارھویں تاریخ کو بھی وہ یہیں ہوتے تھے.. اور تب بھی اسی قدر چاندنی انہی زاویوں پر صحن میں اُترتی ہوگی..

انہی شگافوں میں سے اسی قدر چاندنی.. رات کے اس پہر وہیں وہیں نمایاں ہوتی ہوگی جہاں وہ اب ہو رہی تھی..

شاید میری اس تفصیل کی تحریر سے یہ تاثر اُبھر رہا ہو کہ میں بہت اطمینان سے اور ایک حالت سکون میں یہ مشاہدہ کر رہا تھا.. یہ سب کچھ اپنے اندر سمونے اور اسے ذہن کی ڈائری پر نوٹ کرنے میں محو تھا.. نہیں یہ عمل اتنا سطحی نہیں تھا..

میرا بدن اور اُس کے اندر جو روح تیرتی تھی.. ہمہ وقت اور میرے بدن پر جتنے رونگٹے تھے اور میرا ہر مُو وہ سب کے سب آگاہ تھے ہمہ وقت کہ ہم کہاں ہیں اور ان میں ایک دھیما اضطراب مسلسل ارتعاش تھا جس میں خوش بختی اور اس مقام پر رات کرنے کی انمول سعادت مسلسل دھڑکتی اور دھوم مچاتی تھی..

یہ بھی نہیں کہ میں بس شگافوں میں سے اُترتے چاندنی کے دھبوں میں ہی کھویا ہوا تھا یا صحن جو چاندنی سے بھرا ہوا تھا اسی میں گم تھا.. نہیں..

میں ایک پُرلطف اضطرابی بحر میں مسلسل گرفتار سانس لیتا تھا..

اور تب یکدم.. جب میں بہت دیر تک تنگی تھیلے پر اپنا بازو سمیٹے اس پر سر رکھے چاندنی میں کھویا رہا تو یکدم مجھ پر ایک گھبراہٹ سی وارد ہو گئی..

ایک خدشے نے سر اُٹھایا.. کہ بے شک اس سمے تم جبلِ نور پر.. اور اُس کی کھائی میں پوشیدہ دنیا تو کیا کائنات کی سب سے مقدس غار میں ہو.. رات میں ہو.. نہ کسی چاند اور نہ کسی مریخ میں ایسی کھوہ ہے جیسی کھوہ میں تم ہو اور تنہا ہو.. اس میں اطمینان سے لیٹے صحن میں پھیلی چاندنی کا نظارہ کرتے ہو مکمل خلوت میں.. تو کیا پتہ کوئی اور.. ادھر آ نکلے.. کوئی اور سرپھرا آوارہ گرد اس خیال کا اسیر ہو جائے کہ رات کے اس پہر غار خالی ہوگی تو میں زیارت کر لوں.. یکسوئی سے دو نفل تنہائی میں پڑھ لوں.. کوئی اور بھی تو آ سکتا ہے.. ابھی سرنگ میں سے برآمد ہو کر صحن میں آ سکتا ہے تو تنہائی کا یہ دھاگا ٹوٹ جائے گا.. چاندنی کے یہ جزیرے ڈوب جائیں گے.. یہ جو رابطہ ہے میری تنہا ذات کا اس غار سے اس کے صحن سے.. ہر ایک پتھر سے اس میں دراڑ آ جائے گی.. اس لیے کیا بیکار لیٹے چاندنی کے تماشائی بنے لیٹے ہو.. اگر کوئی عرضی پیش کرنی ہے تو ابھی کر دو.. کچھ مانگنا ہے تو بس یہی وقت ہے.. اگر کچھ پڑھنا ہے تو تنہائی سے پڑھ لو ورنہ کوئی آ گیا تو مکمل تنہائی کا یہ سحر زائل ہو جائے گا.. یکسوئی بکھر جائے گی.. اگر کوئی آ جاتا ہے تو تم اُس سے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ تم یہاں نہیں آ سکتے بھائی صاحب.. یہ میری غار ہے اسے میں نے اپنا گھر بنا رکھا ہے.. میں یہاں رہتا ہوں تم نہیں آ سکتے.. یہ نہیں کہہ سکتے..

تو اس خدشے نے ایسی گھبراہٹ طاری کی کہ میں اٹھا.. اور صحن کی جانب پشت کر کے کھڑا

ہو گیا.. غار کے آخر میں جو روزن تھا جس میں سے وادئ مکہ کی ہلکی سی روشن جھلک اب بھی دکھائی دے رہی تھی اُسے نظر میں لایا اور پھر نیت کر لی..

منہ وّل کعبے شریف.. نظر جھکائی اور اپنے تپتی تھیلے پر رکھ دی..

کبھی میری ٹانگوں میں ہلکی سی لرزش سرسراتی کہ میں کہاں ہوں.. اور کبھی سجدے میں گرتا تو اپنے مصلّی تلے جو اس غار کا برسوں سے بچھا آبائی اور اس کا مکین مصلّی تھا اُس کے نیچے جو سنگریزے تھے انہیں اپنے ماتھے پر محسوس کرتا..

میں نے حساب کتاب کا پرچہ چھوڑ دیا تھا' کچھ حساب نہ کیا کہ کتنے نفل ہو گئے ہیں..

سلام پھیرتا تو دائیں جانب یہ سلام ذرا دور ہو جاتا اور اُس تاریک چٹان پر ثبت ہو جاتا جس کے نیچے سنگ مرمر کی سلیں تھیں وہ ہموار پتھر تھا جس پر میرا سامان پڑا تھا.. اور جب بائیں جانب سلام پھیرتے ہوئے چہرہ کرتا تو گویا میرا چہرہ چٹان کے ساتھ ہی لگ جاتا کہ وہ میرے رخساروں کے برابر میں ہی تھی..

میں نے وہاں بھی.. خانہ کعبہ کی مانند.. ہر ایک کے لیے دعائیں مانگیں..

آغاز تو ظاہر ہے گھر سے ہوتا ہے' اپنوں سے ہوتا ہے' بال بچوں.. بیوی.. بہن.. بھائیوں اور ماں باپ سے ہوتا ہے.. پھر دادا اور دادی یاد میں آتے ہیں.. نانی جان کے ہاتھوں کی لرزش محسوس ہوتی ہے.. اور پھر یہ دعائیں پھیل جاتی ہیں' جو بھی یاد آتا ہے.. مر چکے عزیز اور دوست.. جن سے کبھی سرسری ملاقات ہوئی تھی.. گلی محلے والے.. زندگی بھر کے حاسد اور دشمنوں کے لیے بھی.. یہ سوچتے ہوئے کہ اس مقام پر اگر میں اُن کا نام لیتا ہوں تو محض نام لینے سے انہیں اور اُن کے بچوں کو اگر اللہ تعالیٰ نواز دیتا ہے تو ایسا کرنا چاہیے..

اُن لوگوں کو بھی یاد کیا جن کے نام نہیں جانتا تھا صرف چہرے یاد تھے.. اُن کے چہرے یاد کیے یہاں تک کہ اُن کی پہاڑوں نے سربلندی کی دعائیں کیں جن کے دامن میں کبھی میرا خیمہ نصب ہوا تھا.. اُن وادیوں کی سدا سرسبزی کی دعا کی جنہوں نے میری آنکھوں میں اپنی ہریاول بھر دی تھی.. جھیلوں کے پانیوں کو یاد کیا.. یہاں تک کہ جتنے پرندے میں نے آج تک دیکھے تھے اُس مرغِ زرّیں سمیت جو وادئ شمشال کے راستے میں اپنی چھب دکھلا کر اوجھل ہو گیا تھا.. اُن سب کے رنگوں کے مزید گوڑھے ہونے کی دعا کی.. اُن جانوروں کے لیے بھی جو کبھی میرے پالتو رہے تھے.. سنو لیک کی تتلیوں کے لیے بھی..

لیکن.. سب کو یاد کرتا میں اپنے آپ کو بھول جاتا..

پر میرے بھول جانے سے کیا فرق پڑتا تھا..

اُسے تو میں یاد تھا ناں..

میں خود یہاں تھا' ایک سفارش کے طور پر..

تو وہ خوب جانتا تھا کہ میں بھی ہوں..

میرا ابھی کچھ بندوبست کرنا ہے..

تو چنتا مت کر وہ کر دے گا.. دلوں کے حال جانتا ہے تو جو دل میں ہے اُسے لبوں سے ادا کرنے یا اپنے لیے درخواستیں کرنے سے فائدہ.. یہ عبادتیں یہ رت جگے.. زہد کے یہ سلسلے.. یہ عرضیاں ورد وظیفے تو محض اپنی تسلی کا سامان ہیں ورنہ دلِ زار کے حال وہ خوب جانتا ہے.. اُس نے میرا بندوبست کر دینا ہے چاہے میں کہوں یا نہ کہوں..

اور بندوبست یہی کرنا ہے کہ جو اس کی عنایتیں' نوازشیں' کرم اور آسائشیں عطا ہیں وہ برقرار رہیں.. صحت تندرستی اور خوشی مجھے اور میرے بال بچوں پر جو رحمت ہے اسے جاری رکھے.. کامیابیوں کی بے پایاں مہربانیاں ہیں وہ اگرچہ بہت ہیں.. میری جھولی بھری ہوئی ہے تو شکست کو ان سے دور رکھنا.. اور میرے اباجی اور امی کو بہشت کے محلوں میں راجہ اور رانی کر دے.. اور میری موت کو آسان کر دینا.. وہ تیرے ہاتھ میں ہے اُس سے آگے جس گھر میں آج شب مقیم ہوں اس گھر والا بابا میرا ہاتھ تھام لے گا.. اس کے سوا اور کچھ نہیں.. بس اتنا بندوبست کافی ہے.. ہاں اس کے سوا جو تو چاہے کرے.. جو میرے لیے تیرے من میں آئے کرے.. لیکن میرے لیے یہی سب کچھ بہت کافی ہے..

اور جب اس غارِ تنہا میں قدم رکھنے سے پیشتر میں دوحہ قطر کا ایوارڈ ایک ادیب کی حیثیت سے وصول کر رہا تھا تو مجھ سے کہا گیا کہ میں اپنے فلسفہ فن کے بارے میں کچھ ارشاد کروں.. بس اتنا کہا.. کسرِ نفسی سے کام لیا نہ عاجزی کا اظہار کیا بس اتنا کہا کہ مجھے تو کچھ علم نہیں کہ میرا فلسفہ کیا ہے اور فن کیا ہے.. بس یہ معلوم ہے کہ کبھی اوپر والے نے نیچے نظر ڈالی تو اُسے ایک بیکار.. سست.. بے بہرہ.. اور بے علم شخص نظر آیا جو نہ کسی کاروبار میں کامران ہو سکتا تھا اور نہ اُسے کوئی ڈھنگ کی ملازمت مل سکتی تھی.. اُس کے رزق کا کچھ وسیلہ نہ بن سکتا تھا تو اس نے سوچا کہ اس بندے کا کیا کروں.. یہ کمبخت تو بھوکا مر جائے گا' خوار ہو جائے گا.. اس نے بھی تو حیات کے دن کاٹنے ہیں تو اس کا کیا بندوبست کروں.. تو کیوں نہ اسے وقتی طور پر کچھ عزت عطا کر دوں.. تھوڑی شہرت اس کے نام کر دوں بے شک یہ اس کے قابل نہیں ہے.. تاکہ یہ زندگی گزار سکے.. تو اس کے سوا نہ کوئی فن ہے اور نہ کوئی فلسفہ.. بس اک عنایت کی نظر ہے.. اگر میں ناکارہ نہ ہوتا تو اُس کی نظر مجھ پر کبھی نہ ٹھہرتی..

تو میں نے یہی التجا کی کہ تمہاری نظر ٹھہری رہے..

تو جو رحم کرتا ہے.. کرم کرتا ہے تو ان صفات میں میرا بھی تو کچھ ہاتھ ہے.. مجھ ایسے پر رحم کرتا ہے کرم کرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس جیسے پر اگر رحم کرتا ہے اور کرم کرتا ہے تو واقعی اس کے رحیم و کریم ہونے میں کوئی شک نہیں.. دیکھو میں نے بھی تو تجھے کیسا موقع فراہم کیا ہے.. مجھ پر تمہاری نظر ٹھہری رہے تو اچھا ہے..

میں مسلسل نوافل ادا کرتا چلا جاتا تھا.. اور مجھے کچھ تھکن نہ ہوتی تھی.. البتہ توجہ کامل نہ ہوتی تھی.. بھٹک جاتی تھی.. اور مجھے بھٹکانے والے وہی چاندنی کے جزیرے تھے..

غار میں لیٹے ہوئے تو وہ میرے بدن پر ساکت ٹھہرے ہوئے تھے لیکن کھڑے ہوتے رکوع میں جاتے اور سجدہ ریز ہوتے وہ حرکت میں آ جاتے.. کھڑا ہوتا تو وہ میرے بدن سے گر جاتے.. رکوع میں جاتا تو اُن میں سے ایک پہلے میرے ماتھے پر اُترتا.. میں ذرا حرکت کرتا تو وہ میری آنکھوں میں تیرنے لگتا.. سجدے میں جاتا تو وہ پہلے سے ہی تپتی ہتھیلی پر براجمان ہوتا.. تو ان جزیروں کی حرکت مجھے بھٹکاتی تھی.. میں اُن کے دھیان میں چلا جاتا کہ وہ اب کہاں ہیں.. غار کی دیوار پر اور فرش پر جو چاندنی کے پھاہے رکھے تھے وہ البتہ ساکت اور ٹھہرے ہوئے تھے.. لیکن کن اکھیوں سے میں انہیں بھی اپنے دھیان میں رکھتا..

مسلسل نوافل دعاؤں اور التجاؤں کے ساتھ ساتھ میں باتیں بھی کرتا جاتا تھا..

جی ہاں.. میں غار حرا میں بہت مؤدب ہو کر اپنی آنکھوں سے گرنے والے آنسوؤں کو سنبھالتا نہ تھا بلکہ بڑے اطمینان سے زیر لب بڑبڑاتا باتیں بھی کرتا چلا جاتا تھا..

مجھے عربی میں تو بہت کچھ یاد نہ تھا.. تو کبھی اردو میں اہل دلّی کی مانند لب و لہجے کا خیال کرتا کہ.. میاں ہمیں بھولیے گا نہیں اپنی نظر کو ٹھہرائے رکھنا ہاں.. اور کبھی انگریزی میں جو کچھ سوجھتا اور اکثر پنجابی میں.. کہ اُس نے جتنے بھی پیغمبر اتارے انہوں نے اپنی مادری زبان میں ہی اُس کے پیغام دیئے.. چنانچہ جو کچھ بھی.. اور جس زبان میں بھی مجھے سوجھتا تھا کہے چلا جاتا تھا.. باتیں کیے جاتا تھا..

یہ سلسلے بہت دیر تک چلے..

اتنی دیر کہ بالآخر اس مسلسل اٹھک بیٹھک اور سجدہ ریزی عاجزی اور التجاؤں نے مجھے تھکا دیا کہ میں ایک انسانی بدن رکھتا تھا اور اس کی برداشت کی کچھ سرحدیں تھیں جن کے پار میں جانا چاہتا بھی تو بھی نہ جا سکتا تھا.. شاید میں تب بھی سعی کر کے کچھ اور آگے چلا جاتا لیکن ایک ایسے دباؤ کا احساس ہوا

جس کے آگے چلا جانا ایک انسان کے لیے ممکن نہ تھا..

ایک انسانی بدن کی کچھ دباؤ والی مجبوریاں ہوتی ہیں.. وہ بے شک غار حرا میں ہو اُن سے درگزر کرنا ممکن نہیں.. اُن کے دباؤ کو عقیدت کے بوجھ تلے دبانا ممکن نہیں..

یہاں تک کہ بابا بھی نہیں دبا سکتے تھے..

اس دباؤ سے نجات حاصل کرنا ازحد ضروری تھا.. ورنہ یہ عبادت میں خلل ڈالنے والا تھا..

میں نے جوگرز کو پاؤں میں کیا.. اُن کے سٹریپ جوڑے اور غار سے باہر آ گیا.. صحن میں آ گیا..

صحن میں تو کچھ نہیں ہو سکتا.. میں نے سوچا..

تو کہاں ہو سکتا تھا.. اس آبی بوجھ سے نجات کہاں حاصل کی جائے..

وہ بندۂ خدا.. بلکہ بندۂ جبل نور.. نیاز.. مجھ سے منہ موڑے چٹان کے ساتھ جڑا ایسا جڑا کہ اُس چٹان کا جزو ہی لگ رہا تھا.. بے سدھ سوتا تھا..

جانے رات کی کون سی ساعت تھی..

کیا وقت ہوا تھا..

شاید نصف شب کی قربت تھی..

جبل نور کی اوٹ میں سے بارہویں کا چاند جو ابھی اُس کی چوٹی کے کنگرے کے برابر میں سے اُبھرا تھا اب سرکتا ہوا ہولے ہولے سرکتا غار حرا کے صحن کے عین اوپر آ چکا تھا..

صحن منور ہو رہا تھا..

میں اپنی حاجت سے لاچار ہو کر.. چاندنی پر دھیان نہ کرتا صحن میں کھلتی سرنگ کے اندر داخل ہوا اپنی چھوٹی ٹارچ کی روشنی میں اُس کے اندر قدم رکھا..

سب سے اوّل وہی بڑی چٹان رکاوٹ تھی.. لیکن میں اسے اب خاطر میں کہاں لاتا تھا' سارے داؤ پیچ جان چکا تھا کہ کہاں سے پیٹ ٹیکیز کر اس کے پار جانا ہے اور پھر کیسے گردن میں ذرا سا خم دے کر سر بیوڑھائے چھت کی چٹانوں سے بچتے دوسری جانب جانا ہے.. میں بقول نیاز ایکسپرٹ ہو چکا تھا جیسے یہ سرنگ میرے گھر کے اندر داخل ہونے والا راستہ ہو.. ایک ڈرائیو وے..

بلکہ میں سرنگ میں سے شتابی سے گزر جانے کی بجائے اس میں ٹھہرا رہا.. جیسے ہم جو پہاڑوں کے اندر یا زمین کی گہرائی میں پوشیدہ غاروں میں اتر کر اطمینان سے اُن کا جائزہ لیتے ہیں ایسے میں بھی نہایت سکون سے ٹارچ کی روشنی کبھی چھت کے کسی حصے پر کبھی فرش کے پتھروں پر ڈالتا مرکوز کرتا

اُن کے کھردرے پن اور ساخت پر غور کرتا دیر تک رُکا رہا.. جیسے یہ ایک معمول ہو.. میں ہر روز اسی راستے سے گزر کر جانے والا ہوں.. اور اس میں تعجب کا پہلو یہ تھا کہ ڈر کا کوئی ایک ذرہ بھی میرے بدن سے چمٹ کر مجھے خوفزدہ نہیں کرتا تھا.. اتنی خالص تنہائی میں.. ایک پورے پہاڑ کے اندر ایک سرنگ کے اندر مکمل اکلاپے میں.. میں نڈر تھا..

کیا پتہ بابا بھی آتے جاتے یہاں کچھ دیر رُکتے ہوں.. ان پتھروں کی بناوٹ پر غور کرنے کے لیے..

لیکن نہیں..

وہ نہیں رُکتے ہوں گے.. اس سُرنگ میں کچھ دیر نہیں رُکتے ہوں گے.. وہ اپنے آپ میں گم گزرتے ہوں گے جلد از جلد غارِ حرا کی آغوش میں جا بیٹھنے کے لیے..

پر اپنے ہاتھ تو رکھتے ہوں گے.. سہارا لیتے ہوں گے اُنہی پتھروں کا جن پر میں ہاتھ رکھتا تھا..

میں نے کچھ دیر یہی کام کیا.. سرنگ کی چٹانوں اور پتھروں پر ہر جگہ اپنا ہاتھ رکھا.. اُنھیں سر سے پاؤں تک چھوا.. فرش کو بھی کہ وہاں اُن کے نقش پا یقیناً تھے..

ذرا اتنا دُور چلا گیا تھا کہ میں اس سرنگ کے اندر بھی اگر چاہتا تو رات گزار سکتا تھا.. پھر میں نے بقیہ چند قدم اُٹھائے اور دوسری جانب باہر آیا تو بنگالی بابا کے چھپر کی چھاؤں میں آ گیا اور اس کے ساتھ ہی.. میرا چہرہ بھی وادیٔ مکہ سے اٹھنے والی ہلکی روشنی کی زد میں آ کر عیاں ہو گیا..

وہ چھپر شب کی تاریکی میں کیسی چپ سادھے ہوئے تھا.. بابا بنگالی کا سامان.. بوریا برتن.. بوسیدہ کھیس.. بیج.. کاغذوں کے پلندے سب ایک ساکت تصویر تھے جس پر سیاہی غالب آ چکی تھی.. صرف وہ اشیاء قدرے نمایاں تھیں جو چھپر چھاؤں سے ذرا پرے چاندنی وصول کر رہی تھیں..

میں نے اسی چھپر کے پہلو میں سے اُترتے ایک راستے پر بابا بنگالی کو فارغ ہونے کے لیے اُترتے دیکھا تھا اور یہی سوچ کر آیا تھا کہ میں بھی اسی راستے پر چل کر ذرا نیچے چلا جاؤں گا جہاں کوئی نہ کوئی متعینہ مقام ہو گا جو بوجھ خالی کرنے کے کام آتا ہو گا..

لیکن اب جو غور کیا تو نیچے اُترنے والا کوئی واضح راستہ تو دکھائی نہ دیتا تھا.. شاید راستہ تھا ہی نہیں اور بابا بنگالی اپنے تجربے کے زور پر اُترتا تھا.. یوں بھی اس اندھیرے میں نیچے جانے سے میں جھجکتا تھا کہ کہیں اُترتے ہوئے سنگریزوں پر کے پاؤں کھسک نہ جائیں، کوئی پتھر راہ میں آ گیا تو ٹھوکر نہ لگ جائے.. کہ وادیٔ مکہ سے اوپر آنے والی روشنی ناکافی تھی اور تاریخ کی روشنی بھی میرے تجربے کے مطابق پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر اونچ نیچ واضح نہیں کرتی تھی اکثر دھوکا دے جاتی تھی.. میں بے شک

بے خطر اُتر جاتا اگر یہ کوئی اور کوہ ہوتا جبلِ نور نہ ہوتا.. قیام کسی اور غار میں ہوتا غارِ حرا میں نہ ہوتا لیکن اُس لمحے نزاکت ایسی تھی جیسے وقت کا پیالہ کانچ کا ہاتھوں میں تھامے چلتا ہوں کہ کہیں ذرا سی لغزش پا سے یہ چھوٹ نہ جائے کرچی کرچی ہو کر ہمیشہ کے لیے یہ وقت مجھ سے جدا نہ ہو جائے.. میں اپنے آپ کو زخمی نہ کراؤں.. کہیں چوٹ ایسی نہ آ جائے کہ یہ جام کانچ کا جو لمحۂ موجودگی ہے کو سنبھالتا ہے ٹوٹ نہ جائے.. مے بہہ نہ جائے.. کہ یہ متاع میرے لیے بہت قیمتی تھی.. یہ وہ جام سفال نہ تھا جو بازار میں عام تھا.. اس لیے اسے سنبھالنا تھا کوئی خطرہ مول نہیں لینا تھا.. یہ لمحہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا تھا..

چنانچہ میں نے اُس راستے پر اُترنے کا ارادہ ترک کیا.. اب کسی اور مقام کو کھوجنا تھا.. سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں لیکن وہاں تو مسجد کا چبوترا تھا.. چھپر تھا.. وہاں تو نہیں.. پھر ادھر چھپر کے دوسری جانب جہاں کھلی فضا ہے جدھر سے میں اور نمیر غارِ حرا کی چھت تک پہنچے تھے وہیں کہیں ممکن ہو سکتا تھا..

چھپر کے آگے.. سُرنگ چھپر کے دائیں جانب ہے تو بائیں جانب ایک دو قدم اُٹھانے کے بعد راستہ مسدود ہو جاتا ہے اور ایک ہموار قسم کی چٹان آگے آ جاتی ہے.. میں اُس پر اپنے جوگر جماتا ہوں اور جھکا جھکا اُس پر چڑھتا ہوں.. جیسے میں حج کے ایام میں نمیر کے ہمراہ اسی پتھر پر چڑھا تھا لیکن تب اور اب میں بہت فرق تھا..

تب ایک انبوہِ کثیر کی دھکم پیل میں تھا.. دن کی روشنی میں تھا.. بیٹے کے سہارے پر قائم تھا.. اور اب میں رات میں تھا اور تنہا تھا.. تو اُس چٹان پر دو چار قدم چڑھتے ہوئے بھی میں بہت ذرا تشویش میں قدم اٹھائے کہ مجھے اب ساعتوں کے کٹورے لمحوں کے پیالے اور وقت کے جام بھی تو سنبھالنے تھے.. نہ سنبھال سکا تو اس رات کو کھو دوں گا.. یہاں گر گیا یا اپنے آپ کو لاچار کر لیا تو یہ رات گئی.. اگرچہ رات تو نہیں کرنی تھی، نیچے جانا تو ممکن ہی نہ تھا لیکن اپنے آپ کو زخمی کر کے اگر یہیں کراہتا رہا تو فائدہ..

ساعتوں کے کٹورے کو ایسے مقام پر سنبھالے رکھنا سہل کام نہیں ہے.. مت سہل اسے جانو..

اُس چٹان پر جھکا جھکا اُوپر ہوا اور مجھے طمانیت ہوئی کہ میرے جوگر نے جواب نہ دیا تھا وہ اس کی کھردری سطح پر خوب جم کر پڑے.. ذرا بلند ہوا.. اگرچہ ڈھلوان اب بھی تھی پانچ چھ قدم چلا تو اس مقام پر پہنچ گیا جہاں میں اور نمیر آن پہنچے تھے یعنی غارِ حرا کی چھت کے پتھروں پر آن بیٹھے تھے اور یہیں کہیں میں نصفی ملاقاتِ خدا کی جانب ہاتھ بڑھا کر.. جو نفل ادا کر چکے تھے انہیں تمام کر دوہرائے تھے..

اور اب..

میں اپنے آبی بوجھ کو بھول کر عین اُس سپاٹ پر بیٹھ جاتا ہوں جہاں میں اور مُنیر بیٹھے تھے اور نیچے دیکھتا ہوں..

تو وہاں.. نیچے.. غارِ حرا کے مختصر صحن میں سوائے چاندنی کے ہجوم کے اور کچھ نہیں..

وہ سنگریزے جو غار میں لیٹے ہوئے نظر نہ آتے تھے یہاں سے آٹھ دس فٹ کی اونچائی سے الگ الگ.. چاندنی سے قلعی کیے ہوئے جدا جدا دکھائی دے رہے ہیں.. جیسے چاند کے قلعی گرنے ہر سنگریزے کو بھٹی میں گرم کر کے اس پر نوشادر چھڑک کر اُسے خوب چمکایا ہے اور پھر سے وہیں رکھ دیا ہے جہاں سے اُٹھایا تھا..

اور یہ قلعی شدہ سنگریزے سکوت میں ہیں اُن کا دم رُکا ہوا ہے..

نیاز چٹان کا ایک حصہ تھا دکھائی نہیں دے رہا تھا

صحن سے مُلحق چٹان کی بناوٹ بھی یہاں سے عیاں ہو رہی ہے.. اور اُس کی دیوار سے گرتی کھائی جو نیچے وادی کے دامن تک رُکتی ہی نہیں گرتی چلی جاتی ہے اُس کے بڑے بڑے پتھر آدھے اندھیرے میں ڈوبے ہیں اور آدھے چاندنی میں ہیں..

یہ وہی پتھر تھے جن پر سرِ شام ہنومان مہاراج کودتے تھے..

اگر وہ رات کے اس پہر بھی وہاں موجود ہوتے.. تو وہ بندر بھی آدھے چاندنی میں ہوتے اور بقیہ آدھے اندھیرے میں.. عجیب سے بندر ہوتے..

میں نے ذرا آگے ہو کر غارِ حرا کے اندر نگاہ کی.. اس لیے جھانکا کہ کہیں اور کوئی تو میرے گھر پر قابض نہیں ہو گیا..

اس چھت سے اُٹھا اور احتیاط سے اُٹھا.. میں ٹارچ گل کر چکا تھا کہ جیسے آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو جاتی ہیں ایسے اس بلندی کی کھلی فضا میں وہ چاندنی کی عادی ہو چلی تھیں.. میں نے ٹارچ اس لیے بھی بجھا دی کہ اس کی روشنی پتھروں کو مجروح کرتی تھی اور وہ غیر حقیقی لگتے تھے..

ٹارچ کی بجھاوٹ نے پتھروں کو دُھل کر چاندنی میں ایک الوہی شکل عطا کر دی تھی.. اور میں صاف دیکھ سکتا تھا..

میں مُڑ کر ذرا آگے گیا، جبلِ نور کو وہ کا آخری کنارا تھا.. جس کے پیچھے وادیٔ مکہ کا دوسرا رُخ تھا.. اور جو کنارا میرے قدموں تلے آیا اُس سے پرے ایک مختصر چٹانی ڈھلوان تھی جس پر اُترنا گویا ہمیشہ کے لیے وادی میں جانا تھا اور اس کے آگے کچھ نہ تھا ایک گہری گہرائی تھی..

میں رُک گیا..

یہ مناسب مقام لگتا تھا..

اگرچہ یہ مناسب مقام بھی حد درجہ غیر مناسب تھا.. جبلِ نور پر تھا.. غارِ حرا سے منسلک پتھروں پر تھا..

یہاں میں نے بصد معذرت اور شرمندگی... اپنے آپ کو اس آبی بوجھ سے آزاد کیا اور پھر کیسا شانت اور مطمئن محسوس کیا..

فارغ ہو کر میں ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا اور ایک سگریٹ سلگا لیا.. لائٹر کا پل دو پل کا مختصر شعلہ جو عام حالات میں دکھائی بھی نہیں دیتا یہاں نارِ جہنم کی مانند بھڑکا اور آس پاس کو عیاں کر کے بجھ گیا.. تاریکی چھا گئی.. اُس شعلے کا اثر زائل ہوا تو چاندنی لوٹ آئی.. بارھویں کی چاندنی لوٹ آئی.. ہر پتھر اور چٹان کے لیے قلعی گر ہو گئی..

میں نے ایک اور کش لگایا اور سرک کر اپنا چہرہ رُوبرو کر لیا.. رُخ خانہ کعبہ کی جانب پھیر لیا..

جبلِ نور کی چوٹی پر تُرکوں کی مٹ چکی مسجد کے سیمنٹ کے فرش پر جب میں نمازِ عشاء کے لیے تنہا کھڑا ہوا تھا تو نیچے دُور تک دکھائی دینے والی وادیٔ مکہ کے آخر میں خانہ کعبہ کا منور کھلونا اگرچہ ایک حباب ایک سحر لگتا تھا اُس کا روشن وجود میری بے یقینی کے سمندروں پر تیرتا تھا.. لیکن یہاں سے جو منظر دکھائی دے رہا تھا وہ بھی ایک اَنت عجوبہ تھا.. دماغ کے ہر ہر خلیے پر یہ روشن گھر ایسے نقش ہوتا تھا جیسے کوہِ طور پر دس خدائی احکام نقش ہوتے تھے..

میں چوٹی پر نہ تھا.. جبلِ نور کی آخری چٹانوں کے آخری کنارے پر بیٹھا تھا اور دو چار ہاتھ آگے یہ کنارا یکلخت کھائی میں گر جاتا تھا تو یوں..

ہم دونوں کے درمیان کچھ حائل نہ تھا..

ہم ایک دوسرے کے مقابل تھے..

چہرہ بہ چہرہ رُوبرو تھے..

میں ایک طائر کی مانند بلندی سے.. جیسے میں اس کی جانب پرواز کرتا جا رہا ہوں اُس کھلونے کو تکتا تھا..

میں اور خانہ کعبہ.. دو ڈھائی کلومیٹر ہمارے درمیان والی مسافت جس پر میری آنکھیں سفر کرتی اُس تک جاتی تھیں..

یا ایک اور عنایت کے سوا کچھ نہ تھا..

ایک اور مہربانی ایک کرم تھا جو مجھ پر ایک روشن صحیفے کی مانند اتر رہا تھا اور کیوں نہ اترتا کہ یہیں جن پتھروں پر میں بیٹھا ہوا تھا ان کے بطن میں وہ کھوہ تھی جہاں سب کچھ اترا تھا..

اگر مجھ میں غارِ حرا میں ہی رات کرنے کی ہوس نہ ہوتی تو پھر یہ ایسا مقام تھا جہاں میں ٹانگیں سمیٹے اُن کے گرد اپنے بازو حمائل کیے گھٹنوں پر سر رکھے شب بھر یونہی دیدار کرتا.. رُو بہ رُو رہتا.. چہرہ بہ چہرہ رہتا..

''اگر مجھے تیرے رُو بہ رُو ہونے اور آمنے سامنے ہونا نصیب میں ہو تو میں تیرا غم نکتہ بہ نکتہ اور ہو بہو بیان کروں''

تو یہ تو میرے نصیب میں آ گیا تھا کہ میں اُس کے رُو بہ رُو اور آمنے سامنے تھا تو کر بیان اپنا غم نکتہ بہ نکتہ اور ہو بہو.. کیوں نہیں کرتا..؟

نہیں کر سکتا..

ربِ کعبہ سے نہیں کر سکتا.. وہ ماورا ہے میری فہم سے' میری پہنچ میں نہیں ہے.. میرا چہرہ تو ہے پر تیرا کوئی ایک چہرہ ہو تو اُس کے سامنے بیان کروں.. اور میں تیرا کوئی ایک چہرہ بھی تصور میں نہیں لا سکتا. تیری موجودگی ہے پر تیری شکل کو کیسے اپنے سامنے تصویر کروں.. بس ایک ہی صورت ہے کہ میں بابا کے وسیلے سے تجھ تک پہنچوں.. بیان کروں تو اُن سے کہ اُن کا چہرہ تو میری پہچان پر ثبت ہے.. اور یہ بھی جان لے کہ اگر میں یہاں ہوں تو اُن کا مہمان ہوں اُن کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہوں تو اپنے میزبان کے وسیلے سے ہی تجھ تک پہنچنے کی سعی کرتا ہوں..

''طاہرہ نے اپنی کتابِ دل کا ایک ایک صفحہ' ایک ایک تہہ اور ایک ایک پردہ دیکھ لیا تھا. لیکن وہاں تیرے عشق کے سوا اور کچھ بھی نہ پایا''

اگرچہ رُو بہ رُو تو ہے لیکن میں تجھ میں فقط تیرے یار کا چہرہ دیکھتا ہوں..

''میں تیرے چہرے کے دیدار کے لیے بادِ صبا کی مانند گھر گھر' در در اور کوچہ کوچہ پھرتی

ہوں..

یہی وہ گھر ہے.. یہی وہ در ہے.. اور یہی وہ کوچہ ہے جس میں میرا قیام ہے.. اور میرے اور تیرے درمیان کچھ حائل نہیں سوائے یار کے چہرے کے.. اور اُس کے بغیر تو بھی بے رنگ ہے.. تیرے سب رنگ اُس کے رنگ سے ہیں جمالِ یار کے رنگ سے ہیں..

میں اُس کے گھر میں ہوں اور تیرے گھر کو دیکھتا ہوں..

میں فراموش کر گیا کہ ان پتھروں کے نیچے ایک کھوہ میں میرا تنگ تھیلا پڑا ہے جو میرا سرہانہ ہے اس شب میں قیام کے لیے.. میں اس منظر میں ایسا گم ہوا..

بہت دیر بعد میں نے اُوپر دیکھا..

اُوپر بارہویں کا مدھم چاند اپنا سفر طے کرتا جبلِ نور کی چوٹی سے اتر کر عین میرے سر پر اپنی بھسی ہوئی کرنیں ایک مدھم آبشار کی صورت گرا رہا تھا.. تب میں نے محسوس کیا کہ میں کہیں بھی اپنی حیات میں اس قدر نزدیکی میں نہیں ہوا تھا..

اُس کا گھر تو کچھ فاصلے پر دمکتا تھا لیکن آسمانوں سے اُس کی اترنے والی قربت جیسے مجھ پر نازل ہو رہی تھی..

پیغامبری کے جتنے بھی سلسلے تھے سب کے سب بلندیوں پر ہی اترے..

کبھی ایک ٹیلے پر.. پیغامبروں کے باپ ابراہیمؑ کا ظہور ماہتاب سے اور کبھی طلوعِ آفتاب سے متاثر ہونا اور اُن کو رد کر دینا..

کبھی کوہِ طور کی سلگتی نور سے دہکتی جھاڑی کو دیکھ کر اپنے جوتے اُتارتے ہوئے موسیٰؑ..

کبھی پہاڑی کے واعظ کی صورت میں ابنِ مریمؑ!

اور آخر.. پیغامبری کے اختتام پر.. یہاں جہاں میں بیٹھا تھا' یہیں ان پتھروں میں پوشیدہ ایک غار میں.. میرے محمدؐ!

تو میں ان تمام نزدیکیوں کے قرب میں.. جتنا امکان میں تھا اتنا تھا..

بے شک وہ شہ رگ سے بھی قریب ہے لیکن اگر وہ اپنی تخلیق کردہ کائنات کے کسی گوشے میں نزدیک تر تھا تو یہاں تھا..

سامنے اس رات میں اُس کے گھر کا الاؤ تھا..

اُوپر.. اس رات میں اُس کی نزدیکی میں.. میں اُس کے نزدیک تر تھا..

وہ لاشریک تھا تو میں جو کوہِ نور کے آخری کنارے پر اس رات میں تنہا بیٹھا تھا تو میرا بھی اُس

لمحے کوئی شریک نہ تھا..

میرا منہ تو دل کعبے شریف تھا ہی لیکن وہاں اتنی جگہ نہ تھی کہ اُس کے ساتھ سلسلۂ گفتگو جاری کرتا.. بمشکل کھڑا ہو کر سنبھلتا اگر نیت کر بھی لیتا ہوں تو جو مقام سجدے کا ہے وہاں تو تاریک خلا ہے.. نور کا پہاڑ اُس سے پیشتر ہی کھائی میں گرتا ہے تو میں نے وہیں بیٹھے بٹھائے.. اُسی حالت میں.. ٹانگوں کے گرد بازو حائل کیے.. گھٹنوں پر اپنا چہرہ رکھے اُسے تکتے دو نفل ادا کیے.. نہ کھڑا ہوا نہ رکوع میں گیا.. وہیں اُسی حالت میں بیٹھے سلام پھیرا..

یہاں نہ صرف یہ کہ اُس کی نزدیکی بہت نزدیک تھی بلکہ کھائی کے پار جو کوہ نظر آ رہا تھا سیاہ اور مہیب.. رات میں رات ہوتا.. وہی کوہ ہو سکتا تھا.. بابا غارِ حرا میں سے نکلتے ہیں تو بہت ڈرے ہوئے کہ یہ مجھ پہ کیا بیت گئی.. یہ کیسا خواب تھا.. یہ کون تھا جو مجھے پڑھنے کے لیے کہتا تھا اور میں کہتا تھا کہ میں پڑھ نہیں سکتا تو بھی پڑھنے کے لیے کہتا تھا.. اور تب وہ اسی سامنے والے کوہ پر ایک شخص کو دیکھتے ہیں.. جو فلک تک جاتا ہے اور وہ جدھر اپنا رُخ کرتے ہیں وہ شخص وہیں نظر آتا ہے..

اُفق سے اُفق تک.. وہی شخص نظر آتا ہے..

اُوپر جو ہے وہ شہ رگ سے بھی قریب تر یہاں ہے اور سامنے اُس کا گھر دمکتا ہے ایسے مقام سے کیسے اُٹھنے کو جی چاہے.. صرف تب چاہے جب دنیا سے اُٹھ کر آپ اُس کے گھر جانا چاہیں جس نے آگاہ کیا کہ وہ شہ رگ سے بھی نزدیک ہے

جس نے اُس کے گھر کی پہچان کروائی کہ وہ یہاں رہتا ہے..

واپسی پر وہی راستے..

اُتر آئی تھی بابا بنگالی کے چھپّر تک.. میں احتیاط سے جو گر جاتا اُس کے چھپّر تک پہنچا..

اور پھر اپنی سرنگ میں.. چھوٹی ٹارچ کو روشن کر کے داخل ہو گیا..

سُرنگ کے آخر میں جو ایک بڑا پتھر تھا اُس کے ایک حصے کو چاندنی نے قلعی کر دیا تھا..

چاندنی جو صحن میں پھیل کر سُرنگ کے اندر جھانکنے لگی تھی..

نیاز.. جیسا کہ میں اُسے چھوڑ گیا تھا ویسے کا ویسا چٹان کی جانب چہرہ کیے ایسا غافل تھا کہ نہ کوئی اُس کی موجودگی تھی اور نہ یہ لگتا تھا کہ وہ موجود ہے.. حاضر نہیں لگتا تھا.. غائب لگتا تھا.. اگرچہ کچھ کچھ دکھائی دیتا تھا پر ایسا کہ کبھی وہ کچھ کچھ بھی دکھائی نہ دے..

میں وہ رات غار میں جانے کی بجائے دیوار کی جانب گیا.. اُس پر ہاتھ رکھ کر اُس رات

میں پنہاں ہو کر چاندنی کی رِدا اوڑھے اُس وادی کو تکتا رہا جو نشیب میں پھیلی ہوئی تھی.. میں نے تادیر اُس کوہ کو دیکھا جس پر ایک شخص اُفق تا اُفق اپنا وجود پھیلائے کھڑا نظر آیا تھا.. اور کچھ دیر میں نے چاند کو دیکھا جو میرے عین اُوپر.. صحن کے عین اوپر نہ مکمل طور پر روشن تھا اور نہ سراسر مدھم ہوتا تھا.. پھر میں نے رُخ موڑا اور غار میں قدم رکھا.. قدم رکھا تو رُک گیا بلکہ ٹھٹک گیا کہ اُس کی تاریکی میں جا بجا چاندنی کے چھاپے ثبت تھے.. سفید جزیرے سے جلتے تھے.. اور میں بھول گیا تھا کہ وہ وہاں ہیں..

اور وہ وہاں تو نہیں تھے جہاں میں اُوپر جانے سے پیشتر انہیں چھوڑ گیا تھا.. وہ چاند کے سفر کے ساتھ مدھم مدھم سفر کرتے اپنی جگہ بدل کر سرکتے ہوئے آگے ہو گئے تھے..

وہاں نہیں تھے جہاں وہ تھے.. رینگتے ہوئے کچھ فاصلہ.. ایک آدھ بالشت کا طے کر چکے تھے..

وہ وقت کے ساتھ سفر میں تھے.. رات گزرتی تھی تو وہ بھی اُس کی آہنگی کے پہلو بہ پہلو سرکتے جاتے تھے..

اور جب میں اندر داخل ہوا تو اُن میں سے تین جزیرے میرے بدن پر منتقل ہو کر لو دینے لگے.. اور میں نے اُن کی ٹھنڈک محسوس کی..

اندر داخل ہوا تو سب سے پہلے دُودھ کی بوتل سے منہ لگا کر ایک بہت گہرا اور سفید گھونٹ بھرا کہ میں بہت پیاسا ہو رہا تھا.. وہ طویل گھونٹ بھر کر میں نے بوتل کو اپنی آنکھوں کے سامنے لا کر اُسے ٹارچ سے روشن کیا یہ تعین کرنے کے لیے کتنا دُودھ باقی ہے کہ ابھی تو رات باقی ہے.. لیکن اندھے پلاسٹک میں سے دُودھ کی سطح دکھائی نہ دی البتہ ذرا چھلکانے سے اندازہ ہوا کہ میری توقع سے زیادہ دُودھ ابھی باقی تھا..

میں صحن کی جانب رُخ کر کے مصلّے پر براجمان ہو گیا.. نیند مجھ سے کوسوں تو نہیں بس اتنی دُور تھی کہ اگر میں اُسے بلا لیتا تو وہ آ جاتی.. نہ بلاتا تو وہیں تھمی رہتی.. میں نے نہ بلایا.. وہ منتظر رہی.. ہمیشہ بلا لیتا ہوں آج میرا انتظار کر.. کارِ جہاں دراز ہے.. اب میرا انتظار کر..

کچھ نہ کچھ سلسلہ درود و سلام کا سلسلہ جاری رہتا.. کبھی تسبیح کے دانے پھرولنے لگتا.. پھر صحن میں براجمان چاندنی کی شفاف دُھند کو یونہی بے دھیانی میں تادیر تکتا رہتا.. اپنے اندر اُتارتا رہتا.. یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں.. تو جوانی کے اوائل کا یہ گیت یہاں کچھ اور ہی مفہوم لے کر آ گیا.. اُن دنوں یہ گمان کہاں ممکن تھا کہ رات یہ ہو گی.. یہاں ہو گی اور یہ چاندنی ہو گی.. پیڑوں کی شاخوں پہ سوئی سوئی چاندنی.. ہاں صحن میں چاندنی سوئی سوئی لگتی تھی.. اور میرے خیالوں میں کھوئی کھوئی چاندنی.. یہاں اور کس کا خیال تھا.. کس کا جمال تھا.. جس کا خیال آ سکتا.. یہ کبھی سنبھال لینے والی چاندنی تھی.. پر یہ میرے سنبھالے

لمحے کوئی شریک نہ تھا..

میرا منہ تو دل کعبے شریف تھا ہی لیکن وہاں اتنی جگہ نہ تھی کہ اُس کے ساتھ سلسلۂ گفتگو جاری کرتا.. بمشکل کھڑا ہو کر سنبھلتا اگر نیت کر بھی لیتا ہوں تو جو مقام سجدے کا ہے وہاں تو تاریک خلا ہے.. تو کا پہاڑ اُس سے پیشتر ہی کھائی میں گرتا ہے تو میں نے وہیں بیٹھے بٹھائے.. اُسی حالت میں.. ٹانگوں کے گرد بازو حمائل کیے.. گھٹنوں پر اپنا چہرہ رکھے اُسے تکتے دو نفل ادا کیے.. نہ کھڑا ہوا نہ رکوع میں گیا.. وہیں اُسی حالت میں بیٹھے سلام پھیرا..

یہاں نہ صرف یہ کہ اُس کی نزدیکی بہت نزدیک تھی بلکہ کھائی کے پار جو کوہ نظر آ رہا تھا سیاہ اور مہیب.. رات میں رات ہوتا.. وہی کوہ ہو سکتا تھا.. بابا غارِ حرا میں سے نکلتے ہیں تو بہت ڈرے ہوئے کہ یہ مجھ پہ کیا بیت گئی.. یہ کیسا خواب تھا.. یہ کون تھا جو مجھے پڑھنے کے لیے کہتا تھا اور میں کہتا تھا کہ میں پڑھ نہیں سکتا تو بھی پڑھنے کے لیے کہتا تھا.. اور تب وہ اسی سامنے والے کوہ پر ایک شخص کو دیکھتے ہیں.. جو فلک تک جاتا ہے اور وہ جدھر اپنا رُخ کرتے ہیں وہ شخص وہیں نظر آتا ہے..

اُفق سے اُفق تک.. وہی شخص نظر آتا ہے..

اُوپر جو ہے وہ شہ رگ سے بھی قریب تر یہاں ہے اور سامنے اُس کا گھر دمکتا ہے.. ایسے مقام سے کیسے اُٹھنے کو جی چاہے.. صرف تب چاہے جب دنیا سے اُٹھ کر آپ اُس کے گھر جانا چاہیں.. جس نے آگاہ کیا کہ وہ شہ رگ سے بھی نزدیک ہے

جس نے اُس کے گھر کی پہچان کروائی کہ وہ یہاں رہتا ہے..

واپسی پر وہی راستے..

اُترائی تھی بابا بنگالی کے چھپر تک.. میں احتیاط سے جوگر جماتا اُس کے چھپر تک پہنچا..

اور پھر اپنی سرنگ میں.. چھوٹی ٹارچ کو روشن کر کے داخل ہو گیا..

سُرنگ کے آخر میں جو ایک بڑا پتھر تھا اُس کے ایک حصے کو چاندنی نے قلعی کر دیا تھا..

چاندنی جو صحن میں پھیل کر سُرنگ کے اندر جھانکنے لگی تھی..

نیاز.. جیسا کہ میں اُسے چھوڑ گیا تھا ویسے کا ویسا چٹان کی جانب چہرہ کیے.. ایسا غافل تھا کہ نہ کوئی اُس کی موجودگی تھی اور نہ یہ لگتا تھا کہ وہ دنیا میں ہے.. حاضر نہیں لگتا تھا.. غائب لگتا تھا.. اگرچہ کچھ کچھ دکھائی دیتا تھا پر ایسا کہ کبھی وہ کچھ کچھ بھی دکھائی نہ دے..

[illegible] کی بجائے دیوار کی جانب گیا.. اُس پر ہاتھ رکھ کر اُس رات

میں پیماں بھر چاندنی کی ردا اوڑھے اُس وادی کو تکتا رہا جو نشیب میں پھیلی ہوئی تھی.. میں نے تا دیر اُس کوہ کو دیکھا جس پر ایک شخص اُفق تا اُفق اپنا وجود پھیلائے کھڑا نظر آیا تھا.. اور کچھ دیر میں نے چاند کو دیکھا جو میرے عین اُوپر.. صحن کے عین اوپر نہ مکمل طور پر روشن تھا اور نہ سراسر مدھم ہوتا تھا.. پھر میں نے رُخ موڑا اور غار میں قدم رکھا.. قدم رکھا تو رُک گیا بلکہ ٹھٹک گیا کہ اُس کی تاریکی میں جابجا چاندنی کے پھاہے تھے.. سفید جزیرے سے چلتے تھے.. اور میں بھول گیا تھا کہ وہ وہاں ہیں..

اور وہ وہاں تو نہیں تھے جہاں میں اوپر جانے سے پیشتر انہیں چھوڑ گیا تھا.. وہ چاند کے سفر کے ساتھ مدھم مدھم سفر کرتے اپنی جگہ بدل کر سرکتے ہوئے آگے ہو گئے تھے..

وہاں نہیں تھے جہاں وہ تھے.. رینگتے ہوئے کچھ فاصلہ.. ایک آدھ بالشت کاٹ کر چلے تھے..

وہ وقت کے ساتھ سفر میں تھے.. رات گزرتی تھی تو وہ بھی اُس کی آہستگی کے پہلو بہ پہلو سرکتے جاتے تھے..

اور جب میں اندر داخل ہوا تو اُن میں سے تین جزیرے میرے بدن پر منتقل ہو کر لو دینے لگے.. اور میں نے اُن کی ٹھنڈک محسوس کی..

اندر داخل ہوا تو سب سے پہلے دودھ کی بوتل سے منہ لگا کر ایک بہت گہرا اور سفید گھونٹ بھرا کہ میں بہت پیاسا ہو رہا تھا.. وہ طویل گھونٹ بھر کر میں نے بوتل کو اپنی آنکھوں کے سامنے لا کر اُسے ٹارچ سے روشن کیا یہ تعین کرنے کے لیے کتنا دودھ باقی ہے کہ ابھی تو رات باقی ہے.. لیکن اندھے پلاسٹک میں سے دودھ کی سطح دکھائی نہ دی البتہ ذرا چھلکانے سے اندازہ ہوا کہ میری توقع سے زیادہ دودھ ابھی باقی تھا..

میں صحن کی جانب رُخ کر کے مصلے پر براجمان ہو گیا.. نیند مجھ سے کوسوں تو نہیں بس اتنی دور تھی کہ اگر میں اُسے بلا لیتا تو وہ آ جاتی.. نہ بلاتا تو وہیں تھمی رہتی.. میں نے نہ بلایا.. وہ منتظر رہی.. ہمیشہ بلا لیتا ہوں آج میرا انتظار کر.. کار جہاں دراز ہے.. اب میرا انتظار کر..

کچھ نہ کچھ سلسلہ درود و سلام کا سلسلہ جاری رہتا.. کبھی تسبیح کے دانے پھرولنے لگتا.. پھر صحن میں براجمان چاندنی کی شفاف دھند کو یونہی بے دھیانی میں تادیر تکتا رہتا.. اپنے اندر اُترتا رہتا.. یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں.. تو جوانی کے اوائل کا یہ گیت یہاں کچھ اور ہی مفہوم لے کر آ گیا.. اُن دنوں یہ گمان کہاں ممکن تھا کہ رات یہ ہو گی.. یہاں ہو گی اور یہ چاندنی ہو گی.. پیڑوں کی شاخوں پہ سوئی سوئی چاندنی.. ہاں صحن میں چاندنی سوئی سوئی لگتی تھی.. اور تیرے خیالوں میں کھوئی کھوئی چاندنی.. یہاں اور کس کا خیال تھا.. کس کا جمال تھا.. جس کا خیال آ سکتا.. یہ کیسی سنبھال لینے والی چاندنی تھی.. پر یہ میرے سنبھالے

سے کہاں سنبھلتی تھی.. اگرچہ اس کی ایک کرن بھی حیات کے تاریک راستوں کو پکا چوند کر دینے پر قادر تھی پر ایک کرن بھی کہاں سنبھلتی تھی. تب میں نے یہی یقین کیا تھا کہ ایسا ہو جانا ممکن نہیں ہے.. پر اب جب کہ میں غارِ حرا میں بسر ہونے والی اُس رات کا بیان کرتا ہوں تو اب یقین کرتا ہوں کہ کوئی ایک کرن میری رہنمائی کے لیے میرے ساتھ چلی آئی تھی.. میرے قلم کی نوک میں اُس کا کوئی ایک ذرہ سرایت کر چکا ہے ورنہ میں کیسے اتنی تفصیل سے جزیات کے ساتھ اُس رات کو یاد کر سکتا ہوں.. یہ اُس ایک کرن کا کمال ہے..

اور کبھی میں اپنے مسلسل ہیجان میں آئے ہوئے بدن کو پرسکون کرنے کی خاطر لیٹ جاتا اگرچہ اس بے چین ہیجانی کیفیت میں بھی ایک مزا تھا.. لیٹتا تو چاندنی کے دھبے میرے بدن پر آ ٹھہرتے.. میں کسی ایک دھبے کو غور سے... تادیر تکتا رہتا کہ شاید میرے یوں ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھتے رہنے سے چاند کے سفر کے ساتھ ساتھ اُس کی کوئی خفیف سی حرکت کا اندازہ ہو.. پر یہ کیسے ممکن تھا. اور کبھی میں اپنا رُخ بدل کر وہیں مصلے پر بیٹھا ہوا صحن سے منہ موڑتا اور غار کی تاریکیوں کو وقت بہت تکنے لگتا اور میری نظروں کے سامنے وہ غار تنگ ہوتی اُس شگاف تک چلی جاتی جو اُس کے آخر میں عیاں تھا. وادیٔ مکہ سے اُبھرنے والی روشنیاں اُسے تاریکی میں آویزاں ایک روشن تصویر کر دیتیں.. پھر میں بائیں جانب اُٹھتی چٹان کی پتھریلی سطح پر اپنا بایاں رُخسار جما کر.. بلکہ چپکا کر جب اُس شگاف کی جانب بمشکل دیکھتا تو اُس کے دائیں حصے میں خانہ کعبہ کا ایک مینار.. منور اور دُودھیا.. ایک آدھی پنسل کی جسامت جتنا بمشکل نظر آنے لگتا.. اور میں سانس روکے کچھ دیر اُسے دیکھتا رہتا اور اس حالت میں چٹان کے ساتھ گال جمائے ایسے کہ جبڑے کی ہڈی پر بوجھ پڑتا ہو زیادہ دیر ممکن نہ ہوتا.. میں ایک گہرا سانس بھی لیتا' میرے رُخسار میں وہ سانس بھرتا تو وہ مینار تاریک پتھروں کی اوٹ میں چلا جاتا.. اور میں پھر سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا..

صحن سے منہ موڑے غار کی تاریکی اور اُس شگاف کو قبلہ بنائے.. کہ قبلہ اُسی جانب تھا. میں جب بہت دیر تک اسی حالت میں بیٹھا رہا.. غار اُس شگاف کی جانب بڑھتی تاریک تر ہوتی چلی جاتی تھی.. تنگ تر ہوتی جاتی تھی تو اُس لمحے میری کوہ نوردی کی کھولت زدہ خصلت نے مجھے پکو کا دیا.. کہ جیسے ایک کوہ پیما کسی ناممکن نظر آتی چوٹی پر پہنچنے کی تمنا کا جواز صرف یہ پیش کرتا ہے کہ میں نے وہاں جانا ہے کیونکہ وہ وہاں ہے.. تو یہ تنگی اور تاریکی اور غارِ حرا کی تنگی اور تاریکی میرے سامنے ہے تو وہاں تک جایا جائے.. ذرا آگے ہو کر اُس شگاف تک پہنچا جائے کہ وہ بھی وہاں ہے..

میرے پاس کھوج لگانے کے لیے وقت بھی تو بہت تھا..

اس غار کے آخر تک جایا جائے.. دیکھا جائے کہ کیا محسوس ہوتا ہے.. کیا کیا کچھ وہاں ہے جو یہاں بیٹھے ہوئے محسوس نہیں کیا جا سکتا..

جہاں میرا اتھنی تھیلا ایک تکیے کے طور پر دھرا تھا اُس سے آگے غار کی چھت' دیواروں کی بانہیں اور فرش.. یا فرش پر جو پتھر تھے وہ ایک دوسرے کی قربت میں آنے لگتے تھے.. اس تھیلے سے آگے کھڑے ہو کر تو نہیں جایا جا سکتا تھا.. میں کمر تک جھکا پھر بھی ذرا آگے ہوا تو سر کو چھت کے ایک پتھر سے بمشکل بچایا.. اس حالت میں دو قدم آگے گیا ہوں گا جب جھک کر کبڑا ترین ہونے کے باوجود بھی آگے جانا ممکن نہ تھا.. جھکنے کے بعد اگلا مرحلہ تو لیٹ جانا ہوتا ہے چنانچہ میں احتیاط سے اپنے ہاتھ پھیلائے.. اور دونوں ہاتھوں نے دائیں بائیں غار کی دیواروں کو تھاما.. میں ایسے لیٹ گیا جیسے اعتراف گناہ کرنے والے اعتراف سننے والے کے سامنے منہ فرش پر رکھے لیٹ جاتے ہیں..

میرے سینے اور ٹانگوں تلے کوئی ہموار فرش نہ تھا.. سنگریزے تھے ایک دو اُبھرے ہوئے پتھر تھے جو اگر کلام کر سکتے تو مجھے سخت سرزنش کرتے کہ تم یہ کیا لایعنی حرکت کر رہے ہو.. صدیوں سے لوگ آتے ہیں غار کے دہانے میں عبادت کرتے ہیں چلے جاتے ہیں' ہمیں دیکھ نہیں سکتے کہ ہم تاریکی میں پوشیدہ اطمینان میں ہوتے ہیں تو تم پر کیا اُفتاد پڑی ہے.. یہاں کیا لینے آئے ہو..

چونکہ وہ کلام نہیں کر سکتے تھے اس لیے لیٹنے کے بعد میں ایک نادان تیراک کی مانند دونوں ہاتھوں کو چلاتا.. بلکہ پتھروں کو تھامتا.. ہولے ہولے رینگتے ہوئے آگے ہونے لگا..

اور ہولے ہولے غار کی پتھریلی تنگی مجھ پر مزید تنگ ہونے لگی.

یہاں آس پاس بہت سے اندھے سوراخ اور گڑھے تھے.. کچھ تاریک شگاف تھے جن میں حشرات الارض میں سے کچھ بھی مقیم ہو سکتا تھا.. کہ اِدھر اس نوعیت کی آمدورفت کا رواج نہ تھا..

اور ہاں جب وہاں لیٹے ہوئے.. ایک ایک مسام پیٹ کے بل رینگتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ شب میں مصلے پر بیٹھا' صحن کی جانب چہرہ کیے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا تو یونہی دائیں جانب جو چٹان میرے بدن کے برابر میں سے اُٹھتی تھی اُسے ٹٹولتا رہتا تھا تو میرے برابر میں ایک دراڑ تھی.. چٹان کے اندر ایک خلا تھا اور میں نے بے خطر اس میں ہاتھ ڈال کر اس کی اندرونی حالت جاننے کی.. اُس کے اندر مشکل چلا کر یہ جاننے کی سعی کی کہ اس کا حدود اربعہ کیا ہے تو میرا ہاتھ ایک پلاسٹک کے بیگ سے جا ٹکرایا.. اور وہاں کچھ سنگریزے بھی پوشیدہ تھے.. میں انہیں ٹٹولتا رہا.. اُن کے سوا بھی تو وہاں کچھ ہو سکتا تھا یہ خیال میرے ذہن میں ایک پل کے لیے بھی نہ آیا' میرے ہوتے اس خیال میں دبکے محصور ہے کہ یہ

سنگریزے.. غارِ حرا کی ایک دراڑ کے اندر جوں کے توں ہیں.. وہی ہیں جو چودہ سو برس پیشتر تھے.. مجھے اُس لمحے چاہیے تو یہ تھا کہ اُن میں سے کوئی ایک سنگریزہ غارِ حرا کے وجود کا ایک حصہ اپنے ساتھ لے آتا لیکن اُس لمحے وہ پوری غار اور اُسے وجود میں لانے والی بھاری بھرکم آڑی ترچھی ایک دوسرے کے سہارے آرام کرتی چٹانیں میرا گھر تھیں.. بھلا مجھے ایک سنگریزے کی کیا پروا تھی..

ایسے سنگریزے تو بہت بعد میں یاد آتے ہیں..

کر گئے تھے اُس گلی میں تو ایک سنگریزہ ہی لے آتے..

بہت بعد میں قلق ہوتا ہے.. اُس سنگریزے کی وقعت کا احساس ہوتا ہے..

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ اگر پورے کا پورا جبل نور آپ کا ہو.. غارِ حرا کے سب پتھر آپ کے ہوں.. شدتِ تنہائی میں وہ آپ کی ملکیت میں ہوں تب ایک سنگریزے کی کچھ حیثیت نہیں رہتی..

تو میں رینگتا ہوا.. ایک عمر رسیدہ کینچوے کی مانند سرکتا ہوا آگے ہو رہا تھا اور میرے پاؤں میرے تپتی تھیلے کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور غارِ حرا کی کوکھ مجھ پر تنگ ہو رہی تھی.. جیسے فوجی مشقوں کے دوران رینگتے ہیں.. اور میرے دونوں کندھوں سے حرا کے پتھر کھینچتے تھے' ذرا سا آگے ہوتا تھا تو شانے مزید بھنچ جاتے تھے.. ذرا سا سر اُٹھاتا تھا تو وہ چھت کی پتھریلی سطح سے چھو جاتا تھا.. غارِ حرا مجھ پر ایسے تنگ ہوئی کہ اب مزید سرکنے کی ذرہ بھر گنجائش نہیں تھی اور میں ساکت پڑا ہانپنے لگا کہ ہوا نایاب ہو رہی تھی گویا میں اُن پتھروں کا ایک حصہ بن گیا' اُن کے وجود میں بھر گیا.. میں اپنے پاؤں تو ہلا سکتا تھا لیکن بقیہ دھڑ غار کے پتھروں میں پیک ہو کر پتھر ہو گیا تھا.. گھبراہٹ ہونے لگی.. میں اس خیال سے ہراساں ہو گیا کہ کہیں خاص زاویے سے پہلو بدلنے یا ذرا سرکنے سے میں اس قبر نما تنگی میں پھنس نہ جاؤں.. پھنس گیا تو کیا ہو گا.. رات گئے اور یہاں... مدد کو کون آئے گا..

نہ سرنگ کے باہر بنگالی بابا ہے جو یونہی ٹہلتا ہوا میرا حال دیکھنے کو یونہی ادھر آ نکلے اور مجھے غار کے دہانے پر نہ پا کر اندر جھانک لے.. اور اگر میں گھٹی گھٹی آواز میں فریاد کرتا ہوں دہائی دیتا ہوں تو بھی نیند میں ڈوبے ہوئے نیاز تک کہاں پہنچے گی.. صرف ایک امکان تھا کہ میرا چہرہ اُس آخری شگاف کے قریب تھا اور اگر میں مدد کے لیے پکارتا ہوں تو شگاف سے باہر چٹان پر بیٹھا کوئی شخص میری آواز شاید سُن لے.. اور کون ہے جو رات کے اس پہر شگاف کے باہر بیٹھا ہو.. کوئی نہیں..

بے شک یہ دنیا بھر کی چٹانوں اور پتھروں سے افضل اور بلند مرتبت چٹانیں اور پتھر تھے جن میں میں ایک عمل میں بھی ایک سالم کی مانند پیک ہو چکا تھا اور بے شک ان کے پوروں میں بھا

چٹانوں کے مساموں میں میرے بابا کے سانسوں کی ہواؤ موجود ہو گی لیکن پھر بھی میں یوں زندہ درگور نہیں ہونا چاہتا تھا.. زندگی ایسی نایاب اور پیاری شے ہے.. میں کچھ دیر اسی حالت میں اوندھا پڑا رہا.. پھر پسپائی اختیار کرنے کے لیے اپنے بدن کو حرکت دی اس خوف کا اسیر ہو کر کہ شاید میں پیچھے نہ ہو سکوں.. لیکن میرے کسمسانے سے کچھ گنجائش پیدا ہو گئی.. اور میں ایک کینچوے کی مانند سست رو پیچھے سرکتا گیا..

لیکن ٹھہریے جہاں تک میں رینگتا ہوا جا پہنچا تھا اُس سے آگے کیا نظر آیا اس منظر میں آپ کو شریک تو کر لوں..

مجھ سے تقریباً ڈیڑھ دو فٹ کے فاصلے پر وہ آخری شگاف نمایاں ہو رہا تھا اور اس میں سے داخل ہونے والی ہوا کا ہلکا سا لمس میرے ماتھے پر محسوس ہوتا تھا.. ابھی چاند اتنا نہ ڈھلا تھا کہ اُس کی لو اس شگاف میں سے سرایت کر کے اندر آتی.. البتہ وادئ مکہ کی بجھی بجھی روشنیاں اور ایک دو گھر نظر آتے تھے یہاں میں نے مقدور بھر سعی کی کہ اپنے چہرے کو ذرا جنبش دے کر کوشش کی کہ شگاف میں سے خانہ کعبہ کا کوئی گوشہ نظر آ جائے پر نظر نہ آیا.. میں اپنی ٹھوڑی تلے ہتھیلی رکھ کر اُس شگاف کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ ہا ئے تو کا ہے کو یہاں تک رینگ کر آتا تھا.. تو کیا کوئی مجھ سے پہلے بھی.. ان چودہ سو برسوں میں یہاں آیا ہے.. کوئی مجذوب مجھ ایسا کوئی تجسس کا مارا یہاں تک بے وجہ رینگ کر آیا ہو گا.. یا ان پتھروں نے پہلی بار ایک انسانی بدن کو چھوا ہے اپنے درمیان پایا ہے..؟

بہت ہوں گے.. جواب آیا..

بہت ہوں گے جنہوں نے اس غار کے چپے چپے پر اپنے ہونٹ ثبت کیے ہوں گے.. ہر گوشے کو اپنے ہاتھوں سے چھوا ہو گا.. پلکوں سے چوما ہو گا.. بہت ہوں گے.. بالآخر میں سمٹتا سمٹاتا اپنے آپ کو سکیڑتا پیچھے ہوتا گیا اور جب میرے پاؤں تپتی تھیلے سے جا چھوئے تو میں نے سکھ کا ایک لمبا سانس لیا ہے..

میں اپنی نشست پر صحن کی جانب رُخ کر کے بیٹھنے کو تھا اپنی قمیض اور شلوار پر سے غار میں رینگنے کے باعث لگ جانے والی مٹی جھاڑنے کو تھا کہ میں نے ہاتھ روک لیا.. کون ہے جسے ایسے ذروں کی زیبائش نصیب ہوئی ہو.. اسے رہنے دو..

جدہ واپسی پر مجھ سے ایک کوتاہی سرزد ہو گئی.. میں نے جس لباس میں غارِ حرا میں شب بسر کی تھی اُسے دُھلوا لیا.. اور بعد میں پچھتایا.. مخلوق کے نصیب میں جب پہلی بار وحیٔ رسولؐ کے اندر

جانے اور وہاں کچھ دیر ٹھہرنے اور غلاف کو چھونے کا شرف نصیب ہوا تو اس نے بھی بے دھیانی میں اپنے لباس کو دھلوا لیا اور تب ایک رفیق کار نے اسے سرزنش کی کہ تم نے یہ کیا کیا.. تم نے اس لباس کو دھلوا لیا جسے روضۂ رسولؐ کے اندرون کی ہوا نے مس کیا تھا اور اس پر غلاف سے جھڑنے والے مٹی کے کچھ ذرے تھے.. جب اسے روضۂ رسولؐ کے اندر جانے کا ایک اور موقع ملا تو پھر اس نے لباس تو کیا وہ ٹشو پیپر بھی جوں کا توں سنبھال لیا جو اس کی جیب میں تھا..

جبلِ نور کے چبوترے پر.. حرا کے صحن پر اور غار کی چھت پر سے نصف شب یقیناً گزر چکی تھی..
شاید وقت کی سوئی ایک کے آس پاس تھی یا ذرا آگے سرک چکی تھی..
مجھے پھر بھوک ستا رہی تھی..
چند کھجوریں باقی تھیں.. اور دودھ کی بوتل ابھی تک خاصی بھاری تھی..
میں نے ایک مختصر سنیک کیا اور اس کے بعد تمباکو کی طلب پھر محسوس کی..
غار سے نکلا اور سرنگ کی تاریکی کو ٹارچ روشن کیے بغیر پار کیا.. کہ اب میری آنکھیں عادی ہو گئی تھیں اور مسلسل پریکٹس سے میں ہنومان مہاراج کی پھرتی اور کودنے پھاندنے کی صلاحیت سے قریب ہوا جاتا تھا.. بابا بنگالی کے چبوترے کے راستے کھائی کے کنارے پر بے خطر.. میں لمحوں میں حرا کی چھت پر جا بیٹھا.. اطمینان سے ایک سگریٹ پھونکا.. خانہ کعبہ کے گرد سب کچھ مدھم ہو چکا تھا لیکن اس کی دمک جوں کی توں ظاہر ہو رہی تھی.. اسے دیکھنے کا ہیجان اب دھیما ہو رہا تھا.. اسے دیکھتے ہوئے دل بدستور مسرت سے بھرتا تھا لیکن یہ منظر معمول ہوتا جاتا تھا..
سگریٹ کے خاتمے پر میں اپنی پتھریلی قیام گاہ میں لوٹ آیا..
غار میں آ بیٹھا..
کچھ فاصلے پر کھڑی... منتظر نیند کو میں نے مناسب جانا کہ اب تو بلا ہی لیا جائے.. اس پر ترس آیا کہ وہ بے چاری اتنی دیر تک بن بلائے کھڑی رہنے کی عادی نہ تھی..
بے شک تیری محفل میں رت جگا ہے لیکن تھوڑا سا ستا لینے میں کیا حرج ہے.. بابا بھی مسلسل تو نہیں جاگتے ہوں گے.. اپنی دل نشیں پلکیں بند کر کے نیند بھی کرتے ہوں گے تو ان کی پیروی کی جائے..
البتہ دو نفل.. کچھ دیر پہلے نیند سے پڑھے اور تنگ تھیلے کے سرہانے پر سر رکھ کر لیٹ گیا..
آنکھیں بند کر لیں اور نیند کو بلا لیا..

نیند جو بہت دیر سے کچھ فاصلے پر کھڑی میرے بلاوے کی منتظر تھی آئی تو کچھ جھجکی جھجکی سی تھی.. آئی مگر میری آنکھوں میں اترنے سے جھجکتی رہی اور میرے پپوٹوں کو اپنے خمار سے بھاری کر کے انہیں سلا نہ سکی..
نیند مجھ میں مکمل طور پر نہ اتر سکی.. ہاں چند لمحوں کے لیے ایک نیم غنودگی کی کیفیت طاری رہی.. آدھے سوئے آدھے جاگے کے درمیان معاملہ رہا..
پھر چند ساعتیں.. دو چار.. یا بے شمار ایسی آئیں کہ میں ایک گہری اونگھ میں چلا گیا.. یہ صحن میں اتری ہوئی مگر چاندنی کی طرح مگر نیند تھی.. بجھی بجھی.. اور میں آس پاس سے غافل ہو گیا..
اور جب میں جاگا ہوں.. جو آدھا سویا ہوا تھا وہ جاگا ہوں.. کب.. چند ساعتوں کے بعد یا بے شمار کے بعد اس کا حساب نہ ہوا تو میں نے اپنے بدن تلے اپنے مصلے کے نیچے جو قدیمی جانماز تھا اس کے نیچے جو چند سنگریزے تھے ان کی چبھن اپنے بدن پر محسوس کی.. اور اس بدن پر چاندنی کے کچھ جزیرے روشن تھے.. یہ کیا ہیں اور کہاں سے آ گئے.. تن اپنا پرانا پاپی ہے تو اس پاپی سمندر میں سے نمایاں ہونے والے یہ جزیرے کیونکر وجود میں آ گئے.. کسل مندی سے دایاں ہاتھ سیدھا کرتا ہوں تو وہ ایک چٹان پر جا ثبت ہوتا ہے بایاں ہاتھ بلند کرتا ہوں تو وہ ایک خلا میں ہے.. اوپر نظر کرتا ہوں تو نیم تاریکی میں ایک پتھریلا جھکاؤ ہے.. اور سامنے دیکھتا ہوں تو ایک ناشناسا عجب سی روشنی میں نہایا ایک مختصر صحن ہے.. یہ سب کیا ہے.. میں کہاں ہوں.. اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ یہ تم کہاں ہو..
اپنے بیڈ روم میں تو نہیں ہو.. تو پھر کہاں ہو..
بہت بار.. اپنی آوارگی کے دنوں میں اور کوہ نوردی کے دوران میں نے اپنے آپ سے بھی سوال پوچھا ہے کہ یہ تم کہاں ہو..
ایک سویر جاگا ہوں تو اس خیال میں مگن اور قید جاگا ہوں کہ اپنے بیڈ روم میں جاگا ہوں.. بستر سے آنکھوں کا جمائیاں لیتا ہوا واش روم میں داخل ہوں گا اپنا ازار بند اڑستا.. اپنے خزاں رسیدہ جھریوں کی آمد آمد چہرے پر چند چھینٹے برساؤں گا.. برش کروں گا.. اپنے کہولت زدہ چہرے اور زرد دانتوں کو دیکھ کر ان سے نظریں چراؤں گا کہ یہ میں نہیں کوئی اور ہے.. شیو کروں گا.. وغیرہ وغیرہ.. لیکن چند لمحوں بعد اپنے اوپر تنے خیمے کے پردے کو پٹ پٹ آنکھیں جھپکا کر دیکھتا ہوں تو یکدم کھلتا ہے کہ نہیں.. تارڑ جی آپ اپنے بیڈ روم میں تو نہیں جاگے.. کہیں اور ہی جاگے ہیں.. یہ تو روم سوئٹ روم کی ایک کیمپنگ ہے.. دراز وادی کی جھیل وٹلمیر کا کنارا ہے.. جھیل ہنیدوا کے پانیوں کی نزدیکی ہے.. شاید پیرس ہے.. فلورنس

ہے..شاہ گوری کا دامن ہے یا نانگا پربت کے سائے ہیں وادی رُوپل ہے..جھیل کرومبر ہے یا جھیل سراں ہے..یہ آپ کا بیڈروم نہیں ہے قطعی طور پر جس میں آپ جاگے ہیں..تو بالکل غنودگی اور حیرت کا وہی تسلسل ہے آوارگی کی وہی زنجیر ہے..وہی کڑیاں ہیں اور اُن میں آخری کڑی غارحرا کی ہے..اگر اپنے بیڈروم میں نہیں تو کہاں ہوں..غارحرا میں ہوں..لیکن ایسا کیسے ہوسکتا ہے..

اور ایسا ہے جب یہ کھلتا اور عیاں ہوتا ہے تو ایک عجیب سی سرخوشی مخمور کیے دیتی ہے..کیسا ایک دیوانے کا خواب ہے..یہ انبساط اور بے اختیار مسکراہٹوں کا سامان لیے ایک خواب ہے جو حقیقت ہے کہ میں غارحرا میں ہوں..

تو میں نے اُس شب اگر جان بوجھ کر نیند کو مدعو کیا..بار بار کیا تو اس میں بدنی تھکاوٹ اور پژمردگی کا چنداں دخل نہ تھا..کوشش کر کے ایک اونگھ میں چلے جانے کی تگ و دو کی تو صرف اس لیے کہ جب میں بیدار ہوں تو میرے نیم خوابیدہ حواس اپنے تئیں اپنے بیڈروم میں جاگیں اور پل دو پل کے بعد اُنہیں احساس ہو کہ نہیں..ہم تو غارحرا میں جاگتے ہیں..

میں نے اس کیفیت سے خمار حاصل کرنے کے لیے متعدد بار نیند کو مدعو کیا..اگرچہ وہ مکر نیند تھی پر میں نے اُس کے مکر سے غفلت برتی جان بوجھ کر..اور ایسا متعدد بار ہوا..

میں چاندنی کے جزیروں سے غافل نہ ہوا تھا..بلکہ وہ مجھے غافل نہ ہونے دیتے تھے..وہ چاند کے ڈھلنے سے میرے بدن پر ڈھلتے گئے..اُسے ترک کر کے غار کے پتھروں پر جا متمکن ہوئے..

مجھے اُن کی بے وفائی پر از حد قلق ہوا..

پر اُن کا دوش نہ تھا..وہ چاند کی مسافت کے تابع تھے..

چاند کے ڈھلنے سے وہ بھی ڈھلتے جاتے تھے اور غار کی بائیں دیوار کی چٹانوں پر چلے گئے تھے..وہاں جا روشن ہوئے تھے..مجھے اور میرے بدن کو ترک کر گئے تھے..ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے تھے..

رات زوال میں اُترتی تھی..

گھٹتی جاتی تھی..

صحن میں بھی چاندنی کم ہوتی جاتی تھی اور سائے بڑھتے جاتے تھے..میں اپنے تئیں تھیلے میں ذہن کو سکون دینے والی کچھ گولیاں لے کر آیا تھا کہ اگر رات میں وحشت ہوئی..بہت ڈر بہت خوف آیا تو میں اُن میں سے ایک پھانک کر شانت ہو جانے کا چارہ کروں گا..لیکن اُن کے

استعمال کی نوبت نہ آئی کہ نہ میں ڈرا اور نہ بے چین اور مضطرب ہوا کہ شانتی اور امن میرے دوست بن گئے تھے..

میں غار میں اٹھنے بیٹھنے اور لیٹنے کے تمام تر زاویے اختیار کر چکا تھا.

ذرا دیکھتے ہیں کہ کتنے مختلف انداز میں مصلّی سے اٹھا جا سکتا ہے..

ذرا حساب کرتے ہیں کہ بیٹھے رہنے کے مختلف رُخ کتنے ہو سکتے ہیں.

ذرا اِدھر اُدھر سرک کر لیٹے رہنے کے مختلف رُوپ دیکھتے ہیں.

انہی میں سے کوئی ایک انداز..رُخ اور رُوپ بابا نے یقیناً اختیار کیا ہو گا..

آس پاس دائیں بائیں اور اُوپر چھت پر..جو بھی پتھر تھے جو چٹانیں تھیں اُن کی بناوٹ میں کوئی ایک ذرہ بھی ایسا نہ تھا جس پر میں اس آس میں ہاتھ پھیر چکا تھا..اُسے محسوس نہ کر چکا تھا کہ بابا نے ان پر کہیں نہ کہیں ہاتھ رکھے ہوں گے..

اور جب میں اپنے تئیں ہر پتھر کے ہر مسام کو اپنے ہاتھوں میں حفظ کر چکا تھا تو ایک اور خیال آیا..کہ بابا جب تھک جاتے ہوں گے تو لیٹتے ہوں گے اور جب لیٹنے کو نہیں محض بدن کو آرام دینے کو جی چاہتا ہو گا تو کہیں نہ کہیں ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے ہوں گے کیونکہ صحن کی جانب یا غار کے اندرون کی جانب چہرہ کر کے مسلسل بیٹھے رہنے سے ریڑھ کی ہڈی کے آس پاس تھکاوٹ ہو جاتی ہے تو اپنی کمر کو آرام دینے کے لیے کسی نہ کسی جگہ اُسے پتھر سے ٹیک لگا کر سیدھی کر کے ضرور بیٹھتے ہوں گے.

لیکن کہاں؟

ظاہر ہے دائیں جانب کی دیوار شانے کے قریب تھی اسی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھتے ہوں گے ایسے کہ ایک رُخسار صحن کی جانب اور دوسرا رُخسار غار کے اندرون کے رُخ اور چہرۂ مبارک سامنے غار کی دوسری دیوار کی طرف..

تو میں نے وہی حالت اختیار کی اپنی کمر کو پتھروں کے ساتھ جوڑا..ٹیک لگائی..اور کچھ آرام کیا اور پھر ذرا سرک کر آگے ہوا اور پھر ٹیک لگائی تاکہ کوئی مقام جو ممکن ہے باقی نہ رہ جائے..اس عمل نے مجھے بہت خوشی دی کہ یہ امکان پہلے میرے ذہن میں نہ آیا تھا.

مجھے یاد نہیں وہ کون سا لمحہ تھا.

رات کتنی بیت چکی تھی.

جب میں نوافل کی مسلسل ادائیگی سے تھک گیا..تسبیح پھیرتا ہو گیا..

میری ریڑھ کی ہڈی دُکھنے لگی اور میں اُسے آرام دینے کی خاطر پہلو بدل کر دائیں جانب کی

چٹانی دیوار کے ساتھ شانے لگا کر.. کمر جوڑ کر بے دھیانی میں ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور تب ایک اور نایاب تجربے کی سنسناہٹ میرے بدن میں پھیل گئی.. مجھے واہمہ سا ہوا کہ میرے شانے اور میری پُشت نیچے کولہوں تک اُس چٹان میں ثبت ہو گئے ہیں..

جیسے حسن ابدال میں گورونانک کا پنجہ ایک پتھر میں نقش ہے اور اگر کوئی یاتری اس پر اپنی پھیلی ہوئی انگلیاں رکھتا ہے تو وہ اُس میں ثبت ہو جاتی ہیں.. جیسے ریت میں پاؤں کے نشان دھنسے ہوں تو ان پر پاؤں رکھنے سے وہ ثبت ہو جاتے ہیں..

تو ایسے ہی جونہی میں نے پتھریلی دیوار سے ٹیک لگائی تو مجھے محسوس ہوا کہ اُس کی ہمواری میں یہاں کچھ فرق ہے.. میرے شانے اور پُشت اس طور اُس میں فٹ ہو گئے ہیں جیسے پہلے سے ہی وہاں کسی پُشت کا نشان ثبت تھا اور میں اُس میں عین موزوں ہو گیا ہوں..

پتھر کی ہمواری میں ذرا سا دباؤ آنے سے وہاں ٹیک لگانے کے لیے ایک جگہ تھی..

ایک نامعلوم سا سانچہ تھا جس میں میری کمر اور شانے ڈھل گئے تھے..

میں نے فوراً اس واہمے سے باہر آنے کی کوشش کی کہ نہیں یہ تو میرے اُلجھے ہوئے ذہن کی تخلیق ہے جو ممکنات کی کھوج میں ہر سنگریزے اور ہر پتھر میں کچھ نہ کچھ دریافت کرنا چاہتا ہے اور بے وجہ کر لیتا ہے..

کوئی بھی پتھر محض کسی کے ٹیک لگانے سے کمر سے لے کر شانوں تک کے جسم کو آرام دینے کی خاطر ٹیک لگانے سے موم کا تو نہیں ہو جاتا کہ اُس میں گنجائش ثبت ہو جائے.. جیسے ریت پر ہتھیلی رکھنے سے ریت دب جاتی ہے اور اُس کا نقش بن جاتا ہے..

یہ واہمہ ہے..

ایسا ہونا ممکن نہیں ہے..

اسی گتھی کو سلجھانے کی خاطر میں نے ایک اور طریقۂ کار آزمایا.. ایک تجربہ کیا.. میں وہاں سے اُٹھا اور غار کے دہانے سے جہاں سے یہ پتھریلی دیوار شروع ہوتی تھی وہاں جا کر اُس کے ساتھ ٹیک لگا کر کچھ دیر بیٹھا رہا.. یہاں صحن کی کچھ چاندنی میرے دائیں شانے پر اثر کرتی تھی.. مجھے یہاں کچھ بے آرامی اور پتھر کی سختی نسبتاً زیادہ محسوس ہوئی.. پھر اپنی پشت اور شانوں کو دیوار کے پتھریلے لمس سے الگ کیے بغیر ذرا کھسکا کر غار کے اندرون کی جانب کھسکا.. کچھ دیر ویسے ہی ٹیک لگائے بیٹھا رہا.. پھر قدرے سرک کر اور اُسی حالت میں دیوار سے اپنے آپ کو جدا کیے بغیر اُس کی سختی کو محسوس کرتا ذرا اور آگے کو [illegible] تو [illegible] دیوار کا ایک ایسا حصہ آیا جس میں میرے شانے اور

پُشت ثبت ہو گئے.. یہ وہی حصہ تھا جہاں ٹیک لگا کر میں بیٹھا تھا اور ایک واہمہ میرے سر میں سرسرایا تھا..

اور یہ واہمہ نہ تھا حقیقت تھی.. عین میرے کندھوں کی چوڑائی کے مطابق' کولہوں تک کے بدن کی مناسبت سے وہاں ایک نامعلوم سا دباؤ تھا پتھر میں جس میں میں فٹ ہو گیا تھا.. ایک نامعلوم سانچہ تھا جس میں میرے کندھے اور کمر ڈھل گئے تھے.. میں نے متعدد بار اپنے آپ کو اس حالت سے ذرا سا دائیں یا بائیں کیا تو پتھر کی سختی میری کمر کے ساتھ آ لگتی لیکن میرے کندھے اُس کے ساتھ نہ لگتے اور جونہی میں کھسک کر پہلے والی حالت میں آتا تو اُس سانچے میں فٹ ہو جاتا اور ایک اطمینان سے ٹیک لگائے آرام کرنے لگتا..

اس دریافت کا کسی اور کو تو کیا مجھے بھی یقین نہیں آ رہا تھا..

میں نے اس کی مزید پرکھ کی خاطر ایک اور طریقہ آزمایا..

میں وہاں سے اُٹھ کر مصلے پر اپنی نارمل پوزیشن میں آ بیٹھا.. ایسے کہ میرا چہرہ اُس دیوار کی جانب تھا.. پھر میں نے اپنی ہتھیلی پھیلا کر اس میں چھو کر خبر کر دینے والی حس کو مجتمع کر کے دیوار پر ایک نابینا کی مانند ہولے ہولے ہاتھ پھیرا.. اور کسی حد تک میں نابینا تھا بھی کہ غار کی تاریکی میں چاندنی کے چند بجھتے ہوئے جزیروں کے سوا ہر سُو تاریکی تھی اور کچھ بھی واضح دکھائی نہ دیتا تھا.. لیکن یوں سرسری طور پر ہاتھ پھیرنے سے قطعی طور پر یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ دیوار کی پتھریلی سطح کہیں سے بھی ناہموار ہے یا دبی ہوئی ہے یا اُس کے وجود میں کوئی نامعلوم سا بھی فرق ہے.. میں نے ہمت نہ ہاری اور بار بار اپنی ہتھیلی چٹان پر جما کر اُسے دھیرے دھیرے محسوس کرتے پھیرتا رہا.. اور پھر ایک بار ایسے محسوس ہوا کہ نابینا کی انگلیاں جیسے بریل کے کسی حرف پر ہیں.. اس فرق کے ساتھ کہ بریل اُبھرا ہوا ہوتا ہے اور یہ حرف دبا ہوا کھدا ہوا محسوس ہو رہا تھا.. ہاں یکدم تھوڑا سا فرق میرے پوروں نے محسوس کیا.. شاید مُو برابر.. شاید ریت کے ذرے کے برابر.. میں نے پھر اپنا ہاتھ پیچھے کیا اور سانس روک کر اُسے چٹان پر بہت آہستگی سے آگے سرکایا.. ہاں فرق تو تھا.. یکدم اُس کی سختی نرمی میں بدل جاتی تھی اور وہ دبی ہوئی محسوس ہوتی تھی..

یہ فرق کیسے آ گیا..

دیوار کی چٹان میں ایک نامعلوم.. کندھوں سے کولہوں تک کا دباؤ کیسے وجود میں آ گیا..

اس کی ایک توجیہہ ہو سکتی تھی..

یہ نہیں کہ حرا کی غار کے اوّل مکین میرے بابا تھے.. صرف اُنہوں نے ہی اس مقام کو دریافت کیا تا کہ اُن کے ذہن میں جو سوال تھے کائنات اور نظام قدرت اور اس کو متحرک رکھنے والی قوت کے

بارے میں اُن کے جوابوں کی جستجو کی جا سکے..

نہیں..وہ اوّل مکین نہیں تھے غار حرا کے..قدیم زمانوں سے جو ذہن الگ سوچ رکھتے تھے..
جاننا چاہتے تھے کہ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے.. ماجرا کیا ہے.. خانہ کعبہ کے اندر رکھے ہوئے سینکڑوں
خود ساختہ خداؤں کی خدائی سے مطمئن نہ تھے..جو کھوج رکھتے تھے..متلاشی تھے..ناآسودہ تھے معاشرے
کے چلن سے تو وہ اپنے آپ کو ان خداؤں اور چلن سے الگ کر کے اپنے سوالوں کے جواب جاننے کے
لیے اسی تنہائی میں آیا کرتے تھے..جو "حنیف" کہلائے رسولؐ اللہ کی پیدائش سے پیشتر..ہزاروں برسوں
سے یہی دستور تھا..جو بھی ناخوش اور نامطمئن تھا وہ اسی غار کا رخ کرتا تھا..

چنانچہ یہی توجیہہ ممکن تھی..

یہی سبب ہو سکتا تھا..

جیسے شمال میں کوہ نوردی کے دوران دُور افتادہ وادیوں کے گرد جو چٹانوں کے حصار تھے وہاں
میں نے مشاہدہ کیا تھا کہ ٹھوس لوہے سے بھی سخت چٹانوں پر سینکڑوں برسوں سے اُن کے سینے پر روزانہ
جو قدم پڑتے تھے..اُن کے تسلسل نے اُن چٹانوں میں واضح راستے ثبت کر دیے تھے..

یہاں بھی ہو بہو ایسی ہی شکل ثبت ہوئی تھی..

جانے کتنے ہزاروں برسوں سے اس غار میں آنے والے اَن گنت متلاشی جب گیان دھیان
میں گم بھی تھکاوٹ کا احساس کرتے ہوں گے تو ذرا سا پہلو بدل کر نزدیک ترین اسی مقام سے ٹیک لگا کر
اپنی کمر کو آرام دیتے ہوں گے..جیسے پتھر پر پانی کے قطرے مسلسل گرتے رہیں تو اُس میں بھی ایک گھاؤ
جنم لے لیتا ہے..تو کچھ ایسے ہی کمر ٹیک کر آرام کرنے والوں کے ہزاروں برس کے تسلسل سے اس
چٹان میں ایک دباؤ وجود میں آ گیا تھا..

ایک انسان چاہے وہ کتنا ہی غرق اور مگن ہو تلاش میں بے خود ہو.. غار کے درمیان میں
پہروں بے آسرا نہیں بیٹھ سکتا..اُسے سہارے کی حاجت ہوتی ہے..اور اسی حصے میں سہارے کی آسرے
کی جگہ تھی..

اُن کی جستجو کی گرمی نے...بدنوں کی حدت نے اس دیوار کو تھوڑا سا پگھلا کر ٹیک لگانے کے
لیے یہ جگہ بنائی تھی..

لیکن یہ عمل ہزاروں برسوں کے تسلسل کے ساتھ جاری رہا تب جا کر یہ دیوار میں ایک دبا ہوا
نقش ہوا جسے رات کے اندھیرے میں تو کیا دن کی روشنی میں بھی بے شک وہ ایک دیدہ بینا ہو تب بھی
نہیں دیکھ سکتی تھی، اسے محسوس کیا تو دور کی بات ہے..

کیا یہ نقش..پتھر میں ثبت شدہ..یہ نشان تاریخ کے کسی تذکرے میں آج تک آیا ہے..یہ میں
نہیں جانتا..کیا یہ..چودہ سو برسوں میں..پہلی بار..یہ میری دریافت ہے..میرا ایمان ہے..میں یہ بھی نہیں
جانتا کہ جاننے نہ جاننے سے یہاں کیا فرق پڑتا ہے..

شاید اس دریافت کا سبب محض یہ ہو کہ یہاں آج تک جتنے بھی آئے.. کامل یقین والے اور
راہ راست پر چلنے والے آئے اور اگر ایک ڈھل مل یقین والا اور بھٹک جانے والا شخص آیا تو تقدس میں
غرق ہو جانے کی بجائے..گناہ اور ثواب سے یہ کمبخت بیگانہ..انہی بکھیڑوں میں اُلجھا رہا کہ بابا کہاں
ہاتھ رکھتے تھے اور کہاں ٹیک لگا کر آرام کرتے تھے..

ویسے میری شدید یہ تمنا ہے کہ اگر کوئی اب تک ایسا آیا نہیں تو اب کوئی نہ کوئی.. کبھی نہ کبھی کوئی
آئے..بہتر یہی ہے کہ رات میں آئے..اور میری طرح ہر شے سے بیگانہ ہو کر بیکار جستجو کرتا رہے..
چٹانوں اور پتھروں پر نابیناؤں کی مانند ہاتھ پھیرتا رہے..کوئی ایسا آئے جو میرے بیان کی تصدیق
کرے..

اگرچہ مجھے ایسی تصدیق کی چنداں حاجت نہیں ہے..

کہ میں بابا کے گھر کے اندر..ایک چٹان میں ثبت نامعلوم نقش کو تخلیق کرنے سے تو رہا..محض
ایک سنسنی وجود میں لانے کے لیے تو ایسا کرنے سے رہا..

میرے اس بیان میں کہیں بھی ممکنات سے اُلجھے ہوئے ذہن کا عمل دخل نہیں کہ یہ ایک
حلفیہ بیان ہے..

یہ تو ایک توجیہہ ہوئی..

دُوسری توجیہہ جو میرے دل کو لگتی ہے بے شک بے سبب لگتی ہے یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ میرے
بابا نے اپنے جثے کو آرام دینے کی خاطر یہاں ٹیک لگائی تو پتھر موم ہو گئے..

جب میں مطمئن ہو گیا کہ ہاں بے شک چٹان میں ایک نقش دبا ہوا ہے اور میں اپنے شانے
اس نقش کے سانچے میں ڈھالے ٹیک لگائے بیٹھا تھا تو لامحالہ وہی خیال آیا...جو دل کے دھڑکنے کا
باعث بنتا تھا وہی سوال آیا جس نے یہاں اس مقام پر آنا تھا..کہ جہاں میرے شانے ہیں یہیں بابا
کے روشن شانے بھی آرام کیا کرتے تھے..

جہاں جہاں میرا بھدا وجود چٹان کے ساتھ لگا ہوا ہے تو یہیں وہ متناسب 'کسا ہوا مہکتا بدن
بھی چھوتا تھا..

یوں تو غار حرا کا کون سا پور ہے کون سا مسام ہے ایسا جس پر بابا کے ہاتھ نہ ثبت ہوئے ہوں'

اُن کے بدن کی قربت میں نہ رہا ہو لیکن یہ گوشہ چٹان میں ثبت شدہ نا معلوم سا دباؤ ایسا تھا جس کے حصے میں اُن کا لمس جُڑا ہوا تھا..

ایسے کہ اگر میں دیدۂ بینا رکھتا احساس کی معراج کا اہل ہوتا تو جہاں میرے شانے لگے تھے وہاں اُن کے شانوں کے درمیان جو مہر تھی جسے دیکھ کر سلمان فارسیؓ ایمان لائے تھے میں اُس مہر کو بھی اپنے شانوں پر محسوس کر لیتا..

میں اپنے شانوں میں اُن کے شانوں کی حدت محسوس کرتا ہاتھ سینے پر باندھے اس گھپ اندھیرے میں بیٹھا.. کچھ نہیں بہت سا دیوانہ ہو گیا اور مسکرانے لگا.. میرے اندر ایک تفاخر کا جذبہ جاگا کہ یہ میں ہوں جس نے یہ مقام دریافت کر لیا ہے.. میں ہوں.. لیکن یہ دیوانگی فوراً ہی پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ گئی.. میرے ہاتھ تو سینے پر بندھے ہوئے تھے تو میں نے ربّ کعبہ سے معذرت کی.. اگرچہ اس کا گھر میرے بائیں رُخسار کی جانب غار کے آخری شگاف کی جانب تھا اور میرا رُخ سامنے کی دیوار کی جانب تھا لیکن میں نے شرمندگی کا اقرار کیا اور دریافت کے اس تکبر اور تفاخر کے لیے تہہ دل سے معافی کا خواستگار رہا..

ویسے اس مقام پر شاید تھوڑا سا تکبر کر لینا بھی کچھ برا نہ تھا..

اس حساب کتاب میں.. ان توجیہات میں بہت دیر تک اُلجھا رہا اور شگافوں میں سے اُترتی چاندنی کے دھبّوں سے پھر ذرا غافل ہو گیا..

وہ غار کے فرش سے رُخصت ہو کر اب غار کی دیواروں پر ٹھہرے ہوئے تھے.. چاندنی کے یہ جزیرے میری عارضی غفلت کے دوران اپنے مقام بدل کر.. آگے ہو چکے تھے.. جیسے جیسے رات آگے جاتی تھی ویسے ویسے وہ سرکتے جاتے تھے..

سفر میں تھے..

اور میں وہیں ٹیک لگائے سحر زدہ چاندنی کے اُن جزیروں کو تکتا رہا جو اندرون کی تاریکی میں سفر اگرچہ آہستہ آہستہ.. مگر کرتے تھے..

باہر جبلِ نور پر اب چاند ڈھلنے لگا تھا اور غارِ حرا کا صحن پہلے کی مانند چاندنی سے بھرا نہ ہوا تھا بلکہ چٹانوں کے سائے صحن میں رینگتے ہوئے تقریباً نصف حصے تک آ چکے تھے.

مجھ میں اس شب کا جو ہیجان تھا وہ مجھے ایک مقام پر ٹکنے نہ دیتا تھا.. غارِ حرا ایک کائنات تھی اور مجھ سے [illegible] جن میں مجھے اس کائنات کے ذرّے ذرّے کو

آنکھوں میں اُتارنا تھا.. اُس کا لمس محسوس کرنا تھا اُسے جاننے کی سعی کرنا تھی.. چنانچہ میں اپنے بابا کی ٹیک سے ایک لگا کر بھی بہت دیر نہ بیٹھا.. وہاں سے اُٹھا اور جھک کر صحن میں آ گیا..

اتنی مکمل خاموشی..

ایک سناٹا ٹھہرا ہوا.. ازل تا ابد..

سُرنگ کا دہانہ ایک مہیب خلا لگتا تھا..

غارِ حرا ابھی اتنی تاریک دکھائی دے رہی تھی کہ اُس کے وجود کا احساس بھی گم ہو رہا تھا..

نیازؔ کا خوابیدہ وجود چٹان کے سائے میں جا چکا تھا.. بالکل گم.. نا موجود ہو چکا تھا..

بابا جب غار سے باہر آتے تو نیچے پھیلے ویرانے کو.. اُن پر جو آسمان تھا اُس میں حرکت کرتے ستاروں کو.. اور چاند کی بارھویں کو اسی چاند کو اسی مقام پر ٹھہرا ہوا دیکھتے تھے اور غور کرتے تھے.. یہ کیا نظام ہے.. کیا یہ خود بخود چل رہا ہے یا اسے چلانے والا کوئی ہے.. وہ کیا ہے.. کون ہے.. کہاں ہے..

میں نے اپنا رُخ بدل کر غارِ حرا پر نظر ڈالی.. غور کرنے سے ہموار پتھر پر رکھے میرے جوگرز، چھوٹی ٹارچ، تسبیح اور دودھ کی بوتل نظر آ جاتی تھی.. البتہ تنّی تھیلا تاریکی میں رُوپوش تھا..

میں غار میں داخلے پر واقع تمام پتھروں کو پرکھ چکا تھا.. چھو چکا تھا.. داخلے کے دائیں جانب چند پتھر جو کھائی کی جانب تھے اور غار کے وجود کا حصہ تھے اُن کی چھان بین البتہ میں نے ابھی نہیں کی تھی.. یہ وہی پتھر تھے جن پر ترک مائیاں منڈلاتی صحن میں کود گئی تھیں.. میں اُنہیں ہاتھوں سے چھونے لگا.. ان کی بناوٹ اور گھیر کا اندازہ لگانے لگا.. زاویے بدلتا دراڑوں میں جھانکتا ان کی ساخت اور موجودگی کا قیاس کرنے لگا.. اور تب ان پتھروں کے اندر مجھے ایک شگاف نظر آیا جو اس سے پیشتر مجھے دکھائی نہ دیا تھا.. اس لیے بھی کہ میں نے اس زاویے سے پتھروں کے ساتھ لگ کر اس کی کھوج نہ کی تھی.. یہ اُن شگافوں میں سے نہ تھا جن کے راستے چاندنی غار میں اُترتی تھی.. یہ غار سے باہر کھائی کی جانب جو پتھر ایک دوسرے کے سہارے آرام کرتے تھے اُن میں تھا.. اور صرف تب ظاہر ہوتا تھا جب آپ اپنے رُخسار کو اس پتھر سے جوڑ کر.. اپنے بدن کو ذرا دوہرا کر کے اپنے آپ کو تھوڑی سی اذیت میں مبتلا کر کے اُدھر جھانکتے تھے..

محض ایک شگاف نہ تھا ایک در تھا جو خانہ کعبہ پر کھلتا تھا..

پتھروں کا ایک چوکھٹا تھا جس میں خانہ کعبہ کی مکمل تصویر جڑی ہوئی تھی..

چاند کی چال سے میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس سے شاید دو بجے ہوں گے جب میں نے اس شگاف میں اپنی کاملیت میں روشن خانہ کعبہ کو ظہور میں دیکھا..

میں اپنے رُخسار کو ذرا آرام دیتا تھا.. بدن کو ڈھیلا چھوڑتا تھا تو وہ شگاف خانہ کعبہ کی تصویر سمیت پتھروں میں اوجھل ہو جاتا تھا.. اور میں پھر تڑ و کر کے چٹان کے ساتھ جڑ جاتا تھا..

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں جان بوجھ کر اس شگاف کو عیاں نہیں کیا گیا تھا کہ جس کو طلب ہو، جستجو ہو وہی اسے تلاش کرے اور ربّ کے سوہنے گھر کی تصویر پتھروں کی نیم تاریکی میں جڑی دیکھ لے.. روشن اور تابندہ.. غار کے آخری شگاف میں سے تو بہت مشقت سے مینار کا صرف ایک حصہ دکھائی دے جاتا تھا لیکن یہاں صحن میں سے.. باہر کھلی فضا میں.. اس روزن میں سے خانہ کعبہ کی روشن شکلیں چلی آتی تھیں..

اس حیرت بھرے پوشیدہ منظر میں کسی اور کو کیسے شامل کیا جائے.. اس کے لیے ایک رات چاہیے.. اور وہ بھی جبل نور پر.. غارِ حرا کے صحن میں اُترتی اور دھیرے دھیرے سمٹتی مدھم ہوتی کچھ چاندنی چاہیے.. ایک بڑی تنہائی اور اُس سے بھی بڑا ذہنی خلل چاہیے.. تب جا کر یہ در کھلتا ہے.. ایک دروازہ وا ہوتا ہے جو سنگِ صفت ہے.. اور پھر اُس میں سے خانہ کعبہ نظر آتا ہے..

یہ نظر کا دھوکا بھی لگتا ہے..

کیونکہ ذرا سی حرکت سے گم بھی ہو جاتا ہے..

کوئی آپ کو اس پوزیشن میں.. چٹان سے رُخسار جوڑے.. بدن کو دوہرا کیے مبہوت دیکھے تو یہی سمجھے کہ یہ کوئی دیوانہ ہے جو پتھروں کے ساتھ پتھر ہو جانا چاہتا ہے یا شاید کان لگائے اُن سے باتیں کرتا ہے اور اُن کی سرگوشیاں سنتا ہے..

مجھ سے پہلے بہت سے لوگوں نے اس زاویے کو دریافت یقیناً کیا ہوگا.. نیاز بھی شاید آگاہ ہو.. لیکن ایسی شدید تنہائی میں شاید ہی کسی نے یہ تصویر دیکھی ہو.. میں نے شاید پہلی بار ایک کیمرے کی کمی محسوس کی.. کہ کیسی مدھ بھری مست کر دینے والی تصویر وجود میں آتی..

لیکن کیمرہ ہوتا تو میں اُس کی آنکھ سے ہی اس تصویر کو دیکھتا رہتا اور میری اپنی آنکھ محروم رہتی..

میں نے اس منظر کو.. تاریک پتھروں کے شگاف میں سے روشن ہونے والے ربّ کے گھر کو.. اس کے بے مثال منوّر نقش کو اپنے اندر نقش کیا اور کچھ دیر بعد پھر اپنے گھر کو لوٹ گیا..

واپس اپنے مصلّے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور سوچا کہ کھوج اور جستجو اپنی جگہ لیکن انہیں بھی سلام کر لیا جائے [illegible] بے پایاں ہیں.. انعامتیں اور عنایتیں ہیں جنہوں نے

مجھے یہاں بلا لیا.. اپنے گھر میں شب بھر ٹھہرا لیا.. میں ایک شک کا مارا.. عمر کا مارا.. موٹا سا بھدا سا آ ہو تھا جو ہانپتا تھا.. اُسے کوئی بھی شکاری آسانی سے شکار کر سکتا تھا کہ وہ قلانچیں بھرنے کے قابل نہ رہا تھا.. تو جنہوں نے بچا لیا.. بلا لیا.. اپنے نخلستان میں بلا لیا اور اپنی اوک میں سے پانی پلا کر مجھے ہرا بھرا کر دیا.. تو ایسے بے مثال بابا کو سلام کیے جائیں..... بے شک اربوں لوگ انہیں روزانہ سلام کرتے تھے لیکن غارِ حرا میں بیٹھے ہوئے شب کے اس پہر تو بہت کم نے سلام کیے ہوں گے..

میں درود بھیجتا رہا..

کبھی صرف اُن کے نام کا ورد کرتا رہا..

کبھی اقرار کرتا رہا..

اور کبھی گواہی دیتا رہا..

بے شک ساقیا تجھے نیند نہیں آئے گی..

اور بے شک تیری محفل میں رت جگا ہے..

لیکن میرا عمر رسیدہ بدن اتنی برانگیختگی اور ڈھلاوٹ کی تاب نہ لا سکتا تھا.. تھک چکا تھا.. انہیں سلام کرتے.. اُن پر درود بھیجتے نہیں تھکتا تھا کہ یہ تو خون میں گردش کرتے چلے جاتے تھے..

میں اپنے کھولت زدہ بدن کو آرام دینے کی خاطر لیٹنے کو تھا کہ شکم نے پھر بھوک کی دوہائی دی.. روحانی خوشی اور الوہی ہیجان میں بھی پیٹ پکارتا ہے کہ اب مجھے دو روٹیاں دو..

میرے پاس روٹیاں تو نہ تھیں.. چند کھجوریں اور دودھ تھا.. اور مجھے خدشہ تھا کہ دودھ اتنا نہیں تھا جتنا میں پی چکا ہوں.. لیکن بوتل کے اندھے پلاسٹک میں وہ اب بھی چھلکتا تھا..

نیند تو خیر کہاں آتی تھی..

بہت پچکارنے اور منت سماجت کرنے پر وہ کچھ مائل ہوئی پر مجھے مدہوش کرنے میں ناکام رہی..

میں آدھا سوتا آدھا جاگتا تھا..

میری ظاہری آنکھ بند تھی لیکن اندر کی آنکھ پلک بھی نہ جھپکتی تھی کھلی تھی..

میں ایک عارضی غفلت میں اُتر گیا..

جانے رات کا کون سا پہر تھا..

جانے میں کہاں تھا..

اور سوال یہ ہے کہ کیوں تھا..

جب میں نے اُس غفلت میں سے پل دو پل کے لیے باہر آتے ہوئے آنکھ کھولی.. آنکھ کھولی.. تو میری آنکھوں کے سامنے دو آنکھیں تھیں..

مجھے گھورتی ہوئی..

جیسے دو الاؤ جل رہے ہوں ایسے جلتی ہوئی.. دمکتے ہیروں کی مانند تاریکی کے زیور میں جڑی ہوئی..

وہاں جہاں گھپ اندھیرا تھا وہاں.. مجھے دیکھتی ہوئی.. زندہ اور سیال آگ کی مانند بھڑکتی ہوئی..

یہ ایک بلی تھی..

لیکن یہ احساس ہونے سے لمحہ بھر پہلے جب میں نے آنکھیں کھولیں اور یکدم اُن آنکھوں کو عین اپنے سامنے گھورتے دیکھا تو ظاہر ہے کچھ گھبراہٹ ہوئی.. نامعلوم کا خوف لمحہ بھر کے لیے بدن میں تیرا. اُسے تھوڑا سا بے جان کیا کہ یہ ہے کیا.. آسیب ہے رُوح ہے اور کیا میری جان کے در پے ہے.. شاید کوئی ایسی شے جو غارِ حرا کی محافظ ہے.. کیا ہے.. میں نے اپنے خوف پر قابو پایا.. نہیں اس مقام پر ایسا کچھ نہیں ہو سکتا.. کچھ ایسا نمودار نہیں ہو سکتا.. بابا کے گھر میں نہیں.. اور تب تاریکی میں اُس کی ہیئت واضح ہوئی تو یہ ایک بلی تھی..

وہ اطمینان سے سنگِ مرمر کے سلوں سے ذرا آگے پتھر پر براجمان تھی اور مجھے ٹکٹکی باندھ کر گھورے چلی جا رہی تھی..

ہو سکتا ہے وہی بلی ہو جو جبلِ نور کے تھڑے پر لیٹے ہوئے کبڑی ہوتی میری ٹانگوں سے لپٹتی تھی..

میرا خیال ہے وہی تھی یا اُس جیسی تھی..

لیکن وہ یہاں کیوں تھی؟

کیا کرنے آئی تھی..

غالباً وہ اِدھر آنے کی عادی تھی.. یہ مقام اُس کے لیے اجنبی نہ تھا. شاید وہ ہر رات.. اسی پہر یہاں آتی تھی.. ایک پوشیدہ جگہ پر رات بسر کرتی تھی اور اب آئی تھی تو اُسے حیرت ہوئی تھی کہ جہاں کبھی کوئی نہیں ہوا یہ کون ہے جو یہاں ہے.. میری شب بسری کے مقام پر یہ قبضہ جمائے بیٹھا ہے تو اس سے چھٹکارا کیسے حاصل کروں.. میں اُس کے مسلسل گھورنے سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ یہاں میری موجودگی

کو ناپسند کرتی ہے.

میں نے اپنے آپ کو اسی حالت میں رکھا.. ہلا جلا نہیں.. اُسے تکتا رہا اور مجال ہے جو اس نے مجھ سے آنکھیں ہٹائی ہوں..

میں بھی اُس کی موجودگی کو پسند نہیں کر رہا تھا.. وہ مجھے بے آرام کر رہی تھی.. لیکن میں اس کا کروں کیا.. یہ سوچا کہ یکدم اسے ٹھوکر کے بھگا دوں.. پھر فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ یہ کوئی عام سی میاؤں بلی نہیں ہے.. حرم کعبہ کی حدود میں رہنے والی بلی ہے' قابل احترام بلی ہے.. وہ بھی جانتی ہے کہ وہ حفاظت میں ہے.. اور کون جانتا ہے کہ اس کا باپ وہ ہو.. اصحاب صفہ کے تھڑے پر بیٹھنے والا بوسیدہ اور وا اس دریدہ پیراہن والا.. بھوک سہنے والا.. ایسا کہ پل بھر کے لیے بابا کی جدائی نہ سہتا تھا.. صفہ کے تھڑے پر ہمہ وقت بیٹھا اُن کو ہمہ وقت نظروں میں رکھتا تھا.. اور بابا نے جتنا کہا وہ اوروں نے کم بیان کیا اس سے زیادہ اُس نے بیان کیا.. بابا نے جو کچھ کہا اسی بے گھر بھوک سہنے والے فقیر نے یاد کیا اور بعد میں بیان کیا اور وہ ہمارے پاس پہنچا اور ہمارے عقیدے کی پختگی کا سبب بنا.. میں اس فقیر کے فقیروں کا بھی فقیر تھا اور حج کے دوران مسجد نبویؐ میں بس اسی تھڑے پر کچھ دیر بیٹھ جانے کی خواہش میں مرا جاتا تھا جہاں یہ بے آسرا.. یہ بلیوں کا باپ.. ابوہریرہؓ بیٹھا کرتا تھا..

تو میں اس کی ایک بلی کو ٹھوکر کے کیسے بھگا سکتا تھا..

اسی بلی کے آباؤ اجداد ہی تو اس صحابیٔ رسولؐ کے گرد میاؤں میاؤں کرتے پھرتے تھے.. وہ ان سے اتنی اُلفت کرتا تھا کہ بابا نے اُسے بلیوں کے باپ کا لقب دے دیا اگرچہ اس کا خاندانی نام تو کچھ اور تھا...

وہ جو نامور تھے اور بابا کی قربت میں تھے اُن کی نسبت میں بلیوں کے باپ کو شاید اپنی نا بھی میں زیادہ اپنا جانتا تھا.. میں اُن کے آگے سر تعظیم خم کرتا تھا عقیدت کے مارے اُن کی جانب دیکھتا نہ تھا لیکن اس کی جانب میں اپنائیت اور عشق میں مبتلا دیکھتا تھا.. اگر ایک اور جنم کا امکان ہوتا تو شاید میں بھی اصحاب صفہ میں سے ایک ہونے کی خواہش کرتا.. یہ ممکن نہ ہوتا تو کم از کم میاؤں میاؤں کرتی ابوہریرہؓ کی ایک بلی ہو جاتا..

فوقیت تو کسی کو نہ تھی.. بابا کے گرد جو رفیق جو چاہنے والے قربان ہونے والے تھے ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت تو نہ تھی.. اگر تھی تو اُسے ہی ہو سکتی تھی جس نے بابا کے پیکر کو.. اُن کے اٹھنے بیٹھنے اُن کی چال کو.. اُن کے وجود اور اُن کی عبادتوں کو.. اُن کی مسکراہٹوں کو اور اُن کی آپس میں جڑی ہوئی بھنوؤں کو.. کبھی صحت میں اور کبھی علالت میں.. کبھی خوشی میں اور کبھی الم میں ڈوبے ہوئے.. کبھی

زرہ بکتر سینے پر سجائے ہاتھ میں تلوار لیے... اور کبھی چادر اوڑھے حالتِ وحی میں.. حالتِ کلام میں.. دن رات دیکھا تھا.. انھیں مسلسل اپنی نظر میں رکھا تھا.. تو ایسے بھوک سے مارے ہوئے.. تار تار پوشاک والے.. کو فوقیت تو حاصل ہے..

اُسے تو کیا اُس کی بلّیوں کو بھی فوقیت حاصل ہے.. ہم سب پر.. کہ انھیں بابا بھی پسند کرتے تھے اُن کی پشت سہلاتے اُن سے پیار کرتے تھے.. اگر ایک بار اُن کے کمبل پر ایک بلّی سوئی ہوئی تھی تو اُنہوں نے اُسے جگایا نہیں تھا' پاس بیٹھے انتظار کرتے رہے تھے کہ یہ اپنی نیند پوری کر لے تو میں اپنا کمبل اوڑھوں.. اُسے شُو شُو کر کے بھگایا نہیں تھا تو میں کیسے اِس بلّی کو جو بابا کے گھر میں بیٹھی تھی شُو شُو کر کے بھگا سکتا تھا..

میں نے اجتناب کیا..

اُسے بیٹھا رہنے دیا..

بے شک یہ وادیٔ مکّہ تھی اور ابوہریرہؓ کی بلّیاں مدینے میں تھیں.. لیکن جانوروں کی نسل کا تسلسل تو وہی رہتا ہے.. خاص علاقوں اور خطوں میں اُن کی نسل ایک ہی ہوتی ہے.. وہ کہیں باہر سے تو نہیں آتے.. بلّی پاکستان میں بھی ہو تو بھی اُسے دیکھتے ہوئے ابوہریرہؓ ہی ذہن میں آتے ہیں..

عین ممکن ہے کہ اس ایک بلّی کا ابوہریرہؓ کی بلّیوں سے دُور کا بھی واسطہ نہ ہو.. اور عین ممکن ہے کہ یہ انھی کی نسل میں سے ایک ہو..

تو میں نے اُسے شُو شُو نہ کیا..

اُسے بیٹھے رہنے دیا..

بہر طور یہ ایک بلّی وادیٔ مکّہ کی باسی تو تھی.. حرم کی حدود میں تھی.. اس پر ہاتھ اُٹھانے اسے گزند پہنچانے کی مناہی تھی.. حج کے دوران اسے نقصان پہنچایئے تو آپ کا حج خطرے میں پڑ جاتا ہے.. یہ ایسی برگزیدہ بلّی تھی.. ویسے بھی آثار یہی تھے کہ یہ جبلِ نُور کی گھاٹیوں میں اور پتھروں میں اور شاید اسی غار میں پلی بڑھی ہوگی تو اس کا حق بنتا تھا.. میں تو ایک شب کا مہمان تھا.. مجھے تو چلا جانا تھا.. میرے جانے کے بعد بھی اس نے یہاں آتے جاتے رہنا تھا.. تو اِس کا حق بنتا تھا اس مقام پر..

میں تو آیا تھا چلا جاؤں گا.. پھر کہاں آؤں گا..

اس نے تو اس نصیب والی نے آتے جاتے رہنا تھا..

مجھے تب تو احساس نہ ہوا بعد میں خیال آیا کہ بے شک محترم ہے لیکن ہے تو بلّی.. اور اس نے میرے تھیلے میں سنبھالی ہوئی دودھ کی بوتل کی خوشبو سونگھ لی ہے اور اس لیے تکتے تکتی رہی ہے کہ یہ شخص

مجھ سے نظر ہٹائے تو میں دودھ سے اپنی مونچھیں گیلی کر لوں.. تب احساس نہ ہوا..

وہ مجھے بہت دیر تک ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے بعد آرام سے لیٹ گئی.. لیکن ایسے رُخ پر کہ وہ مجھے نظر میں رکھ سکے.. اُس نے آنکھیں کھلی رکھیں جو غار میں جلتی رہیں.. میں بھی اُسی طور حرکت کیے بنا لیٹا رہا اُس پر نگاہ رکھے لیٹا رہا مبادا یہ مجھے دشمن جان کر حملہ آور نہ ہو جائے' مجھے پہچان نہ سکے کہ میں اُس کے باپ کی بھوک اور غربت کا غلام ہوں.. اس کے فقیروں کا فقیر ہوں..

وہ حملہ آور ہو سکتی تھی کہ میں نے اُس کی آرام گاہ میں موجود ہونے کی جسارت کی تھی..

تھوڑی دیر بعد ہم ایک دوسرے کی موجودگی کے عادی ہو گئے.. ہم دونوں نے سمجھوتہ کر لیا کہ ہم نے یہیں رہنا ہے.. لیکن اعتماد نہ کیا اور ایک دوسرے کو گھورتے رہے..

یہ بلّی بنا ڈرے اور بنا آنکھیں جھپکے تقریباً تیس منٹ تک غارِ حرا کے ایک پتھر پر آرام کرتی رہی اور پھر جانے اُس کے جی میں کیا آئی.. اُٹھی اور باہر نکل گئی..

اُس کے رُخصت ہو جانے پر مجھے کچھ قلق ہوا کہ اس نے میری تنہائی میں شرکت کی تھی.. رفاقت کی تھی.. اور وہ واحد رفیق تھی' اُس شب تنہائی میں.. اُس کے بچھڑ جانے کا مجھے افسوس ہوا..

ویسے جس انداز میں وہ گئی تھی ناراض نہیں گئی تھی... جان گئی تھی کہ یہ تو پل دو پل کا مہمان ہے' آیا ہے تو چلا جائے گا.. میں پھر آ جاؤں گی.. اور مجھے دیکھ کر خواہش کرتا ہے کہ اگلے جنم میں میں اُس کے باپ کے گرد میاؤں میاؤں کر رہا ہوتا تو کچھ ایسا بُرا شخص نہیں ہے.. قدرے حواس باختہ ہے کہ بلّی ہو جانا چاہتا ہے..

اُس کی رُخصتی پر میں کچھ دیر حالتِ ملال میں رہا.. پھر اُٹھا.. صحن میں جا کر دیوار سے نیچے گھاٹی میں جھانکا.. کہ آمد و رفت شروع ہو گئی ہے.. کہیں وہ مکّہ کے مارموٹ اور بندر وغیرہ بھی اِدھر آنے کا قصد نہ کر لیں..

ہر شُو چُپ تھی..

کوئی سرسراہٹ.. آہٹ کوئی موجودگی نہ تھی..

وقت آدھی رات کو عبور کر کے بہت آگے جا چکا تھا..

جبلِ نُور کی چوٹی کی چٹان کا سایہ صحن میں بچھ کر نصف سے زیادہ حصے پر سیاہ ہو رہا تھا.. اور نیاز پہلے کہاں دکھائی دیتا تھا جو اب اتنی تاریکی میں دکھائی دے جاتا..

کیا میں صحن میں سے کچھ کنکر چُن لوں..

اس شب کی یادگار کچھ تو ساتھ لے چلوں۔۔

جب میں اس رات میں تھا تب بے شک میں آگاہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔۔ یک بارہ اس حیات میں دوبارہ نہ ہوں گا لیکن اس کے باوجود کسی نشانی کو حاصل کرنے کی خواہش نہ ہوئی کہ تب تو وہ سب کچھ میرا تھا۔۔ کوئی بھی اپنے گھر کی کوئی شے تو نہیں اُٹھاتا کہ یادگار رہے۔۔ لیکن اب تقریباً ایک برس بعد مجھے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ میں ایک دو کنکر ہی چُن لیتا۔۔ غارِ حرا میں تھا تو کسی بھی پتھر پر ضرب لگا کر اُس کا ایک حصہ اپنے ہمراہ لے آتا۔۔ مجھے اب تھوڑا سا قلق ہوتا ہے کہ اس شب کی کوئی بھی نشانی میرے پاس نہیں۔۔۔ ہاں ایک نشانی تو ہے جس کا تذکرہ بعد میں کروں گا۔۔

اُس نشانی کے سوا اور بھی بہت کچھ ہے۔۔

وہ کچھ جو میں اپنے ساتھ لے گیا تھا جو کچھ بھی نہ تھا۔۔۔ غارِ حرا میں ایک شب رہا تو میرے لیے معتبر ہو گیا۔۔

وہ مصلّے جو میری بہو نے مجھے دیا تھا جسے میں نے غارِ حرا میں بچھے پرانے مصلّے پر بچھایا تھا۔۔

وہ تسبیح جس کے دانے میں نے اُس رات متعدد بار اپنی پوروں سے چھو کر گرائے۔۔

اور سب سے بیش قیمت وہ جوگرز۔۔ جن کے تسمے نہیں تھے آسانی سے جُڑ جانے والے ٹلپ تھے۔۔ بہت ہلکے اور سیاہ اور سفید رنگ کے۔۔ جو میرے پاؤں میں تھے جبلِ نور پر چڑھتے ہوئے۔۔ اور جو غارِ حرا کے اندر ایک ہموار پتھر پر شب بھر پڑے رہے۔۔ اور جب بھی میں غار سے نکلتا۔۔ صحن میں جاتا تو ننگے پاؤں جاتا۔۔ البتہ اُوپر چھت پر جاتا تو اُنہیں پہن کر۔۔ سوائے ان موقعوں کے وہ میرے ساتھ غارِ حرا میں میرے رفیق رہے۔۔ وطن واپسی پر میں اُنہیں کبھی کبھار صبح کی سیر کے لیے استعمال میں لاتا رہا۔۔ اور میری سیر کے ساتھی نہیں جانتے تھے کہ یہ ہلکے پھلکے چینی نژاد جوگرز کہاں سے ہو کے آئے ہیں۔۔ ابھی چندروز پیشتر میں نے محسوس کیا کہ وہ شکستہ ہو رہے ہیں۔۔ جب میں گھاس پر قدم رکھتا ہوں تو اس پر سویری کی شبنم اُن میں سرایت کر کے میری جرابوں کو گیلا کرتی ہے۔۔ اور ایک صبح سیر سے واپسی پر میں نے غور کیا کہ وہ اُدھڑنے کو ہیں۔۔ ناکارہ ہونے کو ہیں تو میں نے انہیں پہننا موقوف کیا اور ہمیشہ کے لیے انہیں سنبھال لیا کہ وہ ایک قیمتی متاع بھی تھے اور ایک متاعِ غرور بھی تھے کہ میں ایک شب غارِ حرا میں تھا۔۔

اب میں آپ کو ایک عجیب و غریب اور شاید عوام الناس کے لیے ایک پُر مزاح خواہش میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔۔ اگرچہ میرے پاس بلوق کی عطا کردہ ایک ٹشو پیپر پر جمع شدہ اُس کی [illegible] کے پیچھے جو قبر تھی وہاں کے ہیں اور میں نے سوچ رکھا

ہے کہ مجھے دفن کرتے ہوئے وہ ذرّے۔۔ ٹشو پیپر سے چمٹے ہوئے چند ذرّے میرے چہرے کے قریب رکھ دیے جائیں۔۔ لیکن پُر مزاح اور فاترالعقل خواہش یہ بھی ہے کہ یہ چینی نژاد جوگرز بھی میرے رُخساروں سے چھو رہے ہوں جب مجھ پر مٹی ڈالی جائے۔۔

میں واپس آ گیا۔۔

دو نفل ادا کیے اور پھر تپتی ہتھیلی پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

رات گزرتی جاتی تھی۔۔

اور مجھے یہ بھی قلق ہوا کہ یہ گزر جائے گی۔۔

آج۔۔ نہیں یہ تو کل کی بات ہے۔۔ کل شام کا قصہ ہے کہ مجھ میں یہ ڈر پھیلتا تھا کہ اس مقام پر ساری کی ساری ایک پوری رات جو بہت ہی طویل ہوتی ہے کیسے گزرے گی۔۔

اور اب اس ڈر میں تھا کہ یہ تو گزر رہی ہے۔۔ گزر جائے گی۔۔

گزر گئی تو پھر کیا کروں گا۔۔ مجھے تو اور کوئی کام ہی نہیں آتا سوائے غارِ حرا میں رات گزارنے کے۔۔

میں اسی آزردگی میں اُونگھ گیا۔۔

پھر جانے رات کے کس پہر آنکھ کھل گئی۔۔

''الامین'' میں درج ہے کہ۔۔

''غارِ حرا کا مطلب ہے تلاش و جستجو کا غار

اور جبلِ نور کے معنی ہیں روشنی کا پہاڑ۔

پتھر کی بڑی سِلوں سے بنے اس غار کی لمبائی بارہ فٹ کے قریب ہے۔۔ اور چوڑائی چھ فٹ ہے۔۔ اونچائی اتنی ہے کہ آدمی آسانی سے کھڑا ہو سکے۔۔ اندر صرف ایک آدمی کے نماز پڑھنے۔۔ بیٹھنے یا لیٹنے کی گنجائش ہے۔۔''

یہ ایسا ہی تھا۔۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے۔۔ اپنے قد سے۔۔ کھڑے ہو کر۔۔ بیٹھ کر لیٹ کر یہ جان لیا تھا کہ لمبائی چوڑائی اور اونچائی اتنی ہی ہے جتنی کہ بیان کی گئی ہے۔۔ میرا پورا بدن وہ پیمانہ تھا جس نے اس غار کو ناپا تھا۔۔ جستجو کی غار تھی تو میں نے جستجو کی تھی اور اس جستجو کے ذرّے میرے لباس پر ٹانکے ہوئے تھے۔۔ اور باہر۔۔ بے شک صحن نصف سے زیادہ سائے میں آ چکا تھا لیکن بقیہ ہر شے پر چاندنی معلق تھی۔۔

روشن ذرّوں کا غبار ہر شے کی ہیئت بدلتا تھا..

''رات کے وقت جب چاند کی روشنی کوہ و دمن پر پھیل جاتی تو حضورؐ غار کی تنہائی میں اور فضا کی خاموشی میں اسی شگاف میں سے اللہ کے گھر کو دیکھتے''

ہاں.. میں شہادت دیتا ہوں کہ چاند کی روشنی کوہ و دمن پر پھیلی ہوتی تھی جیسے کہ وہ میری نظروں کے سامنے اب بھی پھیلی ہوئی تھی.. البتہ زمانوں کے تغیّر نے پتھروں کی سِلوں کو ذرا سرکا دیا ہے اور اُس شگاف سے اللہ کا گھر آسانی سے نظر نہیں آتا..

''رمضان کا چاند نظر آیا تو حضورؐ غارِ حرا کی جانب چل دیئے.. اہلِ خانہ بھی آپؐ کے ہمراہ ہو گئے.. سیدہ خدیجہؓ بھی بچوں اور خدام کے ساتھ حضورؐ کے ہمراہ ہو جاتیں اور پہاڑ کے پاس کھلے میدان میں خیمہ زن ہو جاتیں اور حضورؐ جبلِ نور کی بلندی پر چڑھ کر غار میں اُتر جاتے''

اُن دنوں تو جبلِ نور کے دامن میں ویرانے اور صحرا تھے.. تو اماں خدیجہؓ شاید اس سپر سٹور کے آس پاس خیمہ زن ہوتی تھیں جہاں سے میں نے دودھ اور پانی کی بوتلیں خریدی تھیں..

''ماہِ رمضان کے دو عشرے گزر چکے تھے.. چاند اب پوری رات کا نہیں ہوتا تھا..''

اور آج چاند کی بارھویں تھی.. چودھویں کے بعد پانچ چھ روز کے بعد چاند نے پوری رات کا نہیں ہونا تھا.. تقریباً ایسا ہی ہونا تھا جیسا آج کی شب تھا.. شاید اس سے کچھ زیادہ مدھم لیکن تقریباً ایسا ہی.. جیسا آج کی رات میں ہے اور میں اس رات میں ہوں..

''چاند کچھ تاخیر سے نکلنے لگا تھا لیکن جب طلوع ہوتا تھا تو کوہ و دمن اس کی ٹھنڈی روشنی سے چمک اٹھتے.. ایسی ہی ایک ٹھنڈی اور روشن رات کے پچھلے پہر...''

بے شک میں ان ساعتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا.. انہیں محسوس کر رہا تھا.. چاند کی گزرگاہ اور روشنی تقریباً انہی زاویوں پر تھی اگرچہ ماہِ رمضان نہ تھا ماہِ شعبان تھا اور رات ٹھنڈی نہ تھی

ویسے خوشگوار ہو چلی تھی کہ فجر کی قربت میں تھی اور بے شک روشن رات تھی اور اس رات کا پچھلا پہر تھا اور میں تھا..

''روشن رات کے پچھلے پہر غارِ حرا میں اچانک ایک آدمی کہیں سے نمودار ہو گیا.. ''پڑھیے..'' اس آدمی نے حضورؐ سے کہا.. ''میں پڑھنا نہیں جانتا'' حضورؐ نے کہا''

میں خالص علمی جستجو کرنے کے لیے مناسب ذہانت نہیں رکھتا اسی لیے میں جب بھی اس ''پڑھ'' پر غور کرتا تو شش و پنج میں پڑ جاتا.. مجھے یہ سوال ستاتا کہ ربِّ کعبہ خوب جانتا تھا کہ اُس کا محمدؐ اُمّی ہے.. دنیاوی معنوں میں پڑھنا یا لکھنا نہیں جانتا تو کیوں حکم دیا گیا کہ ''اقراء''.. پڑھو..
کیا اُس شخص نے.. جو بعد میں کھلا کہ جبریل علیہ السلام تھے میرے بابا کے سامنے کوئی لوح رکھی جس پر کچھ درج تھا کہ اسے پڑھ.. یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ پڑھ نہیں سکتے تو کیوں کہا کہ.. پڑھ..
اگر لوح نہ تھی تو اُنہوں نے یہ کیوں نہ کہا کہ.. ''دوہرا.. جو میں کہتا ہوں'' اور بابا دوہرا دیتے..
لیکن جب وہ اقرار کرتے ہیں کہ میں پڑھ نہیں سکتا تو اُن کے سامنے پڑھنے والی کوئی نہ کوئی شے تو ہو گی..
البتہ ہیکل کی ''حیاتِ محمدؐ'' میں سے مجھے یہ سراغ مل گیا..

''نزولِ وحی کی مبارک ساعت آ ہی گئی.. آنحضرتؐ غارِ حرا میں محوِ خواب تھے..''

تو یہاں بھی دو روایتیں ہیں..
ایک تو یہ کہ حضرت جبریلؑ کا نزول بیداری کے اوقات میں ہوا..
اور دوسری یہ کہ آنحضرتؐ محوِ خواب تھے..

ہیکل لکھتے ہیں..
''ایک فرشتہ جس کے ہاتھ میں لکھا ہوا ایک ورق تھا اور اُس نے رویا.. خواب میں ہی یہ ورق آپؐ کے سامنے کھول کر کہا ''اقراء''.. آپؐ گھبرا گئے اور فرمایا ''ما اقراء'' (میں اس میں کیا پڑھوں) آنحضرتؐ نے محسوس کیا کہ فرشتے نے آپؐ سے زور کے ساتھ معانقہ کرتے ہوئے پھر اقراء (اسے

پڑھئے) کہا اور آپؐ نے پھر وہی جواب دیا "ما اقراء"۔ فرشتے نے دوسری مرتبہ پھر اسی زور سے معانقہ کرنے کے بعد ورق سامنے رکھ کر "اقراء" کہا.. اس مرتبہ آپؐ ڈر گئے مبادا پھر معانقہ کی تکلیف سے دوچار ہونا پڑے لیکن وہی فرمایا کہ "ماذا اقراء" (میں اس میں کیا پڑھوں..)

فرشتے نے کہا..

"اقراء باسم ربک الذی خلق٥ خلق الانسان من علق٥ اقراء و ربک الاکرم الذی علم بالقلم٥ علم الانسان مالم یعلم٥"

"پڑھئے اپنے ربّ پیدا کرنے والے کا نام لے کر جس نے انسان کو "جمے ہوئے لہو" سے پیدا کیا' ہاں پڑھئے کہ آپ کا پروردگار صاحب کرم ہے' جس نے قلم کے ذریعے انسان کو ایسا علم سکھایا جسے وہ پہلے سے نہ جانتا تھا"

تو بابا کو ایک لوح نہیں ایک ورق دکھایا گیا کہ یہ پڑھ..

تو یہ گتھی سلجھ گئی.. کہ پڑھنے کے لیے سامنے کچھ رکھا گیا تھا.. بیداری میں یا عالم خواب میں..

اور قلم کے ذریعے انسان کو ایسا علم سکھایا جسے وہ پہلے سے نہ جانتا تھا..

میں نے شاید پہلے تذکرہ نہیں کیا کہ اپنے تنگ تھیلے میں سامان رکھتے ہوئے جس شے کو لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اندر رکھا تھا وہ ایک قلم ایک بال پوائنٹ تھا کیونکہ میں اس آیت سے آگاہ تھا اور جانتا تھا کہ وہاں قلم کے ذریعے انسان کو علم سکھایا جاتا ہے.. اس میں خود غرضی بھی شامل تھی کہ شاید یہ بال پوائنٹ غارِ حرا میں ایک رات بسر کر کے اس قابل ہو جائے کہ اس کی روشنائی میں سے بھی پہلی بار کچھ علم نکلے.. اظہار اور بیان کا کوئی ایسا در کھل جائے جواب تک مجھ ناتواں سے کب کھلتا تھا..

زندگی کی چالیسویں منزل تھی جب وہ شخص ظاہر ہوا اور وہ نہ جانتے تھے کہ وہ کون ہے..

وہ اتنے ڈر گئے کہ اس بوجھ سے نجات حاصل کر لینے کے لیے اپنی جان کو بھی منقطع کرنے کے بارے میں خیال آیا..

اپنے گھر لوٹے.. اہلیہ خدیجہؓ سے کہا "مجھے جلدی کپڑا اوڑھا دیا جائے"

بدن میں کپکپی تھی جیسے بخار آ گیا ہو..

کہیں یہ درج ہے کہ گھر لوٹے اور کہیں یہ روایت ہے کہ جبل نور کے دامن میں مقیم اماں خدیجہؓ کے خیمے میں پہنچے.. قرین از قیاس تو یہی لگتا ہے کہ وہ اُن کے ہمراہ گئی تھیں اور پہاڑ کے دامن میں خیمہ لگایا تھا..

اماںؓ نے انہیں ایک کمبل میں لپیٹ دیا اور یہی وہ کالی کملی تھی جس کے عشق میں کل جہان کملا ہو گیا.. اور پھر اپنے عزیز ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو عیسائی تھے اور بائبل کا ترجمہ عبرانی زبان میں کر رہے تھے.. جنہوں نے گواہی دی کہ یہ جبریل امینؑ تھے اور بابا کو آخری پیغامبری کا پیغام دیا تھا..

چنانچہ حضورؐ کی وحی کی تصدیق سب سے اوّل اماں خدیجہؓ نے کی اور پھر ایک عیسائی ورقہ بن نوفل نے..

ہیکل لکھتے ہیں..

ایک روز حضورؐ چلے جا رہے تھے کہ آسمان کی طرف سے آواز آئی.. وہی فرشتہ تھا جو غارِ حرا میں آپؐ کے پاس آیا تھا. حضورؐ پر لرزہ طاری ہو گیا.. گھر آئے اور اماں خدیجہؓ سے کہا "مجھے چادر اوڑھا دو.. مجھے چادر اوڑھا دو"

آپ لیٹ گئے..

سیدہ خدیجہؓ نے فوراً چادر اوڑھا دی تو وحی نازل ہونے لگی..

"اے چادر اوڑھ کر لیٹنے والے..

اٹھئے اور خبردار کیجیے..

اپنے ربّ کی بڑائی کا اعلان کیجیے..

اپنا لباس پاک رکھئے..

اور گندگی سے دور رہئے..

اور اپنے ربّ کے لیے صبر کیجیے (سورۂ مدثر)

ہشام "سیرت النبی کامل" میں اس رات کو یوں بیان کرتے ہیں..

"رسول اللہؐ رمضان کے مہینے میں' حرا کی جانب نکلے.. آپؐ کے ساتھ آپؐ کی اہلیہ بھی تھیں"

ہشام کے مطابق اماں خدیجہؓ بھی غارِ حرا میں آپؐ کے ساتھ عبادت میں شریک ہوتی تھیں لیکن جس شب وحی کا آغاز ہوا' ساتھ نہ تھیں۔

ہشام اس کے بعد براہِ راست رسول اللہؐ کا بیان درج کرتے ہیں''. انھوں نے فرمایا ''میرے پاس جبریلؑ اُس وقت آئے جب میں سو رہا تھا.. اور ایک ریشمی کپڑا لائے جس پر کچھ لکھا ہوا تھا پھر کہا ''پڑھیے''.. ''میں نے کہا'' میں پڑھا نہیں (مجھے پڑھنا نہیں آتا)''

مارٹن لنگز ابوبکر سراج الدین کہتے ہیں کہ حضورؐ نے اس پہلی آیت کے بارے میں کہا ''یوں لگتا تھا جیسے یہ حرف میرے دل پر کندہ ہو گئے ہیں''

عبداللہ یوسف علی قرآن کا جس انداز میں انگریزی میں ترجمہ اور تفسیر کرتے ہیں.. ایسے کرتے ہیں کہ اس ترجمے پر بھی ایک الہامی کتاب کا شبہ ہونے لگتا ہے.. اور وہ ''اقراء'' کا ترجمہ READ کے علاوہ PROCLAIM بھی کرتے ہیں.. یعنی ''اعلان کرو''.. اور یوں حرف ''پڑھ'' سے جو سوالات ذہن میں جنم لیتے ہیں وہ ''اعلان کرو'' سے واضح طور پر حل ہو جاتے ہیں..

وہ کہتے ہیں'' ''اقراء'' کا مطلب ''پڑھ'' بھی ہو سکتا ہے یا ''زبانی پڑھنا.. زبانی ادا کرنا... یا دوبارہ کہنا' دوہرانا' دوبارہ سنانا'' بھی ہو سکتا ہے.. اس کے علاوہ ''اعلان کرنا.. مشتہر کرنا'' بھی اس کا ترجمہ ہو سکتا ہے''

چنانچہ ''اقراء''... پڑھ.. زبانی پڑھ.. زبانی ادا کر.. دوبارہ کہو.. دوہراؤ.. دوبارہ سناؤ.. اعلان کرو.. مشتہر کرو..

یہ رات.. غارِ حرا کی تنہائی میں یہ رات تقریباً اُسی احساس.. شکل و شباہت اور مدھم چاندنی کی رات تھی.. گئی رات تھی.. جب چودہ سو برس کی ایک رات.. ایسی ہی مدھم چاندنی کی گئی رات میں.. جب چاند بھی اسی کیفیت میں تھا.. یہی پتھر تھے.. یہی صحن تھا..

اور جہاں میں تھا.. یہیں عین اسی جگہ پر بابا تھے.. بیدار تھے یا خواب میں تھے جب کہا گیا کہ.. پڑھ!

اور وہ پڑھ نہ سکتے تھے..

اور میں.. اُس اُمّی کی اُس کے ہاتھوں کی کام سے گھسی ہوئی پیوند زدہ چپلوں تلے جو مٹی آتی تھی اس کا بھی ایک ذرہ نہ ہو سکتا تھا.. میں تو محض اس کی ذاتی قصوی کے پیچھے پیچھے چلنے والا اس کی مینگنیاں سمیٹنے والا تھا جس کی جانب نہ تو اس نے کبھی مڑ کر بھی دیکھا تھا بھی تو مجھے پہچان نہ سکتے تھے اگر کبھی مڑ کر دیکھ

لیتے.. تو میں آسمان نہ ہو جاتا.. اور پھر بھی میں کیسی ڈھٹائی سے اُنہی موسموں میں.. چاند کی تقریباً اُنہی راتوں میں.. اُنہی ہواؤں کی زد میں جو رات کے اس پہر خاموشی سے میرے بدن کو چھوتی ہیں اور کبھی ان کے رخساروں سے مس ہوتی تھیں' میں اسی جگہ پر بیٹھا تھا.. جہاں صرف ایک آدمی بیٹھ سکتا ہے یا لیٹ سکتا ہے.. تو میں وہی آدمی تھا.. تو آپ کو یقین کرنا ہوگا کہ اُس شب میں پہلی بار مجھے اس بے ادبی کا احساس ہوا..... میں جو اپنے نصیب پر نازاں یہ رات گزار رہا تھا پہلی بار میں نے اسے نصیب نہ جانا.. انتہائی بدتمیزی اور بے ادبی جانا اور اپنے آپ کو مطعون کیا کہ یہاں کیوں آئے تھے.. آئے تھے تو دو نفل ادا کر کے چلے جاتے.. یہاں کیوں بیٹھے رہے تھے..... اُنہی موسموں میں اُسی نشست پر کیوں بیٹھے رہے تھے..... آگ لینے آئے تھے اور گھر کے مالک بن بیٹھے.. اور کس ڈھٹائی سے بیٹھے ہو..

کبھی مجھے احساس ہوتا کہ میں بھی ایک رویا میں ہو.. ایک خواب میں ہوں.. یہ غار یہ صحن اور یہ آڑے ترچھے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے پتھر دراصل میرے ذہن کا کرشمہ ہیں.. میں نے اپنے تصور میں انہیں تخلیق کیا ہے.. یہ سب کچھ اصل نہیں ہو سکتا.. اصل ہے تو میں یہاں نہیں ہو سکتا.. اگر میں یہاں ہوں تو یقیناً خواب میں ہوں..

ویسے یہ سب ہے کیا.. پتھر ہیں.. معمولی پتھر اور ان میں پوشیدہ ایک عام سی کھوہ.. یہ تو کچھ وقعت نہیں رکھتے.. ان کی کوئی حیثیت نہیں.. ان میں رات گزارنا کوئی معنی نہیں رکھتا کہ ان میں تو ایک بلی بھی رات گزار سکتی ہے.. بندر بھی ادھر آ نکلتے ہیں.. تو ان معمولی پتھروں کے درمیان جس ہستی نے گیان دھیان میں مگن اپنے آپ کو فراموش کیا تو وہ ہے جو ان پتھروں میں جان بھرتی ہے.. انہیں زندہ کرتی ہے..

ایسے ان پتھروں کو زندہ کرتی ہے کہ انہیں پوجنے کو جی چاہے..
ان کے صنم تراشنے کو دل کرے..
اور پھر ہر صنم بولے.. خود بخود کلام کرے.. اقراء کہتا چلا جائے..

میں نے تو اک عمر پتھروں سے عشق کیا ہے.. ان کے جنون میں رسوا ہوا ہوں اور جانتا ہوں کہ ان پتھروں سے کہیں زیادہ متاثر کرنے والے.. شان اور جلال والے پتھر دنیا میں بہت ہیں.. اس کھوہ کی نسبت دنیا کے بلند ترین پہاڑوں کے دامنوں میں پوشیدہ ہزاروں غاریں ہیں جو حیرت کی وادیاں ہیں.. تو اگر میں وصال کے لیے بے قرار تھا اور شدت کی تمنا رکھتا تھا تو بے قراری اور تمنا ان معمولی پتھروں اور کھوہ کے لیے تو نہیں تھی.. ان کے لیے تھی.. دراصل یہ ایک وسیلہ تھے ان سے وصال کرنے کا.. ان کے قریب ہونے کا.. صرف اس لیے بھی نہیں کہ بابا نے برسوں ان پتھروں کے درمیان سانس لیے.. وقت

اور زمانہ کچھ اہم نہیں ہے.. اگر بابا ان پتھروں کے درمیان ایک سانس بھی لیتے.. تب بھی میں اسی چاہت اور جنون سے یہاں آتا..

تو یہی کو وہ دمن کو روشن کرنے والی چاندنی تھی..

غارِ حرا کے صحن میں جیسے وہ اب اُتر رہی تھی ویسے ہی انہی زاویوں پر اس شب اُتر رہی تھی جب اقراء کا حکم سنائی دیا تھا..

اور غار کے شگافوں میں سے ہوا کا چلن شب گزرنے سے زیادہ ہو چلا تھا. تو اُن میں سے جو خفیف سا جھونکا در آتا اور میرے بدن پر اپنے آپ کو بکھیر دیتا تو یہ اسی انداز میں میرے نبیؐ کے بدن پر بکھرتا تھا.. چاندنی کے جزیرے جو فرش سے اُٹھ چکے تھے اور اب غار کی دیواروں کے روشن جھومر ہوتے تھے اُس شب بھی انہی جگہوں پر ٹھہرے ہوئے تھے..

صحن کی جانب سے جو ہلکی آہستہ خرام ہوا آتی تھی اُس میں ٹھنڈک تھی اور اُس شب بھی اس کا یہی چلن ہوگا..

مجھ پر.. جہاں بابا بیٹھتے تھے.. وہیں بیٹھے ہونے کا.. جو ہوائیں جس انداز میں شب کے اس پہر بابا کے بدن کو مَس کرتی تھیں انہی ہواؤں کو اپنے بدن کو چھوتے جانے کا.. چاندنی کے جزیروں کا.. باہر صحن کے منظر کا.. اندر غار کی تاریکی کا.. اور اقراء کے اُترنے کا ایک ہیجان طاری تھا..

ایسا ہیجان کہ مجھے ڈر لگتا تھا.. کہ جبریل امینؑ تو اس کھوہ میں اُترنے کے عادی ہیں تو کہیں بھولے بھٹکے پھر نہ اِدھر آ نکلیں... اپنے محبوب کی یاد میں اِدھر نہ آ جائیں.. آ گئے تو پھر میں کیا کروں گا..

آ گئے تو مجھے دیکھ کر وہ کیا کہیں گے.. کیا کریں گے.. مجھے اسی مقام پر بیٹھا ہوا دیکھ کر پسند تو نہیں کریں گے کہ اس کی اپنے ہاتھوں سے گانٹھی ہوئی پیوند زدہ جوتیوں تلے آنے والا ایک ذرّہ یہاں کیوں آن بیٹھا ہے.. کہیں مجھ سے معانقہ نہ کریں.. کہ میں تو ایسا پتھر تھا جو اُن کے معانقے کے باوجود پتھر ہی رہتا..

مجھے ہر آہٹ سے ڈر لگتا تھا کہ کہیں وہ آ ہی نہ جائیں..

عجب اضطراب تھا.. ڈر تھا..

مجھے صلاح الدین محمود یاد آ گئے.. وہ صرف اس لیے مکّے سے مدینے تک اونٹ پر سفر کرنا چاہتے تھے اور انہی راستوں پر کرنا چاہتے تھے جن راستوں پر قصویٰ کے سُموں کے نشان ثبت ہوئے تھے.. کہ ہجرت کے وہ دن رات اور جو راستے تھے تو حضورؐ کے وہ دن کیسے گزرے.. وہ راتیں کیسے بسر ہوئیں.. کیسے

جب وہ صحرا کی سویر میں بیدار ہوتے تھے تو اُس لمحے ہوا کس رُخ سے پہلو بدلتی ہوئی آتی تھی اور اُن کے رُخساروں کو چھوتی تھی.. رات کو جب پڑاؤ کرتے تھے تو اوپر آسمان کیسا ہوتا تھا.. صرف یہ محسوس کرنے اور دیکھنے کی خاطر انہوں نے انہی موسموں میں انہی راستوں پر یہ سفر اختیار کرنے کی سعی کی جن میں بابا نے اپنے یارِ غار کے ہمراہ یہ سفر اختیار کیا.. انہوں نے ہجرت کا پورا راستہ تو طے نہ کیا صرف ایک دو روز کے لیے مدینے کی جانب اسی راستے پر چلنے کی اجازت ملی اور وہ چلے.. اور جب بھی وہ اس سفر کا قصہ سناتے اور کہتے... مستنصر جب میں نے تقریباً اسی مقام پر رات کا پڑاؤ کیا جہاں میرے حضورؐ نے کیا.. اور پھر اگلی سویر بیدار ہوا تو اپنے گالوں پر ایک ہلکی ٹھنڈک والی ہوا بکھرتی محسوس کی اور یکدم مجھے احساس ہوا کہ حضورؐ کے چہرے کو بھی اسی ہوا نے.. ایسی ہی سویر میں مَس کیا تھا تو مستنصر.. اس کے آگے وہ بیان نہ کر پاتے.. اُن کے سپید گالوں پر آنسوؤں کے دھارے بہنے لگتے اور وہ مسکرانے لگتے..

غارِ حرا میں رات بسر کرنے کے لیے میں اتنی باریکیوں میں نہ گیا تھا.. اتنا حساب کتاب نہیں کیا تھا.. کہ جب پہلی وحی نازل ہوئی تو ذیقعد کی سترہ تاریخ تھی تو مجھے یہاں اسی تاریخ کو قیام کرنا چاہیے... موسم کا حساب کرنا چاہیے کہ اُن زمانوں میں اس تاریخ کو آب و ہوا کیسی تھی.. تعین تو ممکن تھا لیکن میں اتنی تفصیل میں چلا جاتا تو شاید جبل نور پر نہ پہنچ پاتا..

لیکن بنا تعین کیے.. میں ایک ایسی رات میں یہاں تھا.. جو شب اقراء کے آس پاس تھی.. تب سترہ ذیقعد تھی اور آج شعبان کی بارہویں تھی.. یعنی تب چودھویں کے پورے چاند کو تین راتیں گزر چکی تھیں اور آج ابھی وہ دو راتوں کے فاصلے پر تھا.. چنانچہ چاند اسی زاویے سے جبل نور کے پہلو میں سے نمودار ہوا تھا اور اُس کا سفر جو غار کے اندر روشن دھبوں کی آہستہ آہستہ سرکاہٹ سے طے ہو رہا تھا تقریباً اسی راستے پر تھا.. یہ بھی ممکن ہے کہ موسم بھی ہو بہو ویسا ہی ہو..

تب بھی رات اتنی ہی گزر چکی تھی.. یہی پہر تھا..

تو رات کے اس پہر.. ڈھلتی چاندنی میں.. جبل نور کی گھاٹی سے لگ کر اوپر صحن میں آ جانے والا کوئی جھونکا جب غار کے اندر ہولے سے آ جاتا تھا اور میرے بدن کو چھو لیتا تھا.. تو یہ جھونکا بھی وہی تھا جسے بابا نے رات کے اسی پہر اسی انداز میں اپنے چہرے پر محسوس کیا تھا.. اور شاید یہی لمحہ ہے جب غار میں ایک شخص نمودار ہوا..

کیا یہی لمحہ ہے؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا.. یا وہ گزر چکا ہے.. یا وہ آنے والا ہے..

اگر یہی لمحہ ہے تو میں اسے کیسے محسوس کر کے گرفت میں لے لوں.. وہ آواز.. تصور کروں کہ کیسی تھی.. گہری تھی بات دار تھی یا سرگوشی میں تھی.. وہ چینا یکھ اور تھی کہ ایک انسان کی نہیں ایک فرشتے کی تھی.. جو آواز

کبھی کانوں میں نہ اُتری ہو اُسے تو بیان نہیں کیا جا سکتا.. اگر وہ لمحہ گزر چکا ہے تو کیا مجھے بھی کسی تبدیلی سے دوچار کر گیا ہے اور اگر آنے والا ہے تو میں اُس کے لیے اپنے آپ کو کیسے تیار کروں..

تو ایک کم علم کے علاوہ کم فہم والا انسان ایسی صورت میں کیا محسوس کر سکتا ہے.. بس ایک مسلسل اضطراب.. ایک بے چین کیفیت لیکن گھبراہٹ سے عاری.. ایک اضطراب بھرا اطمینان بھی کہ میں کیسے تجربے میں سے گزرنے والا اچھے نصیب والا شخص ہوں.. اگرچہ میں اس کا اہل نہیں ہوں.. میں تو یونہی ایک صبح شہر میں داخل ہونے والا فقیر تھا جس کے سر پر حرا کا تاج رکھ دیا گیا..

اور پھر ایک غم.. ایک گہرا غم کہ وقت یہاں ٹھہرے گا نہیں' گزر جائے گا..

یہ لمحے گزرتے جاتے ہیں تو میں کیسے ان لمحوں کے گرد لپٹ جاؤں' ان کے پاؤں پر سر رکھ دوں ان کو بوسے دوں' ان کی قدر کیسے کروں.. کیا کروں۔

میں اس دوران.. رات کے اُس پہر.. اپنے آپ سے کچھ کلام نہ کرتا تھا. ذہن کے کینوس پر کوئی تصویر پینٹ نہ کرتا تھا.. جان بوجھ کر یہ خیال کرنے سے اجتناب کرتا تھا کہ دیکھو تارڑ تم اُنہی لمحوں میں غارِ حرا کے اندر سانس لیتے ہو جب چاندنی کی اسی بجھی ہوئی کیفیت میں.. جب کہ صحن کے اوپر معلق جبلِ نور کی چوٹی تک پہنچتی چٹان کا سایہ بس اسی طور صحن میں آگے ہو رہا ہے.. جو تم دیکھ رہے ہو یہی منظر تمہارے بابا کی آنکھیں دیکھتی تھیں.. اُس بیداری میں یا اُس خواب میں اُترنے سے پیشتر جس میں اقراء کا ورق اُن کے سامنے لایا گیا تھا.. نہیں.. یہ سب کچھ تو میں اب تحریر میں لا رہا ہوں اُس پہر میں نے کوئی تصویر نہ بنائی نہ اپنے آپ سے کچھ کلام کیا.. اگر میں ایسا کرتا یہ سب کچھ تصور میں لاتا تو میں برداشت نہ کر پاتا.. ہرگز سہہ نہ سکتا. میرا کلیجہ پھٹ جاتا' بھلا جس کیفیت کو میرے بابا بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے میں اگر محض اُس کا تصور کرتا تو دیوانہ ہو جاتا. حرا کے پتھروں سے سر پھوڑنے لگتا..

بے شک میں کوئی تصویر نہ بناتا تھا.. اُس اقراء کے لمحے کو جان بوجھ کر تصور میں نہ لاتا تھا.. اپنے آپ سے یہ نہیں کہتا تھا کہ تارڑ سوچو.. محسوس کرو کہ تم کہاں ہو اور کس لمحے میں ہو.. یہ کہنے سے اجتناب کرتا تھا اور اس کے باوجود وہ لمحہ میرے بدن کی ہر شریان میں تیرتا تھا.. ایک ایسی بادبانی کشتی کی مانند تیرتا تھا جو گہرے سمندروں میں راستہ بھول چکی ہو اور پھر ایک سویرا اُبھرتے سورج کی پہلی زرد کرنوں میں آ کر ایسے روشن ہو جائے جیسے نور سے تخلیق کی گئی ہو.. اُسے راستہ نظر آ جائے.. وہ خود بخود بادبانوں کے بغیر چپو چلائے بغیر تیرنے لگے اُس راستے کی جانب.. جیسے غار کے آخر میں واقع شگاف میں سے سرایت کرتی ہوا میرے بدن میں تیرتی تھی.... جیسے چاندنی کے دھبے میرے بدن کو داغتے رہے تھے.. وہ لمحہ بھی داغتا گیا.. اور وہ میری شکر گزاری کی قربت میں اُترتا تھا..

''پڑھیے.. اپنے رب.. پیدا کرنے والے کے نام پر..''

جبلِ نور کے تقریباً ہر پتھر پر... ہر چٹان کے ماتھے پر یہاں تک کہ غارِ حرا کے اندر جو دیواری چٹانیں تھیں اُن پر بھی یہ آیت کاروباری حضرات نے سرخ پینٹ سے تھوپی ہوئی تھی اور میری نظر جب اُس تک جاتی تھی' میں اُسے پڑھتا تھا تو مجھے کچھ نہ ہوتا تھا.. مجھ پر اثر نہ کرتی تھی.. صد شکر کہ اس تاریکی میں وہ اوجھل ہو چکی تھی.. لیکن اب وہ میری شریانوں میں تیرتے لمحے کی کشتی کے بادبانوں پر درج تھی اور اُس کی اثر اندازی کی کوئی مثال نہ تھی..

اُس لمحے کو.. اگر وہ بیت چکا تھا تب بھی.. اور اگر وہ موجود میں تھا تب بھی اور اگر اُس نے ابھی نزول ہونا تھا تب بھی کائناتوں پر محیط کر دینے میں کچھ کمال چاندنی کے جزیروں کا بھی تھا..

وہی موسم... رات کا وہی پہر اور چاندنی کے دھبے بھی یقیناً غار کے اُنہی پتھروں پر.. اُنہی سلوں اور چٹانوں پر.. اُن میں سے ایک دھبہ ایسا تھا اور میں اُس کی موجودگی کا احساس نہ کر سکا تھا جو ابھی تک فرش پر تھا.. میں کروٹ بدلتا تو وہ میری دائیں پسلی پر آ ٹھہرتا اور بابا اُس لمحے.. یعنی اُس لمحے اس انداز میں غار کے صحن کی جانب چہرہ کیے لیٹے ہوں گے.. یونہی سنگریزوں پر تو نہیں شاید اپنی کھدر کی چادر پر.. کالی کملی پر.. یا شاید اماں خدیجہؓ نے انہیں غار کے فرش پر بچھانے کے لیے اونٹ کے سیاہ بالوں سے بنا ہوا کوئی کھیس دیا ہو... وہ لیٹے ہوں گے تو رات کے اس پہر.. چاندنی کی اسی منزل میں بابا کے وجود پر بھی یہی چاندنی میں نہایا ہوا ایک دھبہ ٹھہرا ہو گا جو میری دائیں پسلی پر رُکا ہوا تھا..

یہی دھبہ... جو بابا کے بدن پر تھا.. اُس لمحے مجھ پر تھا..

اور اس دھبے کو میرا شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ وہ میرے بدن پر واضح اور روشن دکھائی دیتا تھا.. بے شک وہ اپنے آپ کو کوستا ہو گا کہ چودہ سو برس پیشتر میں کس بدن پر تھا اور آج میں کیسا سیاہ بخت ہو گیا ہوں..

اُس دھبے کو میرا شکر گزار اس لیے ہونا چاہیے تھا کہ تب وہ میرے بابا کے نور بدن پر اُترا ہو گا تو کہاں دکھائی دیتا ہو گا.. وہاں روشنی اتنی تھی کہ اُس میں بجھ گیا ہو گا.. یہ میرا احسان تھا کہ میں نے اُسے اپنے بدن کی گناہوں بھری سیاہ چادر مہیا کی جس کی مکمل سیاہی کے پس منظر میں وہ نمایاں ہو گیا..

میں اس دھبے سے داغا جانا چاہ رہا تھا..

جیسے لوگ اپنی ملکیت کے مویشیوں کو.. گرم لوہے سے داغ دیتے ہیں تاکہ جو کوئی بھی اُس

نشان کو ثبت دیکھے تو جان جائے کہ ان کا مالک کون ہے.. ایسے اگر چاندنی کا یہ دھبہ سنگ کر میرے بدن کو داغ دے.. بے شک اذیت ہوگی ماس کے جلنے کی لیکن بعد میں جو کوئی بھی اس نشان کو دیکھے گا اُسے فوری طور پر علم ہو جائے گا میں کس کی ملکیت میں ہوں.. میں کس کا غلام ہوں.. جس نے مجھے اپنے گھر لا کر چاندنی سے داغ دیا تھا.. بے شک میری بائیں پسلی کے قریب کوئی نشان نہیں.. یعنی کسی اور کو دکھائی نہیں دیتا.. لیکن ہے.. میں اب بھی اُسے وہیں پاتا ہوں جہاں وہ اُس رات غار حرا میں تھا..

کئی لوگ پوچھتے ہیں، جاننا چاہتے ہیں کہ کیا میں سفر محض اس لیے اختیار کرتا ہوں کہ واپسی پر سفرنامہ لکھ سکوں.. ایسا ہرگز نہیں ہے.. میں نے زندگی کے بیشتر سفر اُن زمانوں میں کیے جب میں واپسی پر کچھ بھی نہ لکھتا تھا.. میں ایک ادیب نہ بھی ہوتا تو بھی اتنے ہی سفر کرتا جتنے کہ میں نے کیے.. کہ میرے لیے آوارگی جذبۂ اوّل ہے اور اُس کی روئیداد قلمبند کرتا ہوں تو لوگوں کو اپنے سفر میں شریک کرنے کے لیے اور.. اُس سفر کو پھر سے زندہ کرنے کے لیے.. گویا میں ایک اور سفر پر نکل جاتا ہوں.. اور یہاں ایک سفرنامہ نگار دوسرے مسافروں سے کہیں زیادہ بخت والا ہو جاتا ہے کہ وہ دوبارہ اُنہی کیفیتوں، مسرتوں، اذیتوں اور مشقتوں اور خوبصورتیوں میں سے گزرتا ہے.. کچھ اسی طور میں نے غار حرا میں تو صرف ایک شب بسر کی لیکن اُسے بیان کرتے ہوئے سینکڑوں راتیں میں نے اُس غار میں بسر کیں.. جو سرسری دیکھا تھا اُس کی تفصیل میں گیا.. جو اَن دیکھا تھا وہ بھی سنّاٹے کی تنہائی میں نظر آنے لگا.. ایک شب کا ہیجان اور کیفیت سینکڑوں شبوں پر محیط ہو گیا.. تو گویا اب بھی.. اس لمحے.. جب کہ اُس شب کو گزرے ہوئے ایک برس ہو چکا ہے.. میں ہنوز غار حرا کی رات میں ہوں..

وہ دھبہ چاندنی کا جس سے میں داغا جانا چاہ رہا تھا وقت کے بہاؤ میں تھا.. سرکتا ہوا میرے بدن سے اُترا.. کچھ دیر فرش پر پڑا رہا اور پھر آہستگی سے دیوار کے پتھر پر چلا گیا.. مجھے خالی کر گیا..

شاید دو بج رہے تھے..

میں اقراء کے اُس لمحے کی شدت کو مزید سہار نہ سکا.. اور اُٹھ کر صحن میں چلا گیا.. کھائی سے پرے وہی پہاڑ تھا جس پر بابا کوہی شخص دوبارہ نظر آیا تھا.. اُسے میں نے بہت دیر تک دیکھا.. گہرے سانس لیے.. کوشش کر کے اپنی توجہ کو پہلی وحی کے نزول کے لمحے سے الگ کیا.. مجھے یہاں رہتے ہوئے ایک مدت ہو چکی تھی.. جانے کتنے برسوں سے میں یہاں تھا.. یہی میری کل حیات تھی.. ایک کھوہ اور اس کے آگے یہ صحن.. میں یہاں کب آیا تھا؟ جانے کن زمانوں میں آیا تھا.. وہ زمانے مجھ سے کٹ چکے [illegible] تھے لیکن میں ہمیشہ سے غار حرا میں تھا..

میرے حواس کسی حد تک بحال ہوئے تو پھر غار کے اندر لوٹ آیا..

پڑھنے کا حکم آ چکا تھا اس لیے میں نے تعمیل کی.. اور کعبے کی جانب رُخ کر کے پڑھا.. بہت کچھ پڑھا.. اور پھر اپنے مصلے پر تپتی ہتھیلی پر سر رکھ کر لیٹ گیا.. تھکاوٹ بہت نمایاں ہو رہی تھی.. میری شریانوں میں جو نور کی کشتیاں رواں تھیں، شہ رگ کی قربت میں چاندنی کا جو دھبہ دھڑکتا تھا ان کے ہیجان نے مجھے تھکا دیا تھا.... میرا بدن تو آرام کا طالب تھا لیکن آنکھیں بند ہونے سے کتراتی تھیں.. وہ مسلسل دیکھنا چاہتی تھیں.. ان لمحوں کے بیش قیمت ہونے سے آگاہ تھیں جانتی تھیں کہ یہ دوبارہ دیکھنے کو نہیں ملے گا.. اُن میں تھکاوٹ تو تھی نیند نہ تھی..

شاید میں سو گیا..

شاید میں سویا.. شاید نہیں..

شاید میں ایک اونگھ میں تھا.. سوتا جاگتا تھا.. پہلو بدلتا تو میرا رُخسار اُس پتھریلی سطح پر جا لگتا جس کے ساتھ ٹیک لگا کر مجھے آرام ملتا تھا..

پھر میں سیدھا ہو کر لیٹ گیا..

مجھے اندازہ نہیں.. نہ میں قیاس کر سکتا ہوں کہ اس سونے جاگنے میں کتنی گھڑیاں بیت گئیں..

نہ میں سوتا تھا.. نہ جاگتا تھا..

نہ غفلت میں تھا اور نہ آگاہ تھا..

نہ ہوش میں تھا اور نہ بے ہوش تھا..

میں خود بھی نہ تھا اور کوئی اور بھی نہ تھا..

میرا چہرہ بھی نہ تھا اور کوئی غیر بھی نہ تھا..

اس ہونے اور نہ ہونے کی کیفیت میں کچھ اور وقت گزر گیا..

مجھے سونا نہیں چاہیے.. یہ لمحے سونے کے لیے نہیں.. انہیں ضائع نہیں کرنا.. دیکھنا ہے.. محسوس کرنا ہے.. کچھ نہ کچھ کرتے رہو..

میں سیدھا لیٹا ہوا تھا اور میرا چہرہ چھت کو تکتا تھا.. بایاں ہاتھ اٹھاتا تھا تو وہ خلا میں رہتا تھا.. سنگ مرمر کی سلوں کے آگے جو دیوار تھی وہاں تک تو نہ پہنچتا تھا تو بیکار تھا اس لیے میں نے بایاں ہاتھ سمیٹ کر سر اور تپتی ہتھیلی کے درمیان رکھ لیا.. اور دایاں ہاتھ.. یہ کارآمد تھا.. میرے بدن کا پورا دایاں حصہ پتھریلی دیوار کے ساتھ لگا تھا یا وہ دیوار میرے بدن کے ساتھ لگی تھی کہ لیٹنے سے یہی حالت ظہور میں آتی تھی.. تو میں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا.. سیدھا کیا اور ہتھیلی کھول کر چٹان پر پھیرنے لگا.. یونہی اُس کی

کھردری سطح کو محسوس کرتا ہاتھ پھیرنے لگا.. پھر وہی تشبیہ کام آئے گی کہ جیسے نابینا بریل لکھائی پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرتے ہیں اُسے پوٹوں پر محسوس کرتے ہوئے.. پڑھتے ہیں.. اور مجھے خیال آیا کہ نابینا لوگ جب بریل میں قرآن پاک کو چھو کر پڑھتے ہیں اور اُن کے پوٹوں تلے.. اقراء باسم ربک الذی خلق.... اُبھرا ہوا محسوس ہوتا ہے تو وہ کیسی عجیب سی کیفیت سے دوچار ہوتے ہوں گے کہ وہ بھی تو پڑھ نہیں سکتے.. دل میں کیا کہتے ہوں گے کہ میں پڑھ نہیں سکتا..

کافی دیر تک بے دھیانی میں میں چٹان پر اپنی ہتھیلی آہستہ آہستہ پھیرتا رہا.. ایک نیم دائرے میں جیسے کار کے وائپر ہولے ہولے چلتے ہیں.. اور تب مجھے اپنے جاپانی بال پوائنٹ کا خیال آیا.. جو خصوصی طور پر میں اپنے ساتھ لایا تھا.. لکھنے کے لیے یا نوٹس بنانے کے لیے نہیں محض اس لیے کہ جہاں پہلا حرف نازل ہوا تھا.. جہاں وہ پڑھا گیا تھا اور جہاں قلم کے ذریعے پڑھانے اور سکھانے کی نوید دی گئی تھی تو اُس مقام پر ایک قلم تو ہونا چاہیے.. میں نے اُٹھ کر اپنے سرہانے یعنی تنتی تھیلے کی جیبوں کو ٹٹولا اور وہ بال پوائنٹ نکالا.. ٹارچ جلائے بغیر اندھیرے میں محسوس کر کے تلاش کیا اور پھر لیٹ گیا.. قلم کو میں نے دائیں ہاتھ میں یوں پکڑا کہ میرا انگوٹھا اُسے سنبھالتا تھا اور وہ میری کھلی ہتھیلی پر کھلا تھا..

اسے عقیدے کا ضعف قرار دیا جا سکتا ہے.. رومان پسندی کو بھی موردِ الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے اور اسے ایک وہم بھی شمار کیا جا سکتا ہے کہ میں یہ قلم خصوصی طور پر اپنے ہمراہ صرف اس لیے لایا تھا کہ اسے غارِ حرا کے پتھروں سے چھوؤں گا.. اُن پر رکھوں گا.. اُن کے لمس سے اسے روشناس کرواؤں گا کہ انہی پتھروں نے اقراء سنا تھا تو اُن کے ساتھ چھونے سے شاید اسے بھی کچھ لکھنا پڑھنا آ جائے.... یہ پتھر اس پر مہربانی کر دیں.. عنایت کر دیں.. یہ یقیناً عقیدے کا ضعف تھا..

وہیں لیٹے لیٹے بال پوائنٹ کو انگوٹھے سے سنبھالے ہتھیلی وا کیے ایسے کہ جب میں نے چٹان کی سطح پر ہاتھ رکھا تو پورا بال پوائنٹ اُسے چھوتا تھا.. اُسی طور اپنا ہاتھ چٹان پر ہولے ہولے میں نے پھیرا.. ایک نیم دائرے میں.. ایک سُست وائپر کی مانند..

جب میرا ہاتھ خالی تھا اور میں اُسے چٹان پر پھیرتا تھا تو ظاہر ہے لمس بے آواز تھا.. اب ہتھیلی اور چٹان کے درمیان بال پوائنٹ تھا اس لیے اُس کے چھونے سے.. اُس اَنمٹ اتھاہ اور کھائیوں میں اترنے والی خاموشی میں اس کی رگڑ سے ایک ہلکی آواز جنم لیتی تھی.. گرر.. گرر.. جیسے کوئی گراری رُک رُک کر چلتی ہو..

میں بال پوائنٹ کو خاص طور پر چٹان کی سطح پر دبا کر ہاتھ نہ پھیرتا تھا..

کچھ قیاس کیے بغیر کہ میں یہ کیوں کر رہا ہوں.. کچھ سوچے سمجھے بغیر کچھ غنودگی میں کچھ غفلت میں میں ہاتھ پھیرتا تھا.. اور بال پوائنٹ کے آہنی وجود کے لمس سے چٹان پر ٹھہر ٹھہر کر آگے کھسکنے اور سرکنے سے رگڑ کی جو آواز آتی تھی وہ غار کی اتھاہ خاموشی میں گونجتی تھی.. واضح اور بلند ہوتی تھی.. جیسے کسی گہرے متروک شدہ کنوئیں میں پتھر گرایا جائے تو پانی سے ٹکرانے کے بعد کنوئیں کی گولائی میں سے ایک مرغولے کی مانند اٹھتی آواز گونجتی ہے..

اس خاموشی میں جائیں اتنے بلند نالے..

میرے کانوں میں اُترتی واحد آواز.. گر.. گرر.. رگڑ.. پتھر سے اُچٹتی رگڑ کھاتی ایک آواز.. خاموشی میں بلند ہوتی..

ایک میکانکی انداز میں.. کچھ غنودگی میں اور کچھ غفلت میں.. جب میں سوتا تھا نہ جاگتا تھا اپنے ہاتھ کو.. قلم کو تھامے ہوئے ہاتھ کو حرکت دیتا رہا.. ایک نیم دائرے میں.. سر کے عین اوپر ہاتھ حرکت کرتا ہوا میری کمر تک آتا تھا نیم دائرے میں.. اور میں اُسے پھر سے اُٹھا کر چٹان کے ساتھ لگا کر حرکت دینے لگتا تھا..

کبھی میں اپنے بازو کو آرام دینے کی خاطر اپنے پہلو میں لٹا دیتا قلم سے جدا ہوئے بغیر.. اور پھر کچھ لمحوں بعد وہی سلسلہ شروع کر دیتا..

میں ایسا کیوں کر رہا تھا.. قلم کو ایک دو بار ان پتھروں سے چھو کر بھی تو حاضری لگوائی جا سکتی تھی.. میں بار بار ایسا کرتا تھا کہ غار کی تنہائی میں قلم اور چٹان کا ملاپ جو سُر بلند کرتا تھا وہ مجھ کو بھلے لگتے تھے.. تنہائی کا توڑ بنتے تھے..

اس خاموشی میں جائیں..

بعض اوقات یہ نالے.. قلم کے کھردری چٹانی سطح پر سرکنے کے نالے اتنے بلند محسوس ہوتے جیسے یہ صحن میں خفتہ نیاز.. جبلِ نور کی گھاٹی جہاں ہوا گھستی ہے وہاں سونے والے بابا بنگالی کو بھی جگا دیں گے..

اور پھر..

چٹان کی سطح پر نیم دائرے میں حرکت کرتا ہوا میرا ہاتھ اور قلم ایک مقام پر لمحہ بھر کے لیے رُکا تو میرا بازو بے اختیار کانپنے لگا.. جیسے رعشہ زدہ ہو گیا ہو.. میرا بقیہ بدن تو سکوت میں تھا لیکن میرا بازو لرزش میں آ گیا.. کپکپانے لگا میرے اختیار سے باہر ہو کر دھڑکنے لگا..

میں نے اس مقام سے ہاتھ کو الگ کیا اور اُسے ذرا آگے سرکایا تو بقیہ بدن کی مانند وہ بھی

سکوت میں چلا گیا.. نارمل ہو گیا..

لیکن مجھے چسکا لگ گئی کہ کیا یہ محض اتفاق تھا یا وہ مقام کوئی خاص مقام تھا جہاں میرا ہاتھ ٹھہرا تو لرزش میں آ گیا..

یہ جاننے کے لیے میں نے اپنی ہتھیلی پیچھے کر کے پھر اسی جگہ پر رکھ دی تو بازو خزاں رسیدہ پتے کی مانند لرزنے لگا..

میں اگر غنودگی اور غفلت میں تھا تو فوراً باہر آ گیا.. یہ کیا ہے کہ سر کے عین اُوپر جب میں اپنا بازو بلند کر کے ایک خاص مقام پر ٹھہرا رہنے دیتا ہوں تو وہ قلم سمیت لرزنے لگتا ہے.. ذرا آگے سرکاتا ہوں تو نہ کانپتا ہے نہ لرزتا ہے.. سکھ چین کے سکوت میں چلا جاتا ہے.. کیوں؟

اس میں کوئی اسرار کوئی راز کوئی بھید نہ تھا.. کوئی رمز نہ تھی.. غالباً صرف یہ تھا کہ جب میں اپنے بازو کو بلند کر کے ہتھیلی اُس مقام پر دھرتا تھا تو کہیں کاندھے میں کوئی شریان دب جاتی تھی.. کسی رگ پر بوجھ پڑتا تھا تو ہاتھ لرزنے لگتا تھا' سادہ اور آسان سی توجیہہ..

ورنہ اور کیا سبب ہو سکتا ہے.. بس یہی..

میں عرض کر چکا ہوں کہ اگر میں غنودگی اور غفلت میں تھا تو باہر آ گیا تھا.. حواس میں تھا اور جاگتا تھا۔ اس آسان سی توجیہہ کو قبول کرتے ہوئے میں نے ہتھیلی اور قلم کو اسی مقام پر رہنے دیا جو سرزنش کا باعث بنتا تھا..

اس کپکپاہٹ کا آغاز بہت ہلکے انداز میں ہوتا تھا..

میں نے ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو تسلی دینے کی خاطر ہتھیلی اُس مقام سے ذرا پیچھے سرکائی تو کپکپاہٹ یکسر ختم گئی..

دوبارہ اپنی ہتھیلی اور قلم کو اُسی مقام پر سرکا کے رکھا تو ہاتھ کانپنے لگا.. میں نے اُسے وہیں رہنے دیا..

لیٹے ہوئے میرے پاؤں صحن کی جانب.. چہرہ چھت کو تکتا ہوا.. بایاں بازو بدن کے برابر میں آرام کرتا اور دایاں بازو اٹھا ہوا ہتھیلی اور قلم اُس خاص مقام پر..

بے شک یہ کسی رگ پر زور پڑنے سے.. بازو کے پٹھوں کے کھنچے جانے سے یا کسی اور وجہ سے ہی سہی لیکن میرے ہاتھ کی لرزش میں ہولے ہولے اضافہ ہونے لگا.. بلکہ کبھی کبھی ایک جھٹکا سا بھی لگتا.. اور پھر ایسا ہوا کہ میرا بازو ہواؤں کی زد میں آنے والے خزاں رسیدہ پتے کی مانند.. ایک مانند بید مجنوں کی طرح لرزنے لگا [illegible]

میں نے اسے لرزنے دیا..

ہاتھ اُس مقام سے ہٹایا نہیں..

میں نے کچھ کوشش نہ کی' جستجو نہ کی کہ یہ لرزش ختم ہو جائے.. میں نے اُس بازو کو اُس کے حال پر چھوڑ دیا.. جیسے وہ میرے بدن کا ایک حصہ ہی نہ ہو.. کسی اور کا بازو ہو اور میں محض تماشا دیکھنے والا ہوں..

اور جیسے جیسے لرزش میں اضافہ ہوتا تھا اُسی تناسب سے قلم کا دھاتی وجود چٹان کے ساتھ رگڑ کھاتا جاتا تھا.. اور اُس کی رگڑ کی آواز غارِ حرا میں ہولے سے گونجتی تھی..

میں نے اُسے گونجنے دیا..

میں تو صرف اپنے قلم کو اقراء کے پتھروں سے روشناس کروانا چاہتا تھا.. کچھ دیر تک چھونا چاہتا تھا لیکن یہاں ایک اور سلسلہ شروع ہو گیا..

شعوری طور پر میں نے اس کیفیت سے باہر آنے کی کوشش نہ کی.. دم سادھے لیٹا رہا.. چھت کو تکتا رہا.. بازو کی رعشہ زدگی کو محسوس کرتا رگڑ کے تسلسل کو غور سے سنتا رہا..

کیونکہ میں ایک انوکھی حالت انبساط میں تھا..

ایک کیف اور بے پروائی کی حالت میں تھا اور لطف لے رہا تھا..

میں نے اس حالت کو اپنے اُوپر طاری ہونے دیا.. اس سے باہر آنے کی کوشش نہ کی.. اپنے بے اختیاری سے کانپتے بازو کو اختیار میں لانے کی سعی نہ کی.. بے شک اس کی کوئی نہ کوئی منطقی توجیہہ تھی لیکن اسے فی الحال قبول نہ کر کے اسے جاری رہنے دینے میں بھی کچھ حرج نہ تھا..

پھر ایک اور تبدیلی وارد ہوئی جس کی کوئی توجیہہ نہ تھی.. میرے بازو میں جو تھرتھراہٹ اور لرزش تھی وہ میرے کندھے تک آئی اور پھر میرے اُس بدن میں جو حالت سکون میں تھا سرایت کرنے لگی.. اُترنے لگی.. اور میں نے باقاعدہ اُس کا راستہ محسوس کیا کہ وہ اُتر رہی ہے اور میرے بدن میں پھیل رہی ہے.. سرایت کر رہی ہے.. جیسے ریت میں پانی سرایت کرتا جاتا ہے.. اُسے گیلا کرتا چلا جاتا ہے..

میں نے یہاں بھی مدافعت نہ کی.. اُسے سرایت کرنے دیا.. یہ لرزش میری ریڑھ کی ہڈی تک گئی اور پھر دونوں ٹانگوں میں اُتر گئی یہاں تک کہ میرے دونوں پاؤں بھی اس کی زد میں آ کر ہولے ہولے ہلنے لگے.. میرا پورا سراپا بازو میں جو لرزش تھی اُس سے ہم آہنگ ہو کر کانپنے لگا..

البتہ فرق یہ تھا کہ بازو کی کپکپاہٹ تیز تھی جیسے جلترنگ بج رہا ہو اور بقیہ بدن قدرے دھیمے

سُروں میں تھا.. جیسے ایک لچکیلی شاخ پر بیٹھا ہوا مرغ زریں اُڑ جائے تو وہ شاخ دیر تک ہولے ہولے کانپے چلی جاتی ہے.. جیسے ستار کے تار چھیڑنے سے وہ لرزتے رہتے ہیں..

پورے کا پورا بدن ماسوائے بائیں بازو کے کانپ رہا تھا.. لرزش میں تھا..

کچھ گھبراہٹ سی ہونے لگی.. جیسے میں عالم برزخ میں ہوں...

جان نکلی جاتی ہے..

یہ کیا ہو رہا ہے؟.. میں نے اپنے آپ سے پوچھا..

اور وہی شمس تبریز والا جواب آیا.. یہ وہ ہے جس کی تمہیں خبر نہیں..

میں نے سوچا کہ صرف بازو کی لرزش کی تو جیہہ تو تلاش کر لی تھی لیکن اس کے ساتھ اب پورا وجود کیوں تھرتھرانے لگا ہے ایسے کہ اس پر تمہارا کچھ اختیار نہیں.. جیسے تمہاری جان نکلنے کو ہے اس کا تو کچھ جواز نہیں.....

میرا دایاں بازو بلند حالت میں.. ہتھیلی اور چٹان کے درمیان میرا قلم.. سب لرزش میں.. اور رگز کا مسلسل شور.. پورا جثہ.. سارا وجود.. اُس کی شریانوں میں جو نور کی کشتی تھی وہ بھی ڈولتی ہوئی..

میرے بدن کا رُواں رُواں تھرتھراتا لرزش میں تھا.. جیسے میں سنولیک کی رات میں برہنہ پڑا برف پر ٹھٹھرتا ہوں.. جیسے تھم چکے دل کو حرکت دینے کے لیے بجلی کے جھٹکے دیئے جاتے ہیں تو بدن بے اختیار لرزتا ہے.. ایسے..

بے شک تحریر میں مبالغہ در آتا ہے.. داستان گوئی کی حس حقائق کو اپنے رنگ میں رنگ دیتی ہے.. بھلا ایسے مقام پر میں مبالغے کے جرم کا مرتکب ہو سکتا ہوں.. حقائق کو اپنا رنگ دینے کی جسارت کر سکتا ہوں.. وہ کچھ بیان کرنے کی حماقت کر سکتا ہے جو ظہور پذیر نہیں ہوا.. میں تو اُس بدنی کیفیت کو سینکڑوں صفحوں پر محیط کر سکتا ہوں صرف وہی بیان کرتے ہوئے جو مجھ پر گزری اور پھر بھی اختصار اختیار کر رہا ہوں.. غارِ حرا میں اُس رات میرے ساتھ یہی سلوک ہوا.. ایسے ہی ہوا.. اور میں آپ کو اس پر یقین کر لینے کی گزارش نہیں کر رہا.. کیوں کروں.. ایسا ہوا اور میرے ساتھ ہوا..

میں شاید کوشش کر کے اس کیفیت کو روک سکتا تھا لیکن میں نے اس کا سوچا بھی نہیں.. اپنے آپ کو اس لرزش کے حوالے کر دیا..

اور میں اُس رات میں غارِ حرا میں، اپنے پورے سراپے کو مسلسل کانپتے لرزتے.. کیا محسوس کر رہا تھا.. کبھی مجھے خدشہ ہوتا کہ میرا دل تھم جائے گا.. یا میں مفلوج ہو جانے کو ہوں... یا شاید اسی طور جان نکلی ہے

مجھے کچھ حساب نہیں کہ کتنے زمانے گزرے.. وقت کے پیمانے میں کتنی ریت ذرہ ذرہ سرکتی ماضی ہوئی..

شاید چند سیکنڈ.. نہیں کم از کم کچھ منٹ..

میرا خیال ہے کہ تقریباً چار پانچ منٹ تک مجھ پر یہی کیفیت طاری رہی..

شاید میں اسے جاری رہنے دیتا.. لیکن اس مسلسل ہیجان کو برداشت کرنا سہل نہ تھا.. اسے سہتے جانا ممکن نہ تھا.. مجھے خدشہ ہونے لگا کہ یہ لرزش جاری رہی تو شاید میری کوئی نہ کوئی رگ اسے سہہ نہ سکے.. کچھ نہ کچھ کہیں تھم نہ جائے.. اور بالآخر جب مجھ سے سہا نہ گیا تو میں نے اپنا ہاتھ اُس مقام سے ہٹانا چاہا.. لمحہ بھر کے لیے میں ایک عجیب دہشت میں آ گیا وہ وہاں سے ہٹتا نہ تھا.. جیسے میری ہتھیلی اور قلم چٹان پر ثبت ہو گئے ہوں لیکن حقیقت میں ایسا نہ تھا.. کانپتے ہوئے پورے بدن میں سے صرف ایک ہتھیلی کو حرکت دینے کی سعی کی جائے تو بعض اوقات وہ لرزش سے جڑی رہتی ہے.. انفرادی طور پر الگ نہیں ہوتی.. چنانچہ میں نے بازو کے ساتھ اپنے بدن کو بھی شامل کیا اور ذرا ہمت کر کے اُس مقام سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا..

ایسا ہو گیا تو.. ایک سکون نازل ہوا.. نہ کوئی لرزش تھی اور نہ رگڑ کی کوئی آواز.. سکوت ہو گیا.....

قرار آ گیا..

کچھ دیر میں اسی قرار میں رہا..

ذہن سراسر خالی.. نہ کوئی توجیہہ.. نہ جواز..

ایسا سکوت اور ایسا قرار کہ یقین ہی نہ آئے کہ چند لمحے پیشتر میں تڑپتا تھا..

میں نے ایک مرتبہ پھر اپنا ہاتھ بلند کر کے اُسی مقام پر رکھا.. ہتھیلی اور چٹان کے درمیان بھنچا بال پوائنٹ پھر سے جل ترنگ بجانے لگا.. لیکن اب اُس شدت سے نہیں جو پہلے وجود میں آئی تھی اور نہ ہی یہ لرزش کندھے تک اُتر کر میرے بدن میں پھیلی..

میں نے ہتھیلی اور بال پوائنٹ کو چٹان کے لمس سے الگ کیا.. بال پوائنٹ کو تنگ تھیلے میں سنبھالا اور پھر لیٹ گیا..

اُس مقام پر.. غار کی چٹانی دیوار کے ایک خاص حصے پر جب میں اپنا ہاتھ رکھتا تھا تو لرزہ طاری ہو جاتا تھا تو کیا یہ کوئی خاص مقام تھا.. نہ.. کسی رگ کے دبنے کی توجیہہ فہم میں نہیں آتی تھی.. ویسے تو فہم میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا.. تو پھر یہ کیسا خاص مقام تھا.. وہاں کیا تھا.. چٹان میں کچھ ایسی خاصیت تھی.. کوئی کرنٹ تھا.. کیا تھا.. یا شاید ایک ہاتھ اُن کا.. ہاں کا اکثر اسی مقام پر رکھا رہتا تھا جب وہ غار میں لیٹے

ہوتے تھے شاید!

صرف چند لمحے پیشتر قلم کے دھاتی وجود کی چٹان کے ساتھ رگڑ اور بے قراری تھی جو غار کے اندر گونجتی پتھریلی دستکیں دیتی تھی..

وہ نہ رہی تو ایسی چپ ہوئی.. ایسی کہ بس چپ ہی چپ..

شدید خاموشی؛ جس کی اپنی ایک بولتی ہوئی موجودگی ہوتی ہے.. جس کے حصار میں آئی ہوئی ہر شے اُس کا احترام کرتی ہے اور سانس روک لیتی ہے.. جیسے پتھروں کے مسام بھی سانس نہ لیتے تھے.. باہر.. چٹان کے سائے میں خوابیدہ نیاز بھی دم روکے ہوئے تھا۔ میرے اُوپر جو کھردری چھت تھی جس کے ایک ایک چپے پر میں نے متعدد بار ہاتھ پھیرا تھا اس لالچ میں کہ غار میں سے اُٹھتے ہوئے شاید کبھی بابا نے بھی اس پر ہاتھ رکھ کر سہارا لیا ہو.. اُس چھت میں بھی پتھریلا سناٹا بھرا تھا..

مجھے توقع یہی تھی بلکہ یقین تھا کہ اتنی ہیجان خیز لرزشوں اور بے اختیاریوں کے تھم جانے سے.. رعشہ زدگی کی حالت سے باہر آ جانے پر.. میرے بدن کا ہر لُوتھکاوٹ اور پژمردگی سے مرجھا جائے گا.. میں نڈھال ہو جاؤں گا.. مجھ میں کچھ سکت نہ رہے گی.. جیسے محبوب کے وصال کے بعد کا حال ہوتا ہے..

پر ایسا بھی نہ ہوا..

اس سے برعکس ہوا..

میرا بدن لطیف ہو گیا..

کونج کے اُس پَر کی مانند ہلکا اور لطیف ہو گیا جو پرواز کی تیزی کے دوران اُس کے گرم جثے سے الگ ہو کر.. کونج کہیں آگے چلی جاتی ہے اور وہ ہولے ہولے جھولتا ہوا کے دوش پر ہلکورے کھاتا آسمان سے نیچے آتا ہے..

جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے..

ہاں! قرار ہی وہ ایک لفظ ہے جو میری اُس کُل کیفیت کو بیان کرنے پر قادر ہے..

میں ایک حالتِ قرار میں تھا..

تر و تازہ.. اوس میں بھیگی ایک کونپل کی مانند..

بے شک جب میں اُس حالتِ بے قراری میں مبتلا تھا.. میں اُس کے انبساط میں تھا.. ہیجان کے باوجود کسی ڈر میں نہ تھا.. لطف اندوز ہوا تھا.. لیکن میں اُس کیفیت کو دوہرانے کی.. اُس میں پھر سے مبتلا ہونے کی کوئی خواہش نہ رکھتا تھا.. اگر بڑے سے بڑے دنیاوی انعام کی پیشکش بھی رد کر دیتا.. میں

اُسے دوبارہ سہنے کے قابل نہیں رہا تھا..

ایک ہی بار کافی تھا..

بہت دنوں بعد جب میں نے اس سطحی زندگی سے اُکتائی ہوئی.. اس زندگی سے ڈسی ہوئی.. جو بقول اُس کے داتا گنج بخشؒ سے براہِ راست سوال جواب کرتی تھی اور مدینے جا کر بھی اُس کا رابطہ ہوتا تھا.. ایک صوفی منش خاتون سے میں نے غارِ حرا میں جو بیتا تھا اُسے بیان کیا تو وہ کہنے لگیں "انکل.. آپ کیوں شعوری طور پر کوشش کرتے ہیں کہ اُس رات کی لرزش کی توجیہہ کریں.. دلیلیں تلاش کر کے اُسے منطق کی رُو سے ثابت کریں.. جو کچھ آپ پر بیتا ہے اُسے ایک رگ کے دبنے یا پٹھوں پر زور پڑنے کے کھاتے میں ڈال دیں.. آپ یہ کیوں نہیں مان لیتے کہ یہ ایک محض جسمانی نہیں روحانی واردات تھی۔"

بھلا میں ماننے والا کہاں تھا..

ہاں! قرار ہی وہ ایک لفظ ہے جو میری اُس کُل کیفیت کو بیان کرنے پر قادر ہے..

وجود کی تر و تازگی اور ہیجان سے یکسر آزاد ہونے کی کیفیت نے میرے اعصاب کو یوں سکون دیا کہ میرے ہونٹوں پر ایک بے وجہ مسکراہٹ آ گئی.. یہ کیا تھا.. میرے اندر پہلے سے کچھ موجود تھا.. رگوں میں تیرتے پھرتے لہو کے سوا بھی کچھ تھا جس سے میں آگاہ نہیں تھا.. میرا ہاتھ اُس مقام پر ٹھہرتا تھا تو اُس "کچھ" کا کسی اور "کچھ" سے رابطہ ہو جاتا ہے.. تاریں مل جاتی تھیں اور سرکٹ مکمل ہو جاتا تھا.. اور یوں ان دونوں کے ملنے سے کوئی انہونی انرجی جنم لیتی تھی جو میرے بدن کو گرفت میں لے کر اُس میں دوڑنے لگتی تھی.. کیا یہ توجیہہ ہو سکتی ہے..

میرے اعصاب آرام میں آئے.. باگیں ڈھیلی ہوئیں تو میں سست ہو گیا.. جیسے شدید سردیوں میں گرم شاور کے بعد ہلکی سی غنودگی طاری ہونے لگتی ہے..

چاند اب ڈوبنے کے ڈھل جانے کے کسی ایسے زاویے پر تھا کہ میرے عین اُوپر جو ایک مختصر شگاف تھا اُس پر سے چاندنی نے اپنی ردا سمیٹ لی تھی اور وہ تاریک ہو چلا تھا.. اُس میں سے کبھی کبھار کچھ ہوا اترتی تھی تو اُس کی موجودگی کا موہوم سا احساس ہوتا تھا.. میں نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور اونگھ میں چلا گیا..

اُس لمحے وصال یا تین کے درمیان کی رات تھی..

کتنی ہی دیر تک میں غفلت اور آسودگی میں پاؤں پھیلائے پڑا رہا..

مکمل غفلت میں پھر بھی نہیں.. کہ نیند کی مدہوشی سے مکمل طور پر آشنا تو اس رات میں کبھی نہ ہوا.. لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا..

خیال بابا کے گھر میں رات کرنے کا.. اور بابا کا.. ان سے غافل نہیں رہا..

کچھ دیر تک میں اُس نیم غفلت میں مبتلا رہا.. جس میں آپ کی آنکھیں نیند میں اُترنے سے گریز کرتی ہیں لیکن بوجھل ہوتی جاتی ہیں.. صحن میں سے جو خفیف سی ہوا آ رہی تھی اُس میں واضح طور پر ٹھنڈک کے آثار تھے.. صبح ہونے میں ابھی بہت دیر تھی لیکن اُس کی ٹھنڈک کے سندیسے آنے لگے تھے.. کچھ اندازہ نہیں کہ اس حالتِ قرار میں کتنے پل بیت گئے.. شاید بیس پچیس منٹ گزرے ہوں گے جب اس ملکوتی سناٹے اور چپ میں میرے کانوں میں ایک عجیب سی ناقابلِ فہم آواز آئی.. ایک سرسراتی رگڑ کھاتی.. کبھی رُک جاتی کبھی کھڑکھڑاتی رواں ہوتی کوئی ایسی آواز جس سے میرے کان واقف نہ تھے.. کیا جبلِ نور کے چھپر تلے کوئی جانور پلاسٹک کی بوتلوں اور خالی ڈبوں پر چلتا ہے.. یا کوئی پرندہ ہے جو غارِ حرا کی چھت کی سلوں کو چونچ سے کریدتا ہے.. عام حالات میں اور ایسے مقام پر میں یقیناً دہشت زدہ ہو جاتا.. سراسیمہ ہو جاتا کہ یہ پتہ نہیں کیا آفت ہے.. لیکن میں مکمل قرار میں تھا' مکمل ایمان میں تھا کہ اس گھر میں اس غار میں کوئی آفت کوئی بلا آ ہی نہیں سکتی.. میں ایک ایسی پناہ میں ہوں.. آواز کچھ دیر کے لیے تھم گئی اور پھر وہی گھسٹتی ہوئی کسی کنوئیں کی تہہ میں سے برآمد ہونے والی عجیب سی صدا آنے لگی..

ظاہر ہے مجھے تجسس تھا کہ یہ ہے کیا..

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا.. آواز صحن میں سے آ رہی تھی.. میں نے ٹٹول کر ٹارچ تلاش کی.. اُسے جلایا لیکن صحن میں نہیں گیا غار کے دہانے پر کھڑا ہو کر اس کی روشنی کو جبلِ نور کی چوٹی کی جانب کیا.. وہ اتنی بلندی تک گھنی حالت میں جانے سے قاصر تھی.. پھیل گئی اور کچھ واضح نہ ہوا.. اُس کی روشنی کو نیچے لایا تو چٹان کے برابر میں نیاز کو حسبِ سابق مدہوش پڑے دیکھا..

میں صحن میں آ گیا.. ذرا غور سے کان لگا کر سنا تو یہ نامانوس اور کھردری آواز سُرنگ کی تاریکی میں سے آ رہی تھی اور قریب آ رہی تھی.. میں نے ٹارچ کا رُخ سُرنگ کی جانب کر دیا.. اُس کی روشنی میں بڑی چٹان واضح نظر آنے لگی..

چند ساعتوں کے بعد سُرنگ کے اتھاہ اندھیارے میں سے ایک انسانی پیکر نمودار ہوا.. اور صحن میں قدم رکھتے ہی میری ٹارچ کے روشن دائرے کی زد میں آ کر نمایاں ہو گیا.. اُس کے ہاتھ میں ایک بڑا شاپر بیگ تھا جس میں [illegible] جنہیں وہ سُرنگ میں گھسیٹتا ہوا ساتھ لایا تھا.. یہ

آواز اسی شاپر بیگ کے پتھروں سے لگنے اور گھسٹنے کا کرشمہ تھی.. وہ شخص ایک چیک قمیض اور پتلون میں ملبوس تھا' اُس کے بال گھنگھریالے اور سیاہ تھے' نوجوان لگتا تھا.. وہ صحن میں قدم رکھتے ہی جب میری ٹارچ کی روشنی میں آیا تو ٹھٹک گیا.. آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر یہ تعین کرنے کی کوشش کی کہ اس روشنی کا منبع کہاں ہے..

میں نے ٹارچ بجھا دی تو وہ مکمل طور پر تاریکی میں مدغم ہو گیا..

وہ پچھلے چھ سات گھنٹوں کے دوران پہلا ذی روح تھا جو میری تنہائی میں مُخل ہوا تھا.. میری غار کے صحن میں بن بلائے آ گیا تھا..

مجھے صرف یہ خدشہ تھا کہ کہیں وہ پولیس سے متعلق نہ ہو اور مجھے بے دخل کرنے نہ آ گیا ہو اس کے سوا مجھے اُس سے کچھ خوف نہ آیا..

میں نے پہلے تو بلند آواز میں... السلام علیکم پکارا اور پھر غیر شعوری طور پر انگریزی میں پوچھا...

ہُو آر یُو؟

میں تاریکی میں بھی اندازہ کر سکتا تھا کہ میری آواز سُن کر وہ شخص یکدم خوفزدہ ہو گیا ہے... کچھ نہ بولا بُت بنا کھڑا رہا.. شاپر بیگ ہاتھ میں لٹکائے.. میں اُس کی جگہ ہوتا تو خوف کی حالت میں بُت بنا کھڑا نہ رہتا بلکہ چیخیں مارنے لگتا کہ آپ رات کے اس پہر تن تنہا تاریک سُرنگ میں سے برآمد ہو کر غارِ حرا کے نیم تاریک صحن میں قدم رکھتے ہیں تو ایک تیز روشنی آپ کی آنکھوں کو چندھیا دیتی ہے... پھر یکدم بجھ جاتی ہے اور پھر اندھیرے میں سے کوئی شخص یا بھوت پریت شاید آپ کو بلند آواز میں السلام علیکم کہتا ہے اور پھر انگریزی بولنے لگتا ہے تو آپ کا ردِ عمل کیا ہو گا..

اُس نے اپنا شاپر بیگ زمین پر رکھ دیا لیکن آگے نہیں آیا وہیں کھڑا رہا اور تب میں نے ایک اور زوردار السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ بلند کیا اور اُس کے قریب ہو گیا.. وہ ذرا پیچھے ہوا اور پھر ذرا جھجکتے ہوئے وعلیکم السلام کہا اور پھر بہ زبان فارسی کچھ گویا ہو گیا.. اور خاصا باتونی ہو گیا لیکن پھر بھی میرے نزدیک ہونے سے گریز کرتا رہا..

میں نے ماسٹر دین محمد قصائی سے سیکھی ہوئی.. است معنی ہے اور بُود معنی تھا قسم کی شدھ فارسی سے کام چلانا چاہا لیکن نہ چلا.. پھر میں نے انگریزی آزمائی اور وہ کچھ ہوں ہاں کرنے لگا اور پہلا فقرہ جو مجھے سمجھ آیا وہ یہ تھا.. کہ آغا تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا.. اور پہلا فقرہ جو میں نے اُسے سمجھایا وہ یہ تھا کہ ہائے ہائے لیکن آغا تم نے مجھے اپنے شاپر بیگ کو سُرنگ میں گھسیٹتے ہوئے زیادہ ڈرایا تھا..

اور دوسرے فقرے کے لیے میں تیار تھا.. "آغا آپ یہاں.. رات کے اس پہر کیا کر رہے

ہیں؟'' پہلے تو سوچا کہ اس کے جواب میں ایک داستانوی توجیہہ پیش کی جائے کہ آغا میں تو غارِ حرا کا رکھوالا ہوں.. سُرنگ کے باہر بیٹھ کر لوگوں کو راستہ دکھاتا ہوں.. چودہ سو برس سے یہیں ہوں.. بابا آتے تھے تو اُن کے لیے سُرنگ کو روشن کرنے کی سعی کرتا تھا لیکن اُن کے منور وجود کے سامنے میری ٹارچ بجھ جاتی تھی.. میں نے اُنہیں ایک چکن سینڈوچ بھی آفر کیا تھا اور اُنہوں نے میری دودھ کی بوتل سے ایک گھونٹ بھرا تھا اور شب بھر میں بھی اُس میں سے گھونٹ بھرتا رہا ہوں اور وہ ابھی تک بھاری ہے.. دودھ ختم ہونے میں نہیں آ رہا.. یقین نہ آئے تو غارِ حرا کے داخلے کے دائیں جانب جو پتھر ہے اُس پر رکھی ہے خود چیک کر لو.. میں نے یہاں کیا کرنا ہے.. میں تو یہیں ہوتا ہوں..

لیکن یہ تو میرے تصور تھے.. میری خوش فہمیاں تھیں اس لیے یہ داستان سنانے سے گریز کیا اور صرف اتنا کہا... نے فہمیدم... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں..

وہ ظاہر ہے ایک ایرانی تھا.. رضا علی!

تہران کے خمینی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر ایک ڈاکٹر تھا.. اور عام ایرانیوں کے مقابلے میں خاصا خوش شکل تھا..

یہ نہیں کہ وہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا اپنا شاپر بیگ گھسیٹتا سُرنگ میں سے باہر آیا تھا.. اُس کے ہاتھ میں بھی ایک ٹارچ تھی جو اُس نے میری ٹارچ کی روشنی میں آنے پر ہراساں ہو کر بجھا دی تھی..

اگرچہ وہ مخل ہوا تھا..

ایک بن بلایا مہمان تھا..

جسے میں نے گھر بنا لیا تھا اُس گھر میں آ گیا تھا لیکن اُس کی غیر متوقع آمد نے مجھے مسرت سے دوچار کیا.. بے شک یہ غارِ حرا کی کم کم نصیب میں آنے والی تنہائی تھی لیکن میں اس تنہائی میں کسی اور کی آمد کی خواہش رکھتا تھا کہ کوئی آئے اور میں اُس سے باتیں کروں.. غارِ حرا کے پتھروں سے کب تک باتیں کروں.. کوئی انسان آئے اور میں اُسے شریک کروں..

میں نے سب سے پہلے اس ایرانی مہمان کو ایک ایسی پیشکش کی.. جو روئے زمین پر اُس لمحے میں ایک یکتا پیشکش تھی.. بے شک کوئی نصف دنیا پر راج کرنے والا ہو لیکن وہ بھی ایسی پیشکش کی ہمسری نہ کر سکتا تھا.. آغا آپ آئیے.. غارِ حرا کے فرش پر میرا مصلے بچھا ہوا ہے.. آپ اطمینان سے جی بھر کے وہاں نفل ادا کیجیے.. اور پھر بے شک سویر تک وہیں قیام کیجیے.. میں صحن میں بیٹھ جاؤں گا..

رضا علی نے شکریے کے طور پر فارسی میں کوئی قصیدہ سا پڑھا..

غار میں داخل ہوا سر جھکا کر دو نفل ادا کیے اور سلام پھیر کر باہر آ گیا..

میں فراخ دل ہو چکا تھا.. غار میں جو کچھ میں نے کمانا تھا کما چکا تھا.. اس لیے فراخ دل ہو چکا تھا.. کہ اس شخص کے جذبے کی شدت تو مجھ میں نہ تھی کہ وہ رات کے اس پہر جبل نور کی چڑھائی پر جانے کن مصیبتوں اور کٹھنائیوں سے دوچار ہوتا اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا یہاں تک آن پہنچا تھا تو اُسے اُس کا حصہ ملنا چاہیے تھا..

''رضا.. پلیز آپ غار میں بیٹھے رہیے.. عبادت کیجیے.. میں اپنا مصلے صحن میں بچھا لیتا ہوں..''

تو ڈاکٹر رضا علی کہنے لگا.. اُس کے بال گھنگھریالے اور سیاہ تھے' وہ خوش شکل تھا یہ میں ٹارچ کی روشنی میں جان چکا تھا لیکن اب تاریکی میں اُس کے خدوخال دکھائی نہ دیتے تھے اور میں صرف اُس کی دھیمی اور سلجھی ہوئی آواز سُن سکتا تھا.. فارسی اور انگریزی سے جنم لینے والی آواز میں... ''نہیں برادر.. آپ کو فوقیت حاصل ہے.. آپ پہلے آئے..''

''میں بہت بیٹھ چکا.. آپ بیٹھیے..''

''نہیں برادر... اس غار سے بڑھ کر یہاں ایک اور مقام ہے' جس کی چاہت میں میں یہاں اس سے آیا ہوں.. میں وہاں جاؤں گا''

''ہالے ہالے..'' میں نے یونہی سر ہلا کر تائید کی لیکن دل میں کہا کہ رضا علی اس مقام سے بڑھ کر اور کون سا مقام ہو گا.. کیا آسمان پر جاؤ گے..

''اس غار کی چھت پر.. جبل نور کے آخری سرے پر.. جہاں سے وادیٔ مکہ کے درمیان خانہ کعبہ روشن نظر آتا ہے.. یہ پوری وادی میں سب سے بلند ترین مقام ہے تو میں جب وہاں بیٹھتا ہوں تو وہاں اللہ میرے قریب ہو جاتا ہے.. سامنے اُس کا گھر ہوتا ہے اور اُوپر وہ ہوتا ہے.. یہاں رسولؐ نزدیک ہے اور وہاں اللہ.. میں وہاں بیٹھوں گا'' میں جب اپنے آبی دباؤ سے مجبور ہو کر اُوپر گیا تھا تو میں نے بھی وہاں ایک قربت محسوس کی تھی.. غارِ حرا کی چھت پر.. آسمان نیچے آتا لگتا تھا..

''ویسے آپ کے شاپر میں کیا کیا ہے جو پتھروں پر لگنے سے شور کرتا تھا''

''یہ شاپر اُسے شور کرتا تھا.. ورنہ کچھ شور نہ تھا.. ایک سویٹر ہے.. منرل واٹر کی دو بوتلیں ہیں.. جوس کا ایک ڈبہ ہے.. ایک خصوصی ٹارچ ہے اور قرآن پاک ہے''

رضا علی اب یارِ غار ہو چکا تھا.. بے تکلف یار ہو چکا تھا اور ہم ملی جلی فارسی اور انگریزی میں نیاز کی موجودگی سے بے نیاز باتیں کرتے تھے..

ویسے مجال ہے اس دوران نیاز نے ایک کروٹ بھی بدلی ہو..

''میں دوسری بار سعودی عرب آیا ہوں.. پہلی بار دن کی روشنی میں ہزاروں زائرین کے ہمراہ

جبل نور کی چوٹی پر ہانپتا سانس کھینچتا پہنچا.. یہاں اتنا ہجوم اور شور تھا کہ غار حرا نظر نہ آتی تھی لوگ نظر آتے تھے.. میری کچھ تشفی نہ ہوئی تو اگلی شب رات کے اس پہر میں جبل نور کے دامن میں آیا.. میں نہیں جانتا تھا کہ تاریخ کی روشنی میں میں اُوپر تک پہنچ سکوں گا یا نہیں.. شاید پابندی ہو اُوپر جانے پر.. اور اگر پہنچ گیا تو کیا پتہ وہاں سعودی شرطے تعینات ہوں جو مجھے کافر جان کر گرفتار کر لیں کہ سعودی ہم ایرانیوں کو برداشت نہیں کرتے.. لیکن جب میں یہاں آیا.. تو یہاں کوئی نہ تھا.. رات کا یہی پہر تھا.. میں نے غار میں عبادت کی.. اور پھر یہیں سے.. صحن سے ہی چٹانوں پر قدم جماتا اُوپر چلا گیا.. غار کی چھت پر.. اور وہاں اللہ موجود تھا.. اتنا قریب تھا کہ میں اُس سے کلام کر سکتا تھا.. یہ پچھلے برس کا قصہ ہے.. اس برس آیا ہوں تو ایک بار پھر دن کی روشنی میں چند روز پیشتر آیا.. اور پھر ہجوم کی یلغار میں تشفی نہ ہوئی.. تو آج رات پھر آ گیا ہوں.. لیکن برادر تم نے مجھے بہت ڈرا دیا تھا.."

"تم نے مجھے زیادہ ڈرا دیا تھا" میں نے پھر کہا..

"ویسے میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں کہ تم شب بھر یہاں ٹھہرے رہے ہو... میں تو اس غار میں دو نفل ادا کرنے کے بعد ٹھہر نہیں سکتا.. تم یہیں ٹھہرو.. میں اُوپر جاتا ہوں"

رضا علی مجھ سے رُخصت ہوا اور غار کے دہانے کے برابر میں جو چٹانیں بلند ہوتی تھیں اُن پر جانے کیسے قدم جماتا.. اپنے شاپر بیگ سمیت اُوپر چلا گیا.. کہ اُس کے مطابق اُوپر اللہ تھا.. اور نزدیک تھا.. میں پھر تنہا ہو گیا..

ہمت والا تو رضا علی تھا جو تن تنہا رات کے اس پہر جبل نور کی مشکل اور کسی حد تک خطرناک چڑھائی چڑھ کر آیا تھا اور پھر بے خطر تاریک سُرنگ میں داخل ہو کر صحن میں آ نکلا تھا.. میں تو سرِ شام یہاں آن پہنچا تھا اور نیاز کی منت سماجت کر کے اُسے یہاں سونے پر راضی کیا تھا.. وہ یقیناً ایک نڈر شخص تھا اور اُس کا ایمان میری نسبت کہیں مضبوط تھا..

میں بھی غار کے اندر جا بیٹھا.. کچھ دیر بیٹھا اور پھر نفل ادا کرنے کے لیے نیت کرنے کو تھا تو سوچا کہ صرف ایک وضو تو شب بھر کے لیے قائم ہونے سے رہا تو ایک بار اور کر لینے میں کچھ مضائقہ نہیں..

رضا مجھے منرل واٹر کی ایک بوتل تحفے کے طور پر دے گیا تھا.. میں اُسے کام میں لایا..

میں نفل ادا کرنے لگا، اپنی توجہ کو مرکوز کرنے لگا، محو ہوا اور کچھ دیر کے لیے فراموش کر دیا کہ میں کہاں کھڑا رہا ہوں... میں کہیں بھی ہو سکتا تھا.. اپنے گھر میں 'سنو لیک' پر، گاؤں کی مسجد میں، کہیں بھی.

قرأت کی آواز آنے لگی، غار حرا کے سکوت میں رضا علی کی قاری لہجے سے لبریز قرأت میرے آس پاس

گونجنے لگی.. اس میں اتنی دلجمعی شدت اور محبت تھی کہ میری توجہ بھٹک گئی..

آپ ہی منصف ہو جائیے کہ رات ہو.. غار حرا میں ایک رات ہو آپ تنہا ہوں اور اُس رات میں کوئی شخص غار کی چھت پر بیٹھا اور وہ بھی تنہا ہو خوش الحانی سے قرآن کا ورد کر رہا ہو تو کیا آپ بھی بھٹک نہ جائیں گے.. ایک ایسا قاری جو غار حرا میں قیام کرنے پر ترجیح دیتا ہو اس کی چھت پر بیٹھ کر اپنے سامنے خانہ کعبہ کو دیکھتے ہوئے.. اپنے آپ کو فراموش کر کے جبل نور کی بلندی پر اللہ تعالیٰ کو اپنی شہ رگ سے بھی نزدیک محسوس کرتے ہوئے قرأت کرنے کو..

حضورؐ سے کسی نے کہا کہ ایک شخص ایسا ہے جو قرآن پاک کی قرأت اس انداز اور جذبے سے کرتا ہے جیسے وہ اس پر اُتر رہا ہو.. اور یہ شکایت کے لہجے میں کہا گیا.. آنحضرتؐ نے دریافت کیا کہ وہ کون ہے؟... جواب ملا' عبداللہ بن مسعود.. فرمایا' ہاں وہ بے شک ایسا کر سکتا ہے.. مجھے علم نہیں کہ قرأت کے مرتبے کا تعین کیسے کیا جاتا ہے.. اس کے درجات مقرر کرنے کے پیمانے کیا ہیں.. میرے لیے صرف تاثیر اہم ہے.. اور رضا علی کی قرأت میرے دل پر اثر کر رہی تھی اور اس کی تاثیر میں وہ مقام اور وہ تنہائی بھی رس گھولتی تھی..

نوافل سے فارغ ہو کر میں نے سوچا کہ اللہ کی قربت میں بیٹھے ہوئے اُسے اُسی کا کلام سناتے ہوئے اس شخص کے پاس جا بیٹھنا چاہیے.. غار سے باہر آ کر میں نے بائیں ہاتھ پر بلند ہوتے عمودی پتھروں پر ایک تفصیلی نگاہ ڈالی جن پر رضا علی ابھی پاؤں جماتا آسانی سے اُوپر چلا گیا تھا اور پھر بجھ گیا کہ نہیں یہ میرے بس کی بات نہیں میرے بدن اور برسوں کے بس کی بات نہیں..

مجھے اُس لمحے خیال آیا کہ شاید رضا مکمل تنہائی کا متمنی ہو' وہ کسی اور کی موجودگی کی خواہش نہ رکھتا ہو.. براہِ راست اُس سے باتیں کرنا چاہتا ہو یکسر تنہا.. تو میں رُک گیا' صحن میں کھڑا' اُوپر سے اُترتے حروف کو اپنے کانوں میں اُترنے دیا اور عجیب خمار میں آ گیا..

قرأت میں وقفہ آیا تو مجھ سے نہ رہا گیا..

میں نے اُسے پکارا "رضا... میں آ جاؤں؟"

تاریکی میں اُس کا ہیولا سا دکھائی دیا.. وہ نیچے جھانک رہا تھا.. پھر اُس نے اپنا ہاتھ بڑھایا

"آ جاؤ"

"نہیں.. یہاں سے نہیں"

"میں تمہیں تھامتا ہوں.. آ جاؤ"

"نہیں میں گر جاؤں گا.. میں صراطِ مستقیم سے آؤں گا" میں نے ہنس کر کہا..

وہ پھر تاریکی میں چلا گیا.. اور قرأت کی آواز دوبارہ بلند ہونے لگی..

میں اپنی ٹارچ کی مدد سے سُرنگ کے آشنا اور دوست پتھروں میں سے ہوتا ہوا بابا بنگالی کے چھپّر تلے نمودار ہو کر گھاٹی کے ساتھ قدم دھرتا پتھروں پر چڑھتا رضا کے پاس آ گیا جو قرآن پڑھنے میں مگن تھا..

اندھیرے کے سیاہ برش سے پینٹ کی ہوئی یہ ایک عجیب تصویر تھی.. اس میں آس پاس کی چٹانیں اور پس منظر تاریک تھا لیکن قرآن پر جھکا ہوا ایک چہرہ روشن تھا قرآن کے اوراق روشن تھے اور اُن کے سامنے وادیٔ مکّہ کی سیاہی کے بیچ اللہ کا گھر روشن تھا..

میں جان بوجھ کر قرآن پاک اپنے ہمراہ نہ لایا تھا کہ قیام تو رات میں ہے.. تاریکی میں پڑھنا تو ممکن نہ ہوگا اس لیے نہ لایا تھا..

لیکن رضا علی مجھ سے سیانا تھا..

وہ اُس شدت تاریکی میں کہ چاند تقریباً بجھ چکا تھا.. قرآن کھولے.. اپنی گود میں رکھے اس کے اوراق پر ایک خصوصی اور تیز روشنی والی چھوٹی سی ٹارچ جمائے' آنکھیں تقریباً ٹارچ کے ساتھ لگائے بڑی آسانی سے پڑھ رہا تھا..

بعد میں اُس نے مجھے بتایا کہ یہ ٹارچ اُس نے بہت چھان بین کر کے اسی مقصد کے لیے خریدی تھی..

مجھے اس کا خیال نہ آیا تھا ورنہ غارِ حرا میں بیٹھ کر قرآن پڑھنا بھی تو کیسا کیف ہوتا..

میں دم روکے اُس کے قریب بیٹھا رہا اور وہ سر ہلاتا بلند آواز میں قرآن پڑھتا رہا..

مجھے کہیں کہیں سے کسی آیت کا کوئی حصہ سمجھ میں آ جاتا.. تو میرے بدن سے ایک سرسراہٹ سی چھونے لگتی.. جیسے تتلیوں کے ایک غول کے پَر چھوتے ہوں..

اُسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے قریب آ بیٹھا ہے.. مجھے دیکھ کر اس نے ٹارچ بجھا دی..

"اُوپر آسمان کی طرف دیکھو" وہ کہنے لگا "یہ وادیٔ مکّہ میں سب سے قریب ترین آسمان ہے.. یہاں اللہ نزدیک نہیں ہوگا تو اور کہاں ہوگا"

"تم پڑھتے جاؤ.. میں سننا چاہتا ہوں"

"نہیں.. میں جسے سنانا چاہتا ہوں اُسے سنا رہا تھا.. تمہاری موجودگی میں نہیں سنا سکتا.. اب تم آ گئے ہو تو میں اور تم اپنے گھر والوں کی باتیں کرتے ہیں کون ہو.. روزگار کا وسیلہ کیا ہے.."

چاند ڈھلتا ہوا.. وادیٔ مکّہ کی اُن پہاڑیوں میں روپوش ہونے کو تھا جن میں سے کسی ایک میں غارِ ثور تھا..

میں نے وہاں تک جانے کا بھی تہیہ کر رکھا تھا لیکن اطلاع ہوئی کہ بلندی تک پہنچنے کے لیے ایک سڑک تعمیر ہو رہی ہے اس لیے راستہ فی الحال بند ہے.. اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ غارِ حرا کی چڑھائی بہت کٹھن ہے لیکن طویل نہیں جب کہ غارِ ثور کا راستہ نسبتاً زیادہ ہے مگر آسان ہے..

میں نے محسوس کیا کہ رضا مجھ سے گفتگو تو کر رہا ہے لیکن وہ میرے دھیان میں نہیں ہے.. قرآن تھامے وہ مجھ سے باتیں تو کرتا ہے لیکن کبھی اُوپر آسمان کی جانب نگاہ کرتا ہے اور کبھی روشن کعبے کو نظروں میں لاتا ہے.. وہ تخلیہ چاہتا تھا.. کسی اور کی موجودگی میں اللہ سے باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا.. میں نے کوئی بہانہ کیا اور اُنہی قدموں پر اپنی غار میں لوٹ آیا..

نیاز.. بے نیاز تھا.. صحن کا ایک بالکل مختصر سا حصّہ بجھی ہوئی چاندنی کی زد میں تھا.. باقی تمام جبلِ نور کی چٹان کے سائے میں جا چکا تھا..

میں صحن کی جانب چہرہ کیے آلتی پالتی مار کر مصلّے پر براجمان ہو گیا..

دودھ کی بوتل.. ٹارچ اور جوگرز کے درمیان دھری تھی اور اس کا پلاسٹک نمایاں نظر آتا تھا..

بھوک تو نہیں لیکن پیاس.. حلق سُوکھ رہا تھا..

میں جن کیفیتوں میں سے گزر رہا تھا.. تجربے کے جن جہانوں کی سیر کر رہا تھا اور جن کائناتوں کا مشاہدہ کر رہا تھا' اُن میں سے کوئی ایک کیفیت' کوئی ایک جہان اور بس ایک کائنات ہی کافی تھی عمر بھر کے لیے پیاسا رکھنے کے لیے.. ہیجان در ہیجان کا اثر تھا کہ میرا حلق سُوکھ رہا تھا..

میں نے دودھ کی بوتل کا ڈھکن کھول کر اس کے مُنہ سے مُنہ لگا کر تین چار آبشار گھونٹ بھرے.. ٹھنڈک اور سفیدی کو اپنے بدن کے صحرا میں سرایت کرتے محسوس کیا.. اب حساب کرتا تو جتنا دودھ میں پی چکا تھا اس بوتل کو کب کا خالی ہو جانا چاہیے تھا.. اور وہ نہ ہوئی تھی.. کیوں نہ ہوئی تھی.. اس میں اس غار کے پتھروں نے بھی کچھ برکت بھر دی تھی کہ میں ان کا بھی تو مہمان تھا اور یہ میزبان پتھر نہیں چاہتے تھے کہ جب تک میں اُن کے ہاں قیام کرتا ہوں یہ ختم ہو جائے.. یہ آدابِ میزبانی کا تقاضا تھا کہ مہمان پیاسا نہ رہے.. اور وہ پتھر یہ بھی جانتے تھے کہ جو بھی اُن کا مہمان ہوا کرتا تھا اُس نے بھی اس بوتل سے ایک گھونٹ بھرا تھا..

دکانوں میں سے سفر کرتی چاندنی بھی مدھم تھی اور اُس کے جزیرے بجھے سے تھے.. پہلے کی مانند پتھروں کی کھردری سطح کو نمایاں کرنے میں ناکام ہو رہے تھے..

اور وہ تعداد میں گھٹ بھی چکے تھے..

صرف تین باقی تھے بقیہ چاند کے ڈھلنے سے ڈھل چکے تھے' رُخصت ہو گئے تھے..

یہ دھبے غار کی کائنات میں آہستہ رو سیاروں کی مانند حرکت کرتے رہے تھے اور اب وہ کسی اور مدار میں چلے گئے تھے' روپوش ہو گئے تھے.. اگرچہ میرے بدن پر باقی تھے..

وہ.. جو چھت پر بیٹھا تھا' رضا علی' وہ پھر سے ہم کلام ہو گیا.. قرأت کی مدھر راگنی چھت سے ڈھل کر صحن میں اپنا سحر پھیلاتی غار کے اندر جادو جگانے لگی...

بے شک رضا کی آواز مترنم نہ تھی' نہ ہی وہ مکمل سُر میں تھا.. جیتتا تو کیا وہ قرأت کے کسی مقابلے میں شاید شامل بھی نہ ہو سکتا لیکن جس مقام پر وہ براجمان تھا... وہ جگہ.. اور آسمان کی قربت.. خانہ کعبہ کی ہمہ وقت دید.. اور سب سے بڑھ کر اُس کی دنیا جہان سے بے خبری اور استغراق اُسے ایسا ترنم عطا کرتا تھا' ایسے سُر میں لاتا تھا جو کسی اور قاری کے نصیب میں کہاں تھا۔

دُنیا بھر میں کتنے قاری ہوں گے جنہوں نے یوں غارِ حرا کی چھت پر کسی تاریک رات میں ایک ٹارچ کی روشنی میں قرآن پڑھا ہو گا.. وہاں پڑھا ہو گا جہاں پڑھنے کا حکم آیا تھا اور جہاں اس اُمّ الکتاب کا پہلا حرف نازل ہوا تھا..

میں بھی اُسی بے خبری میں جا چکا تھا.. اُسی عالم استغراق میں تھا.. رضا سے الگ نہ تھا.. اور کبھی میں بھول جاتا کہ اس کلام اور میرے درمیان رضا ہے.. اُن لمحوں میں معاملہ براہِ راست ہو جاتا.. یہی محسوس ہوتا کہ یہ آسمانی کلام آسمان سے مجھ پر ہی اُتر رہا ہے..

کیا یہ جادوگری عربی زبان میں ہی ممکن تھی.. یہ تاثیر صرف اسی زبان کی مرہونِ منت تھی.. اگر یہ کسی اور زبان میں' فرانسیسی میں' سندھی یا پنجابی میں اُترتا.. کہ ایک عظیم صوفی شاعر سے جب یہ دریافت کیا گیا کہ آپ تو ہفت زبان ہیں تو پنجابی میں ہی کیوں کلام لکھتے ہیں تو اُنہوں نے کہا.. اس لیے کہ پنجابی میں اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنے میں آسانی ہوتی ہے..

تو کیا فرانسیسی' سندھی' پشتو یا پنجابی میں.. اردو' بنگالی' تالگو یا سواحیلی' چینی یا انگریزی میں بھی قرآن اُترتا تو اتنا ہی پُر اثر اور ہوش رُبا ہوتا.. یقیناً.. بغیر کسی شک کے.. ایسا ہی ہوتا.. کہ یہ زبان نہ تھی اُس کا کلام تھا جو اُس زبان کو پُر اثر اور ہوش رُبا کرتا تھا' قرآن کسی بھی زبان میں اُترتا تو یونہی دل پر اثر کرتا۔

میں پہلے بھی اظہار کر چکا ہوں کہ میں بدقسمتی سے معانی سے کہاں آشنا تھا.. البتہ ترا کیب اور [illegible] کے پَر بدن پر پھڑپھڑانے لگتے تھے.. لیکن یہ

نامکمل سی نا آشنائی اُس کیف کے راستے میں حائل نہ ہوتی تھی.. اُس سرور میں رخنہ نہ ڈالتی تھی.. اُس خمار کو کم نہ کرتی تھی جو رضا کی قرأت مجھ پر طاری کرتی تھی..

ابھی خمار سرمست کرتا تھا اور ابھی یہ ہوا کہ اُتر گیا.. چپ ہو گئی.. غارِ حرا کے پتھر جو میری طرح سرور میں تھے ہوش میں آ گئے..

رضا کی قرأت تھم گئی.. خاموشی چلی آئی..

میں نے صحن میں نکل کر اُسے پکارا ''رضا.. کیا وقت ہوا ہے؟''

اُس کا سایہ چھت پر دکھائی دیا.. پھر اُس کی ٹارچ نے روشن ہو کر اُس کی کلائی پر بندھی گھڑی کو نمایاں کیا.. ''تین بج رہے ہیں''

''آپ.. رُک کیوں گئے ہو.. پڑھ کیوں نہیں رہے؟''

''اب میں سوچنا چاہتا ہوں اُس کے بارے میں جو کچھ میں نے پڑھا ہے..'' اُس نے جواب دیا..

پھر فوراً ہی کہنے لگا اور یہ گفتگو.. ملی جلی فارسی اور انگریزی میں ہو رہی تھی ''تم قرآن پڑھنا چاہتے ہو؟''

''نہیں.. تم پڑھو..''

''میں تو پڑھ چکا ہوں..'' وہ چھت سے آگے ہو کر ایک پتھر پر احتیاط سے اُترا اور جھکا.. اُس کے ہاتھ میں قرآن پاک تھا جسے وہ مجھ تک اُتار رہا تھا ''پلیز آپ پڑھ لو.. یقین کرو میں نے جتنا پڑھنا تھا پڑھ چکا..'' یا اُس نے اس لیے کہا کہ میرے لہجے میں جھجک تھی' یا اُس کی متاع تھی.. اگرچہ میں خواہش کرتا تھا کہ یہاں غارِ حرا میں کچھ تو قرآن پڑھوں لیکن میں اُس کی متاع قبول کرنے سے جھجکتا تھا..

''پلیز..'' اُس نے پھر کہا..

''تو رضا.. تم رہنمائی کرو کہ میں کون سی آیت پڑھوں''

''جو تمہارا جی چاہے.. جہاں سے جی چاہے پڑھو.. یہ قرآن ہے''

''تم کوئی سی آیت نکال دو جو تمہیں پسند ہو.. پلیز''

اُس نے وہیں پتھروں پر قدم جمائے مجھ سے دو چار ہاتھ اوپر قرآن کھولا اُس پر ٹارچ کی روشنی کا دائرہ قریب کیا' ورق اُلٹا گیا' پھر ایک ورق کا کونہ موڑ کر قرآن جھک کر مجھے تھما دیا..

میں اُس کا شکریہ ادا کر کے اپنی غار میں آ بیٹھا.. وہ.. غارِ حرا میں بیٹھ کر رات سے قرآن

پڑھتا.. وہ ارضا کی نشانی قرآن کے آخری صفحوں کے قریب تھی، میں نے اپنی ٹارچ جس کی روشنی پہلے کی نسبت مدھم ہوگئی تھی اُس ورق کے قریب کی.. اقرا باسم ربک الذی خلق O

یہ آیت میں بار بار دوہرا چکا تھا.. پڑھ چکا تھا.. یہ تو ازبر تھی..

میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے رضا کو پکارا "رضا یہ تو میں کئی بار پڑھ چکا ہوں.. کوئی اور آیت؟"

"اس مقام پر یہی پڑھو.. بے شک بار بار پڑھو.. اسی کا اثر ہوتا ہے" اُس کی آواز اُتری.. تو میں نے یہی کیا.. اگرچہ یہ آیت مجھے ازبر ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود ٹارچ کی روشنی میں اور وہ روشنی قرآن کے اوراق سے پھیل کر غارِ حرا کی چھت پر اور آس پاس کے پتھروں کو ظاہر کرتی تھی جب میں سر جھکائے اُسے پڑھتا تھا اور بار بار پڑھتا تھا تو ہر بار یہی محسوس ہوتا تھا کہ پہلی بار پڑھ رہا ہوں..

ہر بار.. پہلی بار ہو جاتی تھی..

میں پڑھ نہیں سکتا تھا اور میرے سامنے ایک ورق ہے جسے پڑھنے کے لیے کہا جاتا ہے اور میں اُسے.. پہلی بار پڑھتا ہوں' کوئی بھی تحریر پہلی مرتبہ پڑھ رہا ہوں۔

پہلی بار میرے سامنے رب کا نام لیا جا رہا ہے کہ اُس کے نام پڑھ..

اور پہلی بار مجھے بتایا جا رہا ہے کہ میری تخلیق کیسے ہوئی..

اور پہلی بار میں آگاہ ہو رہا ہوں کہ اس دنیا میں قلم نام کی بھی کوئی شے وجود میں ہے.. جس کی قسم وہ رب کھاتا ہے.. جس نے ابھی ابھی مجھ سے کہا ہے کہ.. پڑھ!

اقراء.. دوہرا.. اعلان کر..

اور پھر میں نے یونہی ورق گردانی شروع کر دی.. جو ورق سامنے آیا اُسے پڑھنے لگا.. بے شک اس کے مکمل مفہوم سے بے خبر رہا لیکن حرفوں پر نظریں پھیرتا رہا جیسے دیہات میں میرے جیسے اَن پڑھ لوگ قرآن پر صرف انگلیاں پھیرتے ہیں.. میں ایسے ہی حرفوں پر اپنی نظریں پھیرتا رہا..

چاندنی کے صرف دو دھبے پتھروں پر تھے اور وہ بھی مدھم ہو رہے تھے..

رات گزر رہی تھی.. گزر چکنے کو تھی.. فجر کی اذان پانچ بجے کے آس پاس سنائی دیتی تھی اور اب تک یقیناً ساڑھے تین ہو چکے تھے..

جس رات وقت کے جلد گزر جانے کی تشویش تھی اس کے گزر جانے پر تشویش ہونے لگی.. ایک سراسیمگی بدن میں پھیلی کہ سویر ہو جائے گی..

میں نے قرآن پاک بند کیا اور بیٹھ گیا.. اس لیے بھی کہ میری ٹارچ کے سیل کمزور پڑ گئے

جا رہے تھے اور کسی بھی لمحے بے جان ہو سکتے تھے اور اس لیے بھی کہ میں سویر ہو جانے کے خوف میں مبتلا ہو گیا تھا..

اُس لمحے پھر رضا علی کی آواز سنائی دینے لگی..

وہ فارسی میں کچھ پڑھ رہا تھا یا شاید گا رہا تھا.. کچھ الاپ رہا تھا اور اُس کی آواز اس قابل نہ تھی کہ اُس میں کچھ بھی الاپا جا سکے یا گایا جا سکے.. اس سے پیشتر جو وہ خوش الحان اور پُراثر تھا تو یہ قرآن کی جادو بیانیاں تھیں وہ نہ تھا..

میں نے اُس سے مستعار شدہ قرآن سنبھالا اور اُسے سینے سے لگائے غار سے باہر صحن میں آ گیا.. وہی سُرنگ جس میں داخل ہونے سے میرا جی گھبراتا تھا اُسی سُرنگ میں داخل ہو کر ٹارچ جلائے بغیر میں ایک خرگوش کی مانند پتھروں کو اندھیرے میں ٹاپتا چلا گیا جیسے ہر حائل چٹان اور قدموں میں اُبھرے پتھروں کو میں عمر بھر یونہی بنا دھیان دیئے عبور کرتا رہا ہوں.. جیسے بجلی چلے جانے کے باوجود اندھیرے میں اپنے گھر کی ہر میز' ہر صوفے' ہر گلدان اور ہر رکاوٹ سے آگاہ ہوں.. اُن سے ٹھوکر کھائے بغیر بے فکر چلتا ہوں.. پھر بابا بنگالی کے چھپر سے نکل کر عمودی چٹان پر قلانچیں بھرتا رضا علی کے پاس جا پہنچا جو میری آمد سے بے خبر سر جھکائے اپنے الاپ میں مشغول تھا..

"رضا.. شکریہ" میں نے قرآن اُس کے حوالے کر دیا "اب تم یہ کیا گانے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"وہ شرمندہ نظر آنے لگا..

کچھ نہ بولا..

"یہ فارسی میں کیا الاپ رہے ہو؟"

"میری آواز بہت بری ہے.. مناسب نہیں ہے میں جانتا ہوں.."

"لیکن تم جو کچھ بھی پڑھ رہے تھے بہت مگن ہو کر پڑھ رہے تھے.. کیا پڑھ رہے تھے؟"

"ہمارے ہاں ایک گلوکار ہیں محمد رضا افتخاری' میں اُن کی گائی ہوئی ایک نعت رسولؐ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جو مجھے بہت پسند ہے.. مستنصر میری آواز بہت بری ہے"

وہ کچھ زیادہ ہی شرمندہ ہو رہا تھا.. جیسے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہو" لیکن میں کیا کروں.. مجھے وہ نعت یہاں یاد آ گئی تو میں کیا کروں.. میرا جی چاہا کہ اُسے یہاں غارِ حرا کی چھت پر بیٹھ کر اللہ کی قربت میں پڑھوں.. اُسے بھی سناؤں.. اگرچہ میری آواز اس قابل نہیں ہے.."

نہ اُس کی انگریزی اتنی اچھی تھی اور نہ میری فارسی کہ میں اُسے بتا سکتا کہ اس میں شرمندگی کی کوئی گنجائش نہیں.. میں بھی اپنے بابا کے آستانے پر جب پہلی بار حاضری بھرنے کے لیے باب السلام میں داخل ہوا تھا تو درود وسلام کے تسلسل میں بہت سی فلمی نعتیں خارج ہونے لگی تھیں. کبھی "بیچ بھنور میں آن پھنسا ہے دل کا سفینہ شاہ مدینہ" اور کبھی "آیا ہے بلاوا مجھے سرکار نبیؐ سے".. تمہاری تو آواز بری ہے میری تو آواز ہی نہیں ہے ورنہ میں بھی انہیں گانے کی کوشش ضرور کرتا.. تو تم شرمندہ نہ ہو.

"رضا آپ پلیز میرے لیے اس انفتاری کی نعت ضرور پڑھو..اسے گاؤ.. یہ میری فرمائش ہے پلیز.."

رضا کو بھی دراصل کسی ترغیب کی ضرورت نہ تھی' وہ ایک موج کے عالم میں تھا' ایک حضوری کی حالت میں تھا.. اُس کے من مندر میں سے جو آواز اُٹھتی تھی وہ اُسے دبانا نہیں چاہتا تھا.. اظہار کے لیے بے چین تھا.

اور اُس لمحے جب وہ پڑھتا تھا' گاتا تھا..

ہمارے پاس کیا تھا..

کوئی بھی نہ تھا..

رات گئے جبل نور کی چوٹی سے ذرا نیچے پہاڑ کے آخری کنارے پر صرف دو ہیولے تھے.. اور کوئی نہ تھا.. اور اُن کے سامنے وادیٔ مکہ کی نیم تاریکی میں اُس کا گھر منور تھا تاباں تھا.. اُن میں سے ایک گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھا تھا اور دوسرا گاتا تھا.. اور کوئی نہ تھا..

چاند ڈھلنے کو تھا..

ایک ٹھنڈک بھرا جھونکا آیا اور میرے بدن میں سرایت کرتا میرے اندر ہریاول بھرتا مجھے زندہ کر گیا. تھوڑی دیر بعد پھر ہلکی خنکی کی چادر اوڑھے پہلو بدلتی ہوا آئی اور یہ چادر میرے جسم کو چھونے لگی.. یہی موسم تھے.. رات کے اس پہر اگر بابا غار کی تنہائی سے تنگ آ کر اگر بیٹھتے تھے تو ادھر آ کر بیٹھتے تھے کہ یہاں کھلی فضا تھی' ہوا تھی اور سامنے محبوب کی حویلی تھی.. رانجھن کا ڈیرہ روشن تھا. جب تو روشن نہیں ہوتا ہوگا. تاریکی میں ہوتا ہوگا.. شاید چند قندیلیں روشن ہوتی ہوں.. کچھ دیئے جلتے ہوں.. دو چار مشعلیں بھڑکتی ہوں.. اور پھر چٹان کے آخری سرے پر دائیں جانب نیچے.. حرا کے پہاڑ کے دامن میں وہ نظر کرتے ہوں تو اُنہیں اماں خدیجہؓ کے خیمے کے باہر ایک چراغ جلتا نظر آتا ہو.. جسے اماں نے بطور خاص روشن کر کے وہاں رکھا ہوتا کہ بلندی پر ایک غار میں تنہا بیٹھا اُن کا محبوب خاوند یہ جان لے کہ وہ تنہا نہیں ہے...

چاند اضمحلال کی کیفیت میں تھا. تھک چکا تھا اور ڈھلتا جا رہا تھا.

شاید میری حیات کی یہ پہلی مکمل رت جگے کی رات تھی.. میں اونگھ میں چلا گیا.. چند لمحوں کے لیے غفلت میں چلا گیا لیکن اُس کے خیال سے ایک پل کے لیے بھی غافل نہیں ہوا. نیند کی عارضی موت میں مکمل طور پر نہیں گیا اور یہ ماہتاب تو جب سے کائنات وجود میں آئی تھی تب سے سویا نہ تھا.. مسلسل سفر میں تھا اس لیے اب ڈھلنا چاہ رہا تھا..

رضا جس حالت جذب میں تھا اُسے میری خبر نہ تھی..

اور میرا اشتیاق.. عالم شوق کا ایسا تھا کہ میں اُس سے بے خبر تھا..

ہم دونوں ایک دوسرے کی موجودگی سے غافل تھے لیکن ایک ڈور میں بندھے ہوئے تھے..

ہم دونوں ایک ہی شکاری کی کنڈی میں پھنسے ہوئے تھے اور وہ لُک چھپ ڈور کھینچتا تھا.

صرف ایک فرق کے ساتھ کہ رضا تڑپتا بہت تھا اور میں کنڈی میں پھنسا اپنے آپ پر جبر کر کے راضی بہ رضا تھا..

اور رضا تھا جو اپنے جذب میں مجھ سے لاتعلق انفتاری کی نعت پڑھتا' گاتا تھا..

عربی کی نسبت میں فارسی زبان سے زیادہ قربت میں تھا..

چنانچہ کبھی تو مجھے... "عاشقاں را بانغم عشق" کی ترکیب سمجھ میں آ جاتی اور کبھی "شکستہ قلب" کی کیفیت سیدھی قلب میں اُتر جاتی اور پھر مجھے "اگر عشقت گناہ است" کا پورا مصرعہ پلے پڑ جاتا تو میں "واہ جی واہ سبحان اللہ" پکار اٹھتا اور داد کے انداز میں اپنا ہاتھ بلند کر دیتا..

وہ جواب میں شاعروں کی مانند آداب نہ بجا لاتا کہ وہ مجھ سے میری داد سے سراسر غافل اپنے آپ میں غافل تھا..

اور یہ مصرعہ طبلے کی تھاپ پر.. ہارمونیم کی لے پر میرے بدن میں قوالی کرنے لگتا کہ اگر عشقت گناہ است.. گناہ است.. گناہ است.. عشقت عشقت..

بالآخر اُس نے نعت مکمل کی اور جب میری موجودگی سے آگاہ ہوا تو میں نے فرمائش کی رضا یہ اشعار تم مجھے لکھ کر دے سکتے ہو.. یہ مجھے بھول جائیں گے..

"بہ سر و چشم.." وہ بولا "تمہارے پاس کوئی کاغذ ہے؟"

"نہیں.. البتہ ایک قلم ہے جو غار حرا میں رکھا ہے.. کاغذ اس لیے نہیں ہے کہ جب میں یہاں آیا تھا تو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا. تمہارے پاس کوئی ورق ہو تو یہ نعت لکھ دو.."

"تم وہ قلم لے آؤ"

اور میں لے آیا۔۔

''اس نعت کا کیا کرو گے۔۔''

''میں ایک عادی مجرم ہوں۔۔ جہاں جاتا ہوں' جو سفر کرتا ہوں اُس کی داستان بیان کرتا۔۔ روئیداد قلمبند کرنا میرا پیشہ ہے۔۔۔ مجبوری ہے۔۔ لیکن اس کے سوا وہ لطف بھی ہے جو ایسے سفر۔۔ ایسی شب بسری کو بیان کرتے ہوئے مجھے حاصل ہوتا ہے کہ میں اُس کیفیت اور سفر میں سے دوبارہ گزرتا ہوں۔۔ تو جب پڑھنے والے۔۔۔ اس شب کا حال پڑھیں گے تو افتخاری کی نعت کو بھی پڑھنا چاہیں گے۔۔''

رضا علی راضی ہو گیا۔۔ کاغذ کے چند پُرزوں پر۔۔ ایک وزیٹنگ کارڈ پر ٹارچ کی روشنی میں اُس نے چند اشعار لکھے اُس قلم سے جو ابھی ابھی غارِ حرا کے پتھروں سے چھوتا اور لرزتا تھا اور اُس کی رگڑ اُس میں گونجتی تھی۔۔

اگرچہ اُس شب میں نے اس کے لکھے ہوئے حروف آسانی سے پڑھ لیے۔۔ انہیں رضا کے لہجے میں بار بار دوہرا کر اطمینان کر لیا کہ میں انہیں واپسی پر بخوبی پڑھ لوں گا۔۔

لیکن ایسا نہ ہوا۔۔

کاغذ کے پُرزوں اور وزیٹنگ کارڈ پر درج شدہ اشعار جب میں اب ایک برس کے وقفے کے بعد یہ روئیداد قلمبند کرتے ہوئے پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ پڑھے نہیں جاتے۔۔ فارسی رسم الخط اب اجنبی لگتا ہے۔۔

جو پڑھ سکتا ہوں۔۔ محمد رضا افتخاری کی نعت کے شعر جو پڑھ سکتا ہوں وہ کچھ یوں ہیں۔

خدایا عاشقاں را باغم عشق آشنا کن
از۔۔۔۔ دیگر غیر از غم عشقت رہا کن
تو خود گفتی کہ در قلب شکستہ خانہ داری
شکستہ قلب من جانا بہ خود وفا کن۔۔

اور تو خود کہتا ہے کہ تو شکستہ دلوں میں رہتا ہے۔۔
تو میں بھی شکستہ دل ہوں تو جاناں وفا کر اور اس میں آ کر قیام کر۔۔

اور پھر۔۔

اگر عشق گناہ ہے تو میں اس گناہ میں غرق ہو چکا ہوں۔۔

[illegible] کھلے مہر علی کھلے تیری ثنا' ایسی سرشاری اور جذب کے

گہرے سمندر نہیں ہیں لیکن تصور میں یہ لاتا ہے۔۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ انہیں پڑھا کہاں جا رہا ہے۔۔ انہیں کسی مقام پر۔۔ کس رات میں' کیسی بلندی پر۔۔ کیسی یکتا تنہائی میں پڑھا جا رہا ہے۔۔ ویسے اگر غارِ حرا کی رات میں مجھے کہیں سے کسی شخص کی یہ آواز سنائی دے جاتی۔۔ بے شک یہ آواز بے سُری اور بھدی ہوتی ہے کہ۔۔۔ کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا۔۔ تو شاید میں اس کی تاب نہ لا سکتا۔۔ میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکتا۔۔

لیکن اُس رات بخت۔۔۔ شکستہ قلب جانا بہ خود وفا کن۔۔۔ کو سرفراز کرتا تھا۔۔

میں بے شک غارِ حرا کا مکین تھا' اُس میں بسیرا کرتا تھا لیکن میں اُس معراج کو چھو بھی نہیں سکتا تھا جس پر رضا علی کا وجد تھا۔۔

کچھ دیر بعد اُس نے خاموشی اختیار کر لی۔۔

میں بھی چپ بیٹھا رہا۔۔

پھر وہ اپنی کیفیت سے باہر آیا اور کہنے لگا۔۔ مستنصر تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر لو جو کچھ پڑھنا چاہتے ہو ابھی پڑھ لو۔۔ ابھی کچھ دیر بعد فجر ہو جائے گی اور ایرانی زائرین کی یلغار شروع ہو جائے گی اور وہ غارِ حرا اور جبلِ نور پر قابض ہو جائیں گے تو تم نے جو کچھ کرنا ہے کر لو۔۔ جو پڑھنا ہے پڑھ لو!

اُس شب تنہائی میں یہ ممکن تو نہیں لگتا تھا کہ کوئی ایک فرد بھی مخل ہو۔۔ لیکن رضا مجھ سے سیانا تھا اور وہ جو کچھ کہتا تھا وہ مجھے ہوش میں لے آیا کہ وقت کم ہے۔۔ جو کچھ کرنا ہے کر لو۔۔

''اور اب تم کیا کرو گے رضا؟''

''میں کچھ بھی نہیں کروں گا۔۔ خاموش بیٹھوں گا اور آسمان کو تکتا رہوں گا۔۔ کہ رات کے اس پہر لگتا ہے کہ آسمان قریب آنے لگتا ہے۔۔ اور پھر وہ بھی قریب آنے لگتا ہے''

وہ ایک سادھو کی مانند جیسے دھونی رمائے آلتی پالتی مارے غارِ حرا کی چھت پر بیٹھا چہرہ اُٹھا کر آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔۔ پتہ نہیں اُس کے دل میں کیا تھا۔۔ وہ کیا مانگ رہا تھا۔۔ کچھ نہ کچھ تو مانگ رہا تھا اُس سے جو نزدیک آ رہا تھا۔۔ شاید باتیں کر رہا ہو اُس سے دل ہی دل میں۔۔ اور شاید اُسے کوئی جواب بھی آتا ہو۔۔

اگرچہ وارننگ مل چکی تھی کہ فجر کی قربت میں اس تنہائی نے چھن جانا ہے لیکن اس کے باوجود میں رضا کے پاس بیٹھا رہا۔۔ جی نہ چاہتا تھا وہاں سے اُٹھ جانے کو۔۔ خانہ کعبہ سے نظریں ہٹا کر چلے جانے کو۔۔ اس پہر تو وہ مزید واضح ہو رہا تھا کہ آس پاس شہر مکہ میں کم روشنیاں رہ گئی تھیں۔۔ بالشت بھر کھلونا مینار تو دکھائی دے جاتے تھے اور کبھی کبھی گم ہو جاتے تھے اور انہیں پھر سے کچھ دیر آنکھیں مرکوز رکھ کر تلاش کرنا

پڑتا تھا لیکن اُن کے درمیان میں جو صحن تھا وہاں بس کوہِ طور کی جھاڑی میں سے پھوٹنے والی روشنی کی مانند ایک غبار سا تھا اور اُس کے درمیان جو سیاہ کھڑ تھا وہ روشنی کی ذراتی دُھند میں روپوش تھا.. میں نے بہت دیر تک اپنی نظریں اس منور غبار کے اُس مقام پر جمائے رکھیں جہاں میرے حساب سے خانہ کعبہ کو ہونا چاہیے تھا. دیکھتا رہا اُسی ایک مقام پر نظر رکھی... میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ سچ ہوا یا میری توجہ اور تصور نے خواہش کے ساتھ ملاپ کر کے اُسے پل بھر کے لیے تخلیق کر لیا.. کہ پل بھر کے لیے خانہ کعبہ کا سیاہ لبادہ روشنی سے الگ ہو کر نظر آیا اور فوراً تحلیل ہو گیا..

رضا سے کچھ کہے بغیر کہ وہ مگن تھا میں اُٹھا اور غار میں واپس آ گیا..

میں جو کچھ کر چکا تھا اُسے آخری بار دوہرانا چاہتا تھا..

نوافل ادا اتنے کیے جتنی سکت باقی تھی یہاں تک کہ گھٹنے دُکھنے لگے.. کہ مصلے کے نیچے جو سنگریزے تھے وہ میری عاجزی اور عقیدت سے بھی نرم نہ پڑتے تھے.. پھر وہ ساری دُعائیں جو مانگ چکا تھا پھر سے مانگنے لگا.. آل اولاد ماں باپ.. اُن کے ماں باپ.. عزیز و اقارب نزدیکی دوستوں کبھی کبھار کے دوستوں آشناؤں اور ناشناساؤں کے لیے.. اُن پرندوں اور جانوروں کے لیے جو کبھی میرے رفیق رہے تھے.. اور اُن کے لیے بھی جو میری حیات کے آسمان پر ذاروں کی صورت پرواز کرتے تھے.. شمشال کے مرغِ زریں کے لیے.. دریائے سندھ کے سُرخاب اور نابینا ڈولفنوں کے لیے بھی.. اور اُن مناظر کے لیے بھی جنہیں رب نے میری آنکھوں کے لیے تخلیق کیا..

اس کے بعد ہر شے کو پھر سے ہاتھ لگانے اُس کا لمس محسوس کرنے کی تمنا غالب آ گئی..

باہر صحن میں آؤ.. سُرنگ کے دہانے سے چلو.. جن قدموں پر بابا چلتے ہوئے حرا کی جانب جاتے تھے اُنہی قدموں پر چلنے کی کوشش کرو.. غار میں داخل ہوتے ہوئے قدرتی طور پر اُس پتھر پر ہاتھ رکھو.. جس پر اُن کا ہاتھ آیا ہوگا.. سر نیچے کر کے اُس پتھر سے بچو جو جھکا ہوا ہے کہ یہاں وہ بھی جھکتے تھے.. پتھروں کو تھامو.. جہاں جہاں تھاما جا سکتا ہے تھامو کوئی ایک ذرہ بھی ان پتھروں کا اَن چھوا نہ رہ جائے..

صحن کی جانب چہرہ کیے کچھ دیر بیٹھو..

اب صحن کی طرف پشت کر کے غار کے اندرون اپنا رُخ کرو.. اُس کے آخر میں جو شگاف ہے اُسے نظر میں رکھو..

پھر [illegible] اپنے ہاتھ پھیلاؤ کہ جہاں جہاں چھوتے ہیں چھو لو..

اور اس دوران دو مقامات پر خاص توجہ دو..

جہاں تمہاری ہتھیلی میں تھاما ہوا قلم چٹان سے چھوتا تھا تو تمہارا بازو کانپنے لگتا تھا اور پورا بدن لرزش میں آ جاتا تھا.. قلم جل ترنگ بجانے لگتا تھا.. اُس جگہ کے ماتھے پر ایک بوسہ دو..

اور جہاں.. کہیں وہ ثبت شدہ جگہ گم تو نہیں ہو گئی.. جس کے ساتھ ٹیک لگانے سے تمہاری پشت کمر تک اُس میں رفت ہو جاتی تھی.. نہیں وہ جگہ دکھائی تو نہیں دیتی.. نہ ہاتھ پھیرنے سے چٹان میں وہ دبی ہوئی محسوس ہوتی ہے تو تم چٹان کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھو.. پھر ہولے ہولے کھسکتے ہوئے آگے ہوتے جاؤ.. ہاں.. ایسے.. چٹان ہموار ہے.. سطح کھردری ہے.. ہاں.. تمہارے کندھے اور تمہاری پشت کولہوں تک ایک خاص مقام پر قبول کر لی گئی ہے.. یہی جگہ ہے.. ثبت ہو گئی ہے.. کیسا آرام مل رہا ہے.. بدن شگفتگی ہو رہا ہے.. چٹان میں جو نا معلوم سا نیچا تھا اُس میں ڈھل کر کیسا آرام مل رہا ہے.. اب یہاں سے ہٹنے سے پہلے وہاں اپنا ہاتھ رکھ کر جگہ کا تعین کر لو.. اور پھر اپنے ہاتھ کے آس پاس جو نا معلوم سا نیچا ہے اُس پر کچھ دیر کے لیے لب رہنے دو.. سب کچھ دوہرا لیا ہے تو اب کچھ آرام کرو.. تنکی تھیلے کے سرہانے پر سر رکھ کر اطمینان سے لیٹ جاؤ..

سامنے.. غارِ حرا کا صحن چاندنی سے یکسر خالی ہو چکا تھا..

چاند.. ڈھلتا ہوا.. خانہ کعبہ کی جانب اُترتا ہوا.. مدھم ہو چکا تھا.. اور اس کی بجھتی کرنوں اور صحن کے درمیان جبل نور کی چٹانیں آ گئی تھیں اس لیے وہاں تاریکی کے سائے تھے.. اور چاندنی کا صرف ایک جزیرہ.. غار کے اندر سفر کرتا بائیں جانب کی دیوار کے آخری سرے پر چھت کے قریب ٹھہرا ہوا تھا اور ڈوبنے کو لگتا تھا..

بقیہ جزیروں کی رُخصتی سے غار میں جو شگاف تھے جن کے راستے یہ جزیرے اُترتے تھے وہ بھی مدھم ہو رہے تھے..

خوراک کا ذخیرہ شب بھر ساتھ دیتا رہا اب ختم ہونے کو تھا.. دو کھجوریں منرل واٹر کی ایک بوتل اور تھوڑا سا دودھ.. انہیں اُٹھا کر واپس جدہ تو نہیں لے جانا.. کھجوروں نے مٹھاس کی حد کر دی اور دودھ کے گھونٹ ٹھنڈے اور ذائقے میں سفید تھے..

اور پھر میں بالکل خالی الذہن ہو کر بیٹھ گیا.. کہ اب کیا کروں..

یہی بات ہے میں اپنے تمام چاؤ پورے کر چکا تھا.. کوئی حسرت باقی نہ رہی تھی.. کوئی خواہش ایسی نہ تھی جو نا تمام رہی ہو.. میں ایک ایسا مہمان تھا جو ناتواں اور نڈھال آیا تھا.. ایک وسیع دسترخوان پر

آ بیٹھا تھا اور میں نے جی بھر کے تمام نعمتوں سے پیٹ بھرا تھا.. سیر ہو چکا تھا.. اب مجھے یہاں سے.. اُٹھ جانے پر کوئی ملال نہ تھا.. کوئی قلق نہ تھا کہ تھوڑی دیر بعد یہ سلطنت مجھ سے چھن جائے گی..

میں ایک مکمل آسودگی میں پھر سے دراز ہو گیا..

اور مجھے ایک مدت کے بعد احساس ہوا کہ وہاں صحن میں.. کہیں نیاز بھی تو تھا.. پتہ نہیں وہ تھا بھی یا نہیں.. اگر ہوتا تو کبھی تو اُس کی موجودگی کا احساس ہوتا.. شاید رات کے کسی پہر جب میں اونگھ میں تھا وہ اُٹھ کر چلا گیا ہو.. رضا علی نے بھی اُس کی موجودگی کا کچھ تذکرہ نہ کیا تھا.. اُس نے اُسے دیکھا ہوتا تو ضرور دریافت کرتا کہ یہ کون ہے..

میں اُس صحن کو تکتا رہا.. جو میرے گھر کا صحن تھا.. جب سے ہوش سنبھالا تھا تب سے تھا اور لحۂ موجود تک ابھی تک تھا.. میں اس صحن میں کھیلا تھا.. گھٹنوں کے بل رینگتا تھا.. پھر کھڑے ہونے کی کوشش میں کبھی گر جاتا تھا اور کبھی کچھ دیر قائم رہتا کلکاریاں مارتا تھا اور میرے دادا اپنی کھدر کی پگڑی سنبھالتے بازو وا کیے مجھے سہارا دینے کے لیے آگے ہوتے تھے کہ میں کہیں دوبارہ گر نہ جاؤں.. اور میری دادی بیری کے شجر تلے چرخہ کاتتی رُک جاتی تھیں اور اُن کی تند ٹوٹ جاتی تھی کہ کہیں میں گر نہ جاؤں.. بیری کے اس درخت کی ہر شاخ پر انہوں نے میری پیدائش سے پیشتر خواب میں دیے جلتے دیکھے تھے..

تو یہ میرے آبائی گھر کا صحن تھا..

اور میں اُن پتھروں کو تکتا رہا جو حرا کو ڈھکتے تھے.. اور اُن چٹانوں پر ہاتھ پھیرتا رہا جن کا ایک ایک پور میرے لمس سے آگاہ ہو چکا تھا.. اور جہاں کہیں بھی اُن کی سطح کھردری تھی میں جانتا تھا.. اور جتنے بھی کنگرے اور کنارے تھے وہ میری پوروں سے شناسا تھے..

اور ان آڑے ترچھے ایک دُوسرے کے سہارے آرام کرتے پتھروں میں جو چھید تھے.. جو شگاف تھے اُن میں سے جو خفیف جھونکے اُترتے تھے.. جو ہوا آتی تھی مدھم سرسراہٹ کی لپیٹ میں تو میں اُس سے بھی واقفیت رکھتا تھا..

یعنی وہ سب.. غارِ حرا کی آڑی ترچھی سلیں.. چٹانیں اور پتھر اور شگاف بھی یقیناً میرے بے ڈھب وجود.. میرے قدامت.. ناک نقشے.. ہاتھوں پر سکڑتی اور چہرے پر جال بچھاتی جھریوں اور سُرخ آنکھوں سے اتنے ہی آشنا تھے جتنا کہ میں تھا..

غارِ حرا کے فرش کے سنگریزے میرے گھٹنوں کو خوب جان گئے تھے..

اس میں کیا شک ہے کہ بابا کے وصال کے بعد یہاں رات گزارنے والے عشاق کا تانتا

بندھا رہا ہوگا.. اور میں اُن سے لاڈ کرنے والا کوئی انوکھا نہ تھا.. لیکن وہ سب کے سب بابا کے عشق میں فنا لوگ ہوں گے.. کوئی ایسا ہوگا جو چاندنی کے جزیروں کا.. رات کے گزرنے کا.. شگافوں میں سے سرسراتی ہوا کا بھی شیدائی ہو.. کوئی نہ کوئی تو ہوگا..

بے شک کوئی ایک آوارہ گرد تو آیا ہوگا جو ثواب کو ثانوی حیثیت دیتا ہو اور اُس کے لیے یہ پتھر، سنگریزے شگاف اور چاندنی کے جزیرے زیادہ اہمیت کے حامل ہوں..

ایسا آیا ہوگا.. تو مجھ ایسا ہوگا.. دل کا سیاہ.. اعمال کا سیاہ اور پھر بھی پشیمان نہ ہوتا ہوا.. بابا کی چھن چھن کرتی ڈاچی قصوئی کے پیچھے پیچھے چلنے والا.. اُس کی مینگنیاں اُٹھانے والا.. حشر وہاڑے سے غافل.. نہ حساب سے ڈرتا نہ عذاب سے خوفزدہ.. صرف یہ تمنا کہ کبھی تو بابا.. ڈاچی پر سوار مڑ کر دیکھیں گے کہ یہ کون ہے جو پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے..

میرے کانوں میں اذان کی آواز آنے لگی..

کوئی ایک صدا نہیں.. سینکڑوں ملی جلی مشترکہ صدائیں جو وادی مکہ کی سینکڑوں مساجد سے بلند ہوتی.. جبلِ نور کی بلندی تک پہنچتی.. پھر ذرا نشیب میں اُتر کر غارِ حرا کے صحن میں قید ہو کر.. ایک نغمے الاپ کے ساتھ غار کے اندر داخل ہو کر میرے کانوں میں فلاح کے چراغ روشن کرتی.. اُترنے لگیں..

فجر ہو گئی ہے..

جدائی کی فجر آ گئی ہے..

میں غار میں سے نکل کر باہر صحن میں آ گیا..

"رضا.." میں نے پکارا..

اُس نے اتنی دیر بعد "ہاں" کہا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ جا چکا ہے.. وہاں موجود نہیں ہے

"فجر کی اذانیں ہو رہی ہیں؟"

"نہیں برادر.. یہ تہجد کی اذان ہے.. میں تو یہیں پڑھوں گا.. تم بھی آ جاؤ.." اُس کا سراپا چھت پر نمودار ہو گیا "اِدھر سے ہی آ جاؤ.. بس اپنے جوگر جمائے رکھو.. میں سہارا دیتا ہوں" اور میں پہلی بار یوں براہِ راست رضا کا ہاتھ تھام کر جوگر جماتا اُوپر جا پہنچا..

"تہجد یہیں پڑھ لو کھلی فضا میں.. ابھی زائرین آ پہنچیں گے.. یہیں پڑھ لو"

گویا رضا نے ایمرجنسی ڈیکلیئر کر دی تھی کہ یلغار ہونے کو ہے.. لیکن میں نیت کرتے کرتے رُک گیا.. میں نے ابھی تک کوئی نماز غارِ حرا میں نہیں پڑھی تھی.. "رضا میں نیچے جا رہا ہوں.."

"کیوں.." وہ حیران ہوا..

"میں غارِ حرا کا باسی ہوں وہیں پڑھوں گا.."

"تو پھر یہیں سے اُتر جاؤ.."

"نہیں چڑھنا آسان ہے..اُتروں گا تو گروں گا یہ میں جانتا ہوں"

میں اپنے معمول کے راستے پر ہولیا.. بابا بنگالی کا چبوترہ تک اور پھر صحن میں.. منرل واٹر کی بوتل سے منہ پر چند چھینٹے مارے.. واجبی سا وضو کیا اور غار میں داخل ہو کر تہجد کی نیت باندھ لی..

حج کے دوران اتفاق ہو جاتا تھا لیکن عام زندگی میں تہجد کم ہی ادا کی تھی.. بلکہ شاید کبھی نہیں کی تھی.. اور اب ادا کرتا تھا تو غارِ حرا کی تنہائی میں کرتا تھا.. اور ظاہر ہے زندگی میں دوبارہ ایسا نہ ہونا تھا..

میں نے خواہشوں اور دُعاؤں کی فہرست ایک مرتبہ پھر پیش کر دی اور وہ جو آخری دھبہ تھا چاندنی کا اور گل ہونے کو تھا اُس پر نظر جما کر بیٹھ گیا..

اتنی دیر میں رضا چھت سے اُتر کر صحن میں آ کھڑا ہوا.. اُس کے ہاتھ میں ٹارچ روشن تھی.. اور اُس کا رُخ میری طرف تھا.. میری آنکھیں چندھیا گئیں کہ رضا کیا کر رہا ہے.. اور تب وہ بولا.. ٹارچ کے عقب میں جو تاریکی تھی اُس میں سے اُس کی آواز آئی "مستنصر.. تم.. تم ایک حیرت انگیز چہرے کے مالک ہو.."

"میں؟"

"ہاں.. تم اس ٹارچ کی روشنی میں ایک عجیب بہت ہی قدیم شکل کے لگتے ہو.. تم سے.. نہیں تمہاری آنکھوں سے ڈر لگتا ہے.. اُن میں کچھ ہے.. صرف تمہاری آنکھیں ہی نہیں بلکہ پورا چہرہ ایسا ہے جو ان زمانوں کا نہیں.." اُس کی آواز میں حیرت کے ساتھ کچھ ڈر بھی تھا "کاش تم اپنے آپ کو دیکھ سکتے کہ تم کیسے لگ رہے ہو.."

مجھے کچھ سجھائی نہ دیا کہ میں کیا کہوں.. کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دوں.. ہاں ایسا تو ہونا ہی تھا.. کے ٹو کی کوہ نوردی سے واپسی پر میں اپنے آپ کو آئینے میں پہچان نہ پایا تھا.. میری آنکھیں سُرخ تھیں اور اُن میں وحشتوں کے چراغ جلتے تھے.. میرا چہرہ ایک نارمل انسان کا چہرہ نہ تھا اُس پر بھی وحشتیں نقش تھیں.. اگر پہاڑوں کے ایک سفر کے بعد نین نقش بدل سکتے ہیں تو بابا کے گھر میں جو مہمان رات بھر قیام کرے.. وہ تو نہیں رہتا جو کہ وہ تھا.. بے شک میرے ساتھ ایسا بھی ہو..

میں جانتا تھا کہ رضا کی حیرت میں سچائی ہے.. اور اس لمحے میرا جی چاہتا تھا کہ میں اپنے آپ کو آئینے میں دیکھوں [illegible] ہے..

"یہ ٹارچ تو بجھا دو.. پلیز.."

"اوہ سوری.." اُس نے ٹارچ آف کر دی..

"رضا پلیز.. اب تم آ جاؤ.. میں صحن میں جا بیٹھتا ہوں تم غار میں کچھ نوافل ادا کر لو.."

"نہیں.. میں اُوپر جاتا ہوں.. سپیدۂ سحر نمودار ہونے کو ہے اُس کا منظر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے.. تم آنا چاہتے ہو"

"نہیں.. میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ غار میں بیٹھے ہوئے جب سحر اس صحن میں اُترے گی تو کیسا منظر ہوگا.."

وہ چلا گیا..

میں پھر تنہا ہو گیا..

اور میں نے جب اپنے آس پاس پھر نگاہ کی تو کسی تبدیلی کا احساس ہوا.. کسی شے کی کمی تھی.. ہاں.. اُس ایک چاندنی کے جزیرے کی کمی تھی جو میری بے دھیانی میں رُخصت ہو گیا تھا..

میں نے اپنے تئیں دودھ کی بوتل میں سے آخری دو چار گھونٹ بھرے.. پھر بھی کچھ چھلکتا تھا.. رات کا آخری پہر زوال میں تھا..

کچھ دیر بعد سحر نے اس صحن میں اُترنا تھا.. اور یہی وہ آخری منظر تھا جس کو دیکھنے کی مجھ میں چاہت تھی کہ غار میں بیٹھے ہوئے بابا جب شب بھر کے گیان دھیان کے بعد صحن کی تاریکی میں ہولے ہولے سفیدی گھلتے دیکھتے ہوں گے.. تو کیسے دیکھتے ہوں گے.. ویسے میں دیکھوں.. اُن کی آنکھوں سے دیکھوں..

چاندنی کا کوئی دھبہ غار میں نہ تھا....

ابھی سویر ہونے میں کچھ وقت تھا..

البتہ سویر کی ٹھنڈک شب بھر کے جاگے ہوئے بدن پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرتی تھی.. تپتی ہتھیلی پر سر رکھ کر میں پھر لیٹ گیا..

اور نہ چاہتے ہوئے بھی ایک اونگھ میں دفن ہو گیا.. یہ سویر کی سرد ہواؤں کے بوسے تھے جنہوں نے مجھے بے سُدھ کر دیا..

کیا معلوم کب تک..

کتنی ساعتیں بیت گئیں..

البتہ مجھے یہ یاد ہے کہ میں خواب میں بھی اپنے آپ کو غارِ حرا میں ہی دیکھتا تھا..

اور اس خواب میں کچھ آوازیں سنائی دے رہی تھیں.. وہ انسانی نہ تھیں کسی غیر مرئی مخلوق کی تھیں اور اجنبی زبان میں تھیں... میں غارِ حرا کے خواب سے جاگا تو غارِ حرا میں تھا اور وہ آوازیں کچھ مدھم مدھم.. دھیرے دھیرے ملفوف سی.. سنائی دے رہی تھیں.. اور وہ یقیناً سُرنگ کے راستے سفر کرتیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں..

اس کے بعد غدر برپا ہو گیا..

اودھم سا مچ گیا..

یلغار ہو گئی..

کہ شب کی نیم سیاہی میں سُرنگ کے اندر سے لوگ اُبلنے لگے..

مرد خواتین‘ بچے بوڑھے سُرنگ میں سے برآمد ہو کر صحن کو بھرنے لگے..

میں غار کی تاریکی میں دُبکا بیٹھا انہیں بے چارگی سے دیکھتا رہا.. جیسے میں ایک فقیر تھا جس کی جھونپڑی پر قبضہ کرنے والے آ گئے تھے.. ایک غریب کرائے دار تھا جسے بے دخل کرنے والے آ گئے تھے..

فارسی میں گھریلو باتیں کرتے.. کبھی چلبلے ہوتے کبھی جھگڑتے.. بچوں کو سرزنش کرتے اور اس کے ساتھ ہی ہیجان سے لبریز.. بلند آواز میں درود شریف پڑھتے.. دُعائیں مانگتے.. کچھ گریہ کر رہے تھے.. وہ صحن میں داخل ہوتے گئے.. تاریکی میں آئے اور جب اُن میں سے کسی ایک کی ٹارچ کا رُخ غارِ حرا کی جانب ہوا تو وہاں میں تھا..

ٹارچ کی روشنی میں آیا ہوا دوزانو بیٹھا ایک سُرخ آنکھوں والا.. اودھیڑ عمر شخص جس کا چہرہ ان زمانوں کا نہ تھا.. جو میں تھا.. چاندنی کے جزیروں کا داغا ہوا.. جس کے کاندھے دُکھتے تھے کہ وہ اُن کاندھوں میں ثبت ہوئے تھے.. جس کی جیب میں ایک قلم تھا جو شاید ابھی تک لرزش میں تھا‘ جس کے گھٹنوں پر غارِ حرا کے فرش کے سنگریزوں کی شکلیں نقش تھیں اور جس کی دودھ کی بوتل سے مُنہ لگا کر بابا نے ایک گھونٹ بھرا تھا اور جس کی آنکھوں میں رت جگا تھا.. جو میں تھا..

ظاہر ہے وہ جو کوئی بھی تھا جس کی ٹارچ کی روشنی میں میں یکدم ظاہر ہو گیا تھا یکدم خوفزدہ ہو گیا کہ یہ کون ہے..

جیسے رضا ٹھٹک گیا تھا.. رُک گیا تھا اور مجھے کوئی بھوت پریت سمجھ بیٹھا تھا.. ایسے اُس شخص نے بھی مجھے وہی سمجھا اور ٹھٹک گیا..

میرا قیاس ہے کہ صحن میں جمع شدہ مخلوق بھی متوجہ ہوئی.. اور جو جہاں تھا رُک گیا.. چپ ہو گیا..

اور اس ٹھٹک اور خوف کو توڑنے کے لیے میرے پاس بھی ایک اسم اعظم تھا.. ایک تعویذ تھا اور میں نے بلند آواز میں "السلام علیکم" پکارا.. اور دوبارہ پکارا.. اور مسکرانے لگا..

وہ ایک شخص جس کی ٹارچ کی روشنی میں میں آیا ہوا تھا وہ ٹھہرا ہوا‘ ٹھٹکا ہوا شخص اپنے ڈر سے باہر آیا اور اب بھی ذرا جھجکتے ہوئے آگے ہوا اور ذرا جھک کر مجھ سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا..

وہ پیچھے ہوا تو کچھ اور ہاتھ آگے ہوئے.. میں نے اُن کے ہاتھ تھام کر کچھ نہ کچھ بزبانِ فارسی اُن سے کہا.. میں نیم تاریکی میں دیکھ تو نہ سکتا تھا لیکن اُن کے چہروں پر جذبات کی جو تمازت تھی اُسے اپنے رُخساروں پر محسوس کر سکتا تھا..

سیاہ پوش خواتین صحن میں سجدہ ریز ہو رہی تھیں.. سنگریزوں کی سختی کی پروانہ کرتی ہوئیں اپنے ماتھے ٹیک رہی تھیں..

اور اُن میں سے کچھ مردوں کے عقب میں کھڑی حسرت اور مسرت کی نگاہوں سے مجھے دیکھے جا رہی تھیں کہ میں غارِ حرا میں تھا..

بچے اِدھر اُدھر جھانکنے لگے.. صحن کی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے اور غل کرنے لگے..

مجھے احساس ہو گیا کہ اب مجھے بابل کا ویہڑا ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا ہے..

جیسے موت کا ایک دن معین ہے ایسے وہ لمحہ بھی معین ہے جب مجھے بابا کے سانسوں کے سہارے قائم اِن آڑے ترچھے پتھروں سے وجود میں آنے والی اس کھوہ سے کوچ کر جانا ہے..

بابا کی اُونچی حویلی سے رُخصت ہو جانا ہے..

رانجھن کی جھوک سے جدا ہو جانا ہے..

رانجھن کے ڈیرے میں قیام ایک خواب ہونے کو ہے..

جیسے کسی کے دن پورے ہو جاتے ہیں اور وہ یہ جہان چھوڑ جاتا ہے ایسے میرے لیے بھی پورے ہو گئے تھے‘ میں نے جو سانس یہاں لینے تھے وہ پورے ہو چکے تھے..

کوہ نوردی میں.. آوارگی میں.. کسی بھی مقام پر شب بسری کے لیے خیمہ زن ہوئے تو اگلی سویر ایک نئی منزل کی جستجو اور ہوس میں مبتلا ہوئے.. خیمہ سمیٹتے کبھی دُکھ نہ ہوتا کہ اگلی منزل نظر میں تصویر ہو کر بلاوے چلی جاتی تھی..

لیکن یہاں سے کوچ کر کے اب کہاں جانا تھا..

جانا تھا تو پستی میں ہی جانا تھا.. نیچے ہی اُترنا تھا.. کسی مزید بلندی کی جانب تو سفر نہیں کرنا تھا کہ اس بلندی کے اوپر تو کوئی اور بلندی ہے ہی نہیں..

کہار ڈولی لے کر آ جائیں تو دُلہن لاکھ جتن کرے.. آنسو بہائے... لاکھ منت سماجت کرے کہ بس ایک روز اور بابل کی گلیوں میں رہنے دو.. اُس کی کچھ سُنی نہیں جاتی.. کہار آتے ہیں تو کبھی خالی ڈولی لے کر واپس نہیں جاتے..

تو کوچ کا.. رُخصتی اور جدائی کا لمحہ نزدیک تھا.. جیسے غار کی چھت پر وہ نزدیک تھا..

صحن میں بیشتر سیاہ پوش فربہ اور کچھ چھریرے بدن کی خواتین.. کچھ مصلوں پر اور بیشتر فرش پر نفل ادا کر رہی تھیں اور سیاہ شہزادیاں لگتی تھیں.. اُن کے ہاں ہاتھ باندھنے کا دستور نہ تھا اس لیے ہاتھ کھولے کھڑی تھیں..

ایرانی زائرین ہمیشہ مسلح رہتے ہیں..... سٹل کیمروں.. موبائل فونوں اور ویڈیو کیمروں سے.. اور اُن میں سے بیشتر جو کچھ دیکھتے تھے کیمرے کی آنکھ سے دیکھتے تھے اِس کے سوا کچھ اور کم ہی دیکھتے تھے.. اور میرا خیال ہے کہ وطن واپس پہنچ کر ہی دیکھتے تھے کہ ہم کہاں گئے تھے.. فلیش لائٹس مسلسل آنکھوں کو چندھیاتی تھیں اور ویڈیو کیمروں کی لائٹیں مسلسل پتھروں اور چٹانوں پر سفر کرتی اُنہیں عیاں کرتی تھیں..

ایک عمر رسیدگی میں ڈھلتا معتبر شخص' اپنے ویڈیو کیمرے کی روشنی جب مجھ تک لایا تو میرے قریب ہوا.. مجھ سے ہاتھ ملایا اور پوچھا ''آپ ہم سے پہلے آ گئے.. کب آئے تھے؟'' میں نے بتایا تو اُس نے لائٹ آف کر دی اور جھک کر بولا ''آپ ابھی نہیں آئے.. کل شام سے یہاں ہیں.. رات غارِ حرا میں بسر کی ہے؟''

''جی..''

''پوری رات..''

''جی..''

اُس معتبر شخص نے زائرین کی جو یلغار صحن کو بھرتی تھی اُن سے مخاطب ہو کر فارسی میں پُرشور وقت آمیز کلام کیا تو آوازوں کا شور یکدم ختم ہو گیا اور وہ سب جھک جھک کر مجھے ایک عجوبے کی صورت دیکھنے لگے..

ایک خمیدہ کمر بوڑھے نے جس کے گھنگھریالے بال کھچڑی ہو رہے تھے' آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور باس ڈھلا ہوا تھا آگے ہو کر جھک کر میرے دونوں ہاتھوں کو تھامے رکھا اور پتہ نہیں کیا کیا

کہتا رہا.. اور اپنے لرزتے ہونٹ میرے ہاتھوں کے قریب کرتا کہتا رہا..

صحن میں جتنے بھی مرد تھے اُن میں سے بیشتر نے باری باری میرے ہاتھوں کو تھاما اور کچھ نہ کچھ کہا.. وہ خواتین جو نوافل کی ادائیگی کر چکی تھیں' اُنہوں نے مجھ سے کچھ پردہ نہ کیا.. ذرا جھک کر.. مسکراتے ہوئے یا آبدیدہ ہو کر کچھ اظہار کیا..

اصل میں اس مقام کے ایسے ہی لوگ حقدار تھے.. رسولؐ کے عشق میں کٹھن چڑھائیاں چڑھتے اور وہ بھی رات کے اس پہر.. جو یہاں پہنچے تھے' میں جذبات کی جن منزلوں پر وہ تھے وہاں تک کبھی نہیں پہنچ سکتا تھا.. حقدار تو یہی تھے میں تو ایک غاصب تھا.. میں غار میں سے اُٹھا اور باہر آ کر اُن میں شامل ہو گیا.. سُرنگ کے برابر میں جو چٹان تھی اُس سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا.. جونہی میں غار سے نکلا اُس کمر خمیدہ بوڑھے نے میری جانب نہایت لجاجت سے دیکھا کہ اگر اجازت دو تو میں اندر چلا جاؤں.. وہ اسی انتظار میں تھا کہ میں اُس مقام کو خالی کروں تو وہ اندر جا کر دو چار لمحوں کے لیے سر جھکا لے.. میں نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا تو اُس نے غار میں داخل ہو کر سر جھکا دیا..

صرف صحن میں ہی نہیں.. سُرنگ میں بھی لوگ منتظر تھے اور اُوپر نظر کی تو جبل نور سے جو سیڑھیاں گھاٹی کے برابر میں اُترتی بابا بنگالی کے چھپر تک آتی تھیں اور اُن میں سے تین چار یہاں سے بھی دکھائی دے جاتی تھیں اُن پر بھی سیاہ ہیولے حرکت میں تھے.. رات کی نیم تاریکی میں غول کے غول اُتر رہے تھے.. جبل نور کی چوٹی پر بھی ایک جم گھٹا دکھائی دے رہا تھا جن میں سے کچھ سائے نفل ادا کر رہے تھے..

اُس معتبر شخص نے اپنے ویڈیو کیمرے اور اُس کی لائٹ کا رُخ میرے چہرے پر مرکوز کیا اور مجھ سے سوال کرنے لگا.. براہِ کرم آگاہ کریں کہ آپ کل شام کتنے بجے یہاں تشریف لائے تھے.. مکمل تنہائی میں یہاں کتنا وقت گزارا.. اور کیا بیتی..

میں کیا بتاتا کہ کیا بیتی.. اُس کے سوالوں کے جواب میں ہوں ہاں کرتا مسکراتا رہا.. یکدم مجھے پھر خیال آیا کہ نیاز کہاں ہے.. ظاہر ہے اس ہنگامے میں وہ سو تو نہیں رہا ہوگا.. اور وہ وہاں نہیں تھا.. جانے کب اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اُوپر چلا گیا تھا.. غالباً ابھی کچھ دیر پہلے جب مجھ پر نیند کا غلبہ ہوا تھا تب.. یا زائروں کی آمد پر ہی وہ اُٹھ کر چلا گیا تھا..

اُدھر خمیدہ کمر بوڑھا سلام پھیرتا تو پھر اُٹھ کر نیت باندھ لیتا.. جب وہ چوتھی بار نیت کرنے کو تھا تو ایک اور ویسے ہی خمیدہ کمر باباجی نے اُس کی کمر پر ہاتھ رکھ کر شاید اُسے ڈانٹا کہ اب بس بھی کرو.. میری باری ہے..

وہاں غار میں میرا کچھ سامان پڑا تھا.. میرا کچھ سامان تمہارے پاس پڑا ہے وہ لوٹا دو.. تنتی تھیلا وہیں دھرا تھا..

میں خالی ہاتھ اور ننگے پاؤں باہر آ گیا تھا.. میرے جوگر' تسبیح' دودھ کی بوتل' ٹارچ' بال پوائنٹ' ٹشو پیپر وغیرہ وہیں اُس ہموار پتھر پر رکھے تھے..

میرا وہ مصلّے جس پر لوگ نفل پڑھ رہے تھے..

مجھے اپنا سامان سمیٹنا تھا..

میرے لمحے پورے ہو گئے تھے.. مجھے بابا کی اُونچی حویلی سے اب رُخصت ہونا تھا.. راجھن کی جھوک سے جدا ہونا تھا' کہار آ گئے تھے.. اب مجھے کوچ کرنا تھا..

میں کوشش کر کے.. معافی اور تشکر کے کلمات بڑبڑاتا آگے ہوا.. غار کے دہانے پر متعدد لوگ اپنی باری کے منتظر تھے اور اندر ایک اور بابا جی ایسے تھے کہ باہر آنے کا نام نہ لیتے تھے.. میں بھی اُن کے ہمراہ انتظار کرنے لگا.. پھر میری باری آ گئی..

سامان سمیٹنے سے پیشتر آخری بار بابا کا اور اللہ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا..

لیکن کچھ لطف نہ تھا..

مجھے یوں نفل ادا کرنے کی عادت ہی نہ تھی کہ پشت پر آوازوں کا شور ہو.. منتظر لوگ ہوں جن کی بے چین آنکھیں میرے کندھوں کو جلاتی ہوں.. ایک ہجوم ہو.. میں نے اس مقام پر ٹھہرنے کے بہت بہانے بنائے.. آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ الگ الگ کر کے پڑھتا تا کہ کچھ وقت لگے.. سجدے میں گیا تو گیا ہی رہا.. سلام پھیرنے کے بعد ہاتھ دُعا میں اٹھائے تو غارِ حرا کے آخر میں جو شگاف تھا جس میں سے ہلکی نامعلوم سی روشنی آ رہی تھی اُسے دیر تک تکتا رہا.. دُعا کے بعد میں نے آس پاس کے پتھروں پر ہاتھ پھیرے.. انہیں الوداع کہا.. جیسے کسی مکان کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنے سے پیشتر اُس کے مکین اُسے حسرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور جاتے ہوئے دیوار و در کو چھوتے ہیں اُن پر ہاتھ پھیرتے ہیں..

جیسے بے گھر کیے جانے والے آخری بار اپنے گھر کو دیکھتے ہیں..

میں نے اپنا سر بانہ اٹھایا' تنتی تھیلا کو اٹھایا اور اپنا سامان سمیٹنے لگا.. آخر میں اپنے جانماز کو اٹھایا اُس کے تلے وہ بوسیدہ ہزاروں جبینوں سے آشنا غارِ حرا کی واحد زینت وہ مصلّے سمٹا پڑا تھا..

پھر میں سوچ میں آ گیا کہ اپنے نئے نکور مصلّے کو یہیں پڑا رہنے دوں اور اس بوسیدہ مصلّے کو

ساتھ لے جاؤں.. لیکن.. میں اس خیال سے باز آ گیا.. گریز صرف اس لیے کیا کہ شاید یہ ایک گستاخی' ایک بے ایمانی نہ ہو' چوری کے زمرے میں نہ آ جائے اس لیے گریز کیا.. تنتی تھیلے میں سامان بھر کر میں نے اُس کی زپ چڑھائی.. پھر جوگر پہنے اور چھوٹا ٹارچ روشن کر کے غارِ حرا سے ہمیشہ کے لیے باہر آ گیا..

زائرین اب مجھے بھلا چکے تھے.. میں ایک قصۂ پارینہ تھا..

میں جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا کہ یہ وہ غار نہ رہی تھی جو میرا گھر تھی.. یہ صحن میرا نہ رہا تھا.. میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے ذہن پر نقش اور بدن پر ثبت جو غارِ حرا اور صحن کی شب بھر کی تنہائی اور اپنائیت کی تصویریں ہیں اُن پر اس ہجوم اور دھکم پیل کے دھبے پڑ جائیں..

زائرین میں سے راستہ بناتا میں سُرنگ میں داخل ہوا اور وہاں بھی راستہ بنانا پڑتا تھا.. اور وہاں ایک پُر لطف منظر بھی تھا.. ایک ایرانی معیار سے بھی فربہ خاتون اُس چٹان اور پتھریلی دیوار کے درمیان میں پھنسی ہوئی تھی جہاں سے میں اپنی توند سمیٹتا بمشکل گزرتا تھا.. وہ بھی اپنے لاچار خاوند پر برستی تھی جو چٹان کے قریب اُس پر ٹارچ کی روشنی ڈالے سر کھجاتا تھا کہ اب کیا کیا جائے اور کبھی اپنی موٹی موٹی ٹانگیں ہلاتی چیخنے لگتی تھی..

سُرنگ سے باہر چھپر تلے آیا تو وہ بھی آباد ہو چکا تھا..

بابا بنگالی اپنی نشست پر پھسکڑا مارے بیٹھا سیڑھیوں سے اُترنے والے زائرین کو ذرا آگے ہو کر جھک کر سُرنگ کے اندر اپنی بڑی ٹارچ سے روشنی ڈالتا راہ دکھاتا تھا اور اُس نے ایسا اہتمام کر رکھا تھا کہ کوئی بھی زائر بابا بنگالی کی توند کے عین آگے پتھر پر نمائش شدہ تومان' ریال' لیرا اور روپے کے نوٹوں کو درگزر نہ کر سکے اور اُن میں اضافہ کر کے ہی آگے جائے.. چنانچہ وہ متمول ہو چکا تھا..

چونکہ میں ایسا زائر نہ تھا جس کی جیب میں سے کوئی ریال وغیرہ آسانی سے باہر آ سکے اس لیے بابا بنگالی نے قطعی طور پر مجھے قابلِ توجہ نہ سمجھا.. بالکل لفٹ نہ کرائی..

نہ جان نہ پہچان نہ سلام نہ دُعا.. آگے جھکا ہوا ایرانیوں کو راہ دکھلاتا رہا.. دیدہ و دل فرش راہ کرتا رہا..

میں اپنا تنتی تھیلا اُٹھائے اُس کے برابر میں سے گزر کر پتھروں پر جوگر جماتا غارِ حرا کی چھت کی جانب اوپر چلا گیا..

اور ابھی مکمل تاریکی تھی..

غارِ حرا کی چھت سے ذرا اِدھر جہاں سے جبلِ نور کی کھائی گہرائی میں گرتی تھی وہاں میں نے اتنی جگہ ٹٹول کر.. ٹارچ کی روشنی میں دریافت کر لی جہاں ایک مصلّے بچھانے کی کچھ گنجائش تھی اور کھائی میں لڑھک جانے کا امکان قدرے کم تھا..

مصلّے بچھا کر میں نے اپنا تھیلا اُس کے برابر میں رکھا اور اطمینان سے بیٹھ گیا.. جیسے اپنے گھر سے بے دخل ہو جانے والے مجبوری کے تحت کھلے آسمان تلے رات بسر کرتے ہیں ایسے میں بھی تھا لیکن میرے دل میں کچھ ملال نہ تھا' کوئی رنج نہ تھا کہ میں کیوں بے دخل کر دیا گیا.. میرے اندر ایک امن تھا!

میں بہت شانتی اور سکون میں تھا..

میری یاترا مکمل ہو چکی تھی..

میں وہ یاتری تھا جس نے من مندر میں جتنی بھی گھنٹیاں تھیں اُن کا ترنم رات بھر سُنا تھا.. بابا کے عشق کی جو گنگا تھی اُس میں جی بھر کے اشنان کیا تھا..

میں اُن کے نُور و نُور سراپے کے برگد تلے رات بھر بیٹھا رہا تھا اور مجھے اپنی گناہوں بھری سیاہ چادر کے باوجود چاندنی کے جزیروں.. قلم کی لرزش اور اُن کے جثے سے دبی ہوئی چٹان کے ساتھ کندھے ملانے کا گیان حاصل ہو چکا تھا..

تو میں کاہے کو رنج میں مبتلا ہوتا یا ملال کرتا.. میں شانتی اور امن میں تھا..

پیچھے دھیان کرتا تھا تو جبلِ نور کی چوٹی سے اُترنے والی سیڑھیوں پر اب کوئی نہ اُترتا تھا کہ زائرین اُن سیڑھیوں پر براجمان تھے... غارِ حرا تک جانے والی سُرنگ اور اُس کے صحن میں اتنے لوگ بھر چکے تھے کہ وہ اُتر نہ سکتے تھے اس لیے وہیں آباد ہو گئے تھے سیڑھیوں پر.. مزے سے منتظر تھے جیسے پکنک منانے آئے ہوں..

ڈاکٹر رضا علی یہاں موجود نہ تھا.. وہ شاید اس ہجوم کے نزول سے پیشتر ہی یہاں سے رُخصت ہو چکا تھا..

کیسا شاندار شخص تھا..

غارِ حرا کی شبِ تنہائی میں چند لمحوں کے لیے میرا واحد ساتھی.. اُس رات کے اکلاپے میں اُس کی پُرسوز قرأت..

تو خود گفتی کہ در قلبِ شکستہ خانہ داری
شکستم قلب جوں جانا بہ خود وا کن

اگر عشق گناہ ہے تو میں اس گناہ میں غرق ہو چکا ہوں..

رات اب بھی تاریک اور گھنی تھی لیکن صرف ایک فرق کے ساتھ کہ پہلے ہر سُو چُپ کے ڈیرے تھے اور اب ہر سُو قدموں کی آہٹیں اور زائروں کی باتیں اور مناجاتیں سنائی دے رہی تھیں..

لیکن اب بھی میرے درجات بلند رہے تھے.. ایک تو جبلِ نور کی بلندی اور پھر یہ کہ میرے آس پاس وہاں اور کوئی نہ تھا..

وہ سب کے سب چوٹی سے اُتر کر.. بابا بنگالی کے پہلو سے نکل کر.. سُرنگ میں داخل ہوتے تھے.. غارِ حرا کے چاؤ میں چلے جاتے تھے.. اِدھر کوئی نہ آتا تھا..

یہاں کوئی نہ تھا..

یعنی کوئی ذی روح نہ تھا.. وہ تو تھا اور نزدیک تھا اور سامنے اُس کا گھر ایک منی ایچر خانہ کعبہ تھا جو رات کے اس پہر جبلِ نور کی آخری گھاٹی سے پرے شہروں کی ماں مکّہ کی آبادیوں سے بہت پرے تاریکی میں اپنے آپ کو یوں ظاہر کرتا تھا کہ اُس پر ایک خوابناک پریوں کے قلعے کا گمان ہوتا تھا..

اس عقیدت بھری خوابناکی میں ایک کھردری حقیقت کا بھی اقرار کر لیا جائے.. میں اپنے مصلّے سے اُٹھا.. احتیاط سے قدم رکھتا ذرا آگے گیا.. غارِ حرا کے صحن میں جھانکا تو وہاں بھگدڑ کی وہی کیفیت تھی.. اُس سے ذرا آگے ہوا.. اتنا کہ ذرّہ بھر آگے ہوتا تو ایسا آگے ہوتا کہ پھر لوٹ نہ سکتا.. کھائی میں گر کر جانے کہاں ابدی آرام فرما جاتا..

تو میں اس آخری کنارے تک گیا..

آس پاس سوائے رات کے اور کوئی نہ تھا تو میں نے ایک بار پھر عمر رسیدگی کے باعث بعض نازک اعضاء پر پڑتے بوجھ کو خالی کیا اور اطمینان کا ایک سانس بھر کر سگریٹ سلگا لیا..

سگریٹ کا آخری کش کھینچ کر میں نے اُسے چٹکی میں بھینچا اور تاریک خلاء میں پھینک دیا اور اُس کی مدھم سلگاہٹ کھائی میں گرتی چلی گئی..

واپس آ کر منرل واٹر سے اپنے ہاتھ بھگوئے مصلّے پر بیٹھ کر تسبیح کے کچھ دانے پھیر ڈالے اور پھر سامنے نظر آتے منظر نے پیام بھیجے کہ اے مردِ ناداں تیری نادانی کی بھی کوئی حد ہے.. میرے اور تیرے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں اور پھر بھی تو بیکار بیٹھا ہے.. میری جانب رُخ کر.. ہاتھ باندھ لے.. یہ کچھ تیرے نصیب میں پھر نہیں ہونے کا.. اور میں نے پیام کی تعمیل کی.. ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا..

جب سلام پھیرا تو دائیں جانب وہ پہاڑ نظر آیا جس پر ایک شخص اُفق تا اُفق کھڑا نظر آیا تھا..

اور بائیں جانب رُخ کیا تو وادیٔ مکّہ کی آبادیاں تھیں..

میں اُس شب کی سیاہی میں بہت دیر تک یونہی اپنے مصلّے پر بیٹھا رہا..

اپنا رُخ کعبے کی جانب کر کے..

پھر کچھ دیر لیٹا رہا..

اچھا اس کھلی فضا میں اپنے مصلّے پر نیم دراز ہونا بھی ایک الگ سا لطف تھا.. غارِ حرا کے اندر تو حدود تھیں.. اگرچہ ایک ذاتی سراسر ذاتی بسیرا تھا لیکن یہاں جبل نور اس پر جھکے آسمان اور وادیٔ مکّہ سے ہم آہنگی اور ان کے ساتھ سانس لینے کی.. اُن کا ایک حصّہ ہونے کی انوکھی کیفیت کا سرور تھا..

چونکہ لیٹے ہوئے.. حالتِ بیداری میں مجھے اِدھر اُدھر چھونے کی عادت ہو چلی تھی جو غارِ حرا کی عنایت تھی تو یہاں بھی میں اپنے آس پاس بے دھیانی میں ہاتھ پھیرتا رہا.. برابر کی چٹانوں پر.. ایک دو پتھروں کو.. چھوتا رہا..

میں نے اپنی دائیں ہتھیلی تلے کچھ سنگریزوں کی سختی محسوس کی.. سنگریزوں سے جسم میں ذرا بڑے پتھر تھے جو میرے لمس میں آتے تھے..

یہاں تو بہت منجمد اور سخت ہیئت کی چٹانیں تھیں تو یہ سنگریزے یا پتھر کہاں سے آ گئے.. پہلے نہیں تھے.. میں متعدد بار اِدھر آیا تھا تو پہلے اگر تھے تو میں نے غور نہیں کیا تھا.. میں نے ٹارچ روشن کر کے اب غور کیا اور مجھے اُن کی موجودگی کا جواز سمجھ میں آ گیا.. کسی زائر نے شاید ابھی کچھ دیر پیشتر چوری چھپے اس چٹان کو جو غارِ حرا کی چھت کا ایک حصّہ تھی کسی ہتھوڑی یا کسی اور سخت شے کی ضرب سے توڑا تھا.. تاکہ رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو.. اور وہ کوئی نشانی کوئی پتھر توڑ کر لے گیا تھا اور یہ اُس کے باقیات تھے.. دو چھوٹے چھوٹے پتھر.. میں نے تو ترغیب کے باوجود اور تنہائی کے باوجود جس میں غارِ حرا کے اندرون کا کوئی حصّہ میں کیسا بے خطر ہو کر توڑ سکتا تھا.. میں نے ایسا نہیں کیا تھا.. محض ایک نشانی کی خاطر اُس گھر کا چہرہ خراب نہیں کیا تھا.. اب ان دو پتھروں کو.. ابھی جب سویر ہوگی تو کوئی نہ کوئی اُٹھا کر لے جائے گا.. تو میں کیا برا ہوں.. میرا تو اس میں کوئی دوش نہیں‘ شاید یہ میری نیک نیتی کا انعام تھا.. میرے ہی لیے یہ بندوبست کیا گیا تھا.. یہ نشانی خصوصی طور پر وہیں رکھی گئی تھی جہاں مجھے مصلّے بچھانا تھا اور پھر برابر کی چٹان کو چھونا تھا.. چنانچہ میں نے ان دو پتھروں کو کسی بھی احساسِ گناہ کے بغیر اُٹھایا اور تپتی ہتھیلے میں سنبھال لیا.. اور آج میرے پاس غارِ حرا کی رات اور اُس سویر کی کیا کیا نشانیاں ہیں.. وہ مصلّے جو میں نے اُس میں بچھایا تھا.. ایک تسبیح‘ ایک قلم‘ تپتی تھیلا‘ وہ دو پتھر.. اور پھر بہت عزیز وہ جو گر..

تو کچھ دیر بعد... وادی ابھی تک تاریکی میں گم تھی.. اگرچہ سپیدۂ سحر کی علامتیں جبل نور کے عقب

سے کچھ کچھ سرایت کرتی تھیں.. لیکن سامنے دیکھتے تو تاریکی اور خاموشی میں چپ وادیٔ مکّہ.. فجر کی اذان سے زندہ اور متحرک ہونے لگی.. اللہ کے گھر کے گرد اُس کا نام لیا جانے لگا اُس کی بڑائی کا اعلان کیا جانے لگا..

جب اذانوں کا تسلسل ختم ہوا.. تو میں نے باقاعدہ محسوس کیا کہ خانہ کعبہ میں لوگ فجر کی ادائیگی کے لیے نیت کرنے کو ہیں.. میں نے جس طور پچھلی شب ایک یکتا تنہائی میں اور جبل نور کی چوٹی ایسے بے مثل مقام پر نمازِ عشاء ادا کی تھی ویسے ہی اب بھی خانہ کعبہ کو نظر میں رکھتے ہوئے فجر کی ادائیگی کے لیے ہاتھ باندھ لیے.. اور لمحۂ موجود میں بھی میں تنہا غارِ حرا کی چھت پر کھڑا تھا اپنے بچھائے ہوئے مصلّے پر.. تلووں تلے اُس کی نرمی اور اُس کے تلے جو چٹان کی سختی موجود تھی اُسے محسوس کرتے ہوئے.. اور اختتام پر جب دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو کوئی تازہ حرفِ دُعا یاد نہ آیا کہ دُعا مانگنے کے لیے کچھ باقی نہ رہا تھا.. جو مانگنا تھا اتنی بار مانگ چکا تھا کہ وہ جو جبل نور پر جھکے آسمان کی نزدیکی میں مجھ سے نزدیک تھا وہ بھی شاید تنگ آ چکا تھا کہ اس بے حوصلہ شخص کو کیا مجھ پر کچھ اعتبار نہیں کہ یوں بار بار التجائیں دوہراتا چلا جاتا ہے.. کیا میری یادداشت پر شک کرتا ہے یہ کہ جو مجھے مسلسل یاد دلاتا چلا جاتا ہے..

کیا میں نے فجر کی نماز غارِ حرا کے اندر ادا کرنے کے بارے میں سوچا.. نہیں.. بالکل نہیں.. ایک تو مجھے خوب خبر تھی کہ وہاں ہجوم کی کیا حالت تھی.. کیسا غوغا ہوگا اور دوسرا یہ کہ یہ مقام بھی کیسا اعلیٰ تھا.. سویر کی اُمڈتی ہوئی ٹھنڈک کو اپنے رُخساروں پر محسوس کرنا.. اپنے آپ کو بے انتہا میں محسوس کرنا.. تنہا اور خانہ کعبہ کو نظر میں رکھنا اور اُس میں جو لوگ فجر ادا کرتے تھے اپنے آپ کو اُن میں بھی محسوس کرنا..

فجر کی ادائیگی کے بعد..

مجھے رُخصت ہو جانا چاہیے تھا..

جبل نور سے اُتر جانا چاہیے تھا..

اب اور تو کچھ باقی نہ رہا تھا..

لیکن میں اتنا بھولا نہ تھا.. قدرے شاطر شخص تھا.. میرے دل میں کچھ اور بھی تھا.. یہاں ابھی ٹھہرے رہنے کا کچھ جواز بھی تھا.. میں اُسی دوزانو حالت میں اپنے مصلّے پر بدستور براجمان رہا.. ابھی ایک اور کیفیت کا میں منتظر تھا.. مجھے اپنے چہرے اور بدن پر ابھی کچھ کرنوں کو وصول کرنا تھا

سورج کے طلوع ہونے میں ابھی چند ساعتیں باقی تھیں..

اور میں نے اُس کی اوّلین اُن زرد کرنوں کا انتظار کرنا تھا.. اُنہیں اپنے چہرے اور بدن پر محسوس کرنا تھا.. اُن زرد کرنوں کا جو آج سے چودہ سو برس پیشتر تقریباً انہی موسموں میں اور اسی مقام پر اور اسی زاویے پر اُترتی تھیں اور بابا کے چہرے اور بدن پر پڑتی تھیں..

میں نے پچھلی شب بابا کے بدن اور آنکھوں کے ساتھ گزاری تھی.. چاندنی کی سب ساعتوں کو... ہواؤں کے سب پہلو.. ہر جھونکے.. چاندنی کے ہر دھبّے.. اور شب کے گزرنے سے ہر ٹھنڈک کو جوں کا توں اپنے بدن اور آنکھوں میں محسوس کیا تھا.. ہر ایک پتھر کو.. ہر سنگریزے اور ہر چٹان کو.. اپنے تئیں اپنی پوروں پر محسوس کیا تھا جیسے بابا محسوس کرتے تھے..

کیا واقعی اور کچھ باقی نہ رہا تھا..

باقی تھا.. بس ایک طلوعِ آفتاب باقی تھا..

میں ماہتاب کا نہیں آفتاب کے اُبھرنے کا منتظر تھا..

اور یہ انتظار طویل نہ ہوا.. مختصر ہوا..

البتہ مجھے اُس کے سامنے چہرہ بہ چہرہ اور باادب رو ہونے کے لیے اپنا رُخ بدلنا پڑا.. خانہ کعبہ سے منہ موڑنا پڑا کہ آفتاب نور کے پہاڑ کی اوٹ میں سے اُبھرنے کو تھا کہ اُدھر سے ہی سپیدۂ سحر روشن.. بہت آہستہ آہستہ.. دھیرے دھیرے روشن ہو رہا تھا..

وہ نمودار تو ہو چکا تھا لیکن جبل نور کی چوٹی میرے اور اُس کے راستے میں حائل تھی.. میں اُسے دیکھ نہ سکتا تھا صرف اُس کی زرد اور نیم روشن علامتیں تاریکی کی چادر میں سنہری دھاروں کی صورت بہتی تھیں.. ایک سیاہ رنگ کی اوڑھنی میں دمکتی کشیدہ کاری کے ٹانکوں کی صورت اپنے ہونے کی خبر دیتی تھیں..

میں نہیں جانتا کہ ایک گناہوں بھری چادر کو اوڑھنے والے کو اُس نے کیوں اتنی ڈھیل دی.. اتنے بے شمار سانسوں کو اس کے لیے وقف کر دیا.. لیکن اس ڈھیل میں اور ان سانسوں میں اور اس حیات میں.. ظاہر ہے میں نے بہت سی سویریں دیکھیں.. کیسے کیسے آفتاب کیسی کیسی سرزمینوں پر اُبھرتے دیکھے..

جرمنی کے بلیک فارسٹ کی سیاہی میں.. اور کبھی جھیل ونڈرمیر کے کناروں پر.. دریائے سین کے کنارے پاسکل کی شب بھر کی رفاقت کے بعد.. یا ماسکو کے ریڈ سکوائر میں.. ارض روم میں.. ایتھنز کے کھنڈروں میں بھی.. ہومر کی حنائی انگلیوں والی سویریں.. ہر رات میں.. ان سویروں کا کوئی انت نہیں..

حیات جتنی ہوتی ہے اتنی ہی سویریں ہوتی ہیں.. کبھی فیئری میڈو میں اور کبھی جھیل کرومبر کے کنارے.. تو ان بے اَنت سویروں میں یہ محض ایک اور سویر تھی..

لیکن بس اتنا فرق تھا کہ وہ سب سویریں مجھ پر.. صرف مجھ پر اُتری تھیں..

اور یہ سویر جو اُترنے کو تھی اس میں بابا بھی شریک تھے..

وہ جبلِ نور کی چوٹی کے عین اُوپر سے طلوع نہیں ہوا' بلکہ دامن سے جس راستے پر میں چڑھتا ہوا اُوپر آیا تھا اُس سمت سے ایک سنہری کنگن کی صورت نمودار ہوا.. پہاڑ کی ڈھلوان کے عقب سے ظاہر ہوا تو پہلے اُس کا ایک حصہ دکھائی دیا جو نیم سیاہی کے گلے سے لگا ایک سنہری کنگن دکھائی دیا.. اس کنگن کی گولائی پوری ہونے میں اور اس آتشیں پیالے کے پوری طرح اُبھر آنے میں دیر نہ لگی.. فجر کی ٹھنڈک اُس کے آگے ماند پڑتی ہوئی تمازت میں بدلنے لگی.. اور اسی حساب سے میرا چہرہ بھی دھوپ میں آتا گیا..

ایسے میں اُن دنوں اُن کا چہرہ بھی اسی دھوپ میں.. دھوپ کے اسی زاویے کی زد میں آکر روشن ہوتا ہوگا.. روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام..

روشنی پھیلنے سے اندازہ ہوا کہ زائرین کی تعداد بہت زیادہ ہے..

اُن میں سے دو تین میرے قریب سے گزرتے' میرے مصلے پر پاؤں نہ آ جانے کا دھیان رکھتے آگے آخری کنارے تک چلے گئے..

اور جب میں فجر کی ادائیگی سے کب کا فارغ ہو چکا تھا ایک مرتبہ پھر اذانیں میرے آس پاس سے بلند ہونے لگیں..

جبل نور کے چھتر کے آگے.. اُترتی سیڑھیوں پر.. اور غارِ حرا کی چھت پر.. ایرانی زائرین کانوں کو چھوتے اذانیں دینے لگے.. اللہ اکبر.. اللہ اکبر..

میں حیرت سے اس منظر کو تکتا تھا.. درجنوں لوگ.. کوئی کسی پتھر پر.. کوئی بہت بلندی پر.. اور کوئی سیڑھیوں پر.. خانہ کعبہ کی جانب رُخ کیے.. جو نشیب میں وادی مکہ کی گھنی آبادیوں کے درمیان اب پہلے کی نسبت کم واضح تھا کہ روشنی نے گھروں شاہراہوں اور بستیوں اور خانہ کعبہ کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا تھا.. پہلے وہ تاریکی کے درمیان ایک چکاچوند منور ماڈل تھا اور اب وہ آبادیوں کا ایک حصہ ہو چکا تھا اُن سے الگ نظر نہ آتا تھا.. یہ ایک جادوئی منظر تھا..

میں اب سورج سے منہ موڑ کر پھر منہ دل کعبہ شریف کیے اپنے مصلے پر بیٹھا ہوں اور میرے ارد گرد اس بلندی پر اذانیں بلند ہو رہی ہیں..

مجھے اس منظر کا کچھ گمان نہ تھا.. اور یہ ایک غیر متوقع اور سحر انگیز کیفیت تھی جس سے میں دوچار ہوا..

اگرچہ ایرانی برادران اپنے عقیدے کے مطابق اذان میں کچھ اضافے بھی کرتے تھے لیکن مجھے اس سے کوئی ضعف نہ پہنچتا تھا.. کچھ غرض نہ تھی.. کہ وہ کم از کم اپنے جذبے کا اظہار کر رہے تھے اور میں منہ اٹھائے اپنے مصلے پر بیکار بیٹھا تھا.. وہ اپنے انداز میں رب کی توصیف تو کر رہے تھے اور میں چپ بیٹھا انہیں دیکھتا تھا..

وہ سب جو اذانیں دے رہے تھے ظاہر ہے زیادہ خوش الحان تو نہ تھے لیکن اُن کا جذبہ انہیں سُر میں لے آتا تھا..

میرا بہت جی چاہا کہ میں بھی اُن میں شامل ہو جاؤں.. میں اُن کی جانب.. کبھی سیڑھیوں پر کھڑے کسی شخص کو اور کبھی میرے عین برابر میں کھڑے دو تین لوگوں کو مسکراتے ہوئے بہت حسرت سے دیکھتا جاتا تھا.. لیکن مجھ میں اجتناب تھا' ایک جھجک تھی' ہمت نہ تھی.. اور یہ خوف تھا کہ اگر میں نے اپنے مصلے پر کھڑے ہو کر صرف اللہ اکبر.. کی صدا بلند کی تو تمام اذانیں رُک جائیں گی.. سب لوگ میری جانب متوجہ ہو جائیں گے کہ یہ کون ہے.. اور کیسی گھگھیائی ہوئی آواز میں اللہ کو پکار رہا ہے.. اس کے اندر شک ہے جو اس کی آواز گلے میں سے پھنس پھنس کر نکل رہی ہے..

اذانوں کے بعد جو جہاں تھا وہیں نماز یا نوافل ادا کرنے لگا اور خاموشی ہو گئی..

صرف دھوپ بولتی تھی کہ میں آ گئی ہوں..

روشنی کی چکیلی سرسراہٹ تھی..

مجھے جانا تھا..

نیچے اُترنا تھا..

نور کے پہاڑ کی گھاٹیوں' اُترائیوں' کھائیوں اور راستوں پر اب اتنی روشنی اُتر چکی تھی کہ اس کے سہارے آسانی سے دامن تک اترا جا سکے..

چل خسرو گھر اپنے..

میں نے دودھ کی بوتل سے منہ لگا کر اپنے تئیں ایک آخری گھونٹ بھرا.. اُسے ذرا ہلایا تو اُس کے اندر تھوڑی سی چھاکاہٹ باقی تھی.. ایک آدھ گھونٹ باقی تھا.. میں نے ایک اور گھونٹ لیا جب بھی کچھ دودھ محسوس ہوتا تھا..

کیا اس بوتل کو بوجھ کم کرنے کی خاطر ہاتیں جانب کھائی میں پھینک دوں..

نہیں.. یہ تو مناسب نہیں.. اسے ساتھ لے جاتا ہوں.. نیچے پہنچ کر کہیں پھینک دوں گا.. میں نے اُسے تھیلے میں رکھ لیا..

اُٹھا.. اور اپنا مصلے سمیٹا.. اُسے تہہ کر کے تھیلے میں رکھ رہا تھا تو میری انگلیاں تھیلے میں پڑے چند پتھروں کو چھو گئیں.. یہ کیا ہیں.. اور پھر فوراً ہی دھیان آ گیا کہ یہ تو نشانیاں ہیں..

اور اُس لمحے وہ بلی نمودار ہو گئی..

بہت آہستہ خرامی سے.. جہاں میرا مصلے تھا اور جو سمیٹا جا چکا تھا اُس کے برابر میں جو چٹان تھی وہاں نمودار ہو گئی..

سورج کی روشنی میں اُس کا ایک ایک بال روشن تھا.. البتہ اُس کی آنکھیں دکتی نہ تھیں.. اور میں نہیں جانتا تھا کہ یہ وہی بلی ہے جو پچھلی شب جبل نور کی چوٹی پر ترک مسجد کے سیمنٹ کے ٹکڑے پر لیٹے ہوئے جس نے میرے ساتھ اٹکھیلیاں کی تھیں یا وہی ماؤں بلی ہے جو غار حرا میں میرے برابر میں آ لیٹی تھی..

وہ جو بھی بلی تھی میرے برابر میں چٹان پر آ بیٹھی اور مجھے نہایت نڈر اور اپنائیت کی نظروں سے تکنے لگی..

مجھے خدشہ ہے کہ کچھ لوگ شک کریں گے کہ یہ بلی پھر کیسے نمودار ہو گئی.. اگر آپ شک کرنے والوں میں سے ہیں تو یہ بیان آپ کے لیے نہیں ہے.. میں نے تو وہی کچھ بیان کرنا ہے جو مجھ پر گزرا ہے..

میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ بلی میری کسی بھی حرکت سے ٹھٹک جائے اور چلی جائے چنانچہ میں نے نہایت آہستگی سے تھیلے میں سے دودھ کی بوتل ہولے سے نکالی.. اور اُس کے پیندے میں کچھ دودھ دھوپ میں دکھائی دیتا تھا..

اب یہ دودھ اس ماؤں بلی کو پلاؤں کیسے..

میرے برابر میں جس چٹان کو کسی نے مجروح کر کے اُس میں سے ایک نشانی الگ کی تھی اُس کی ساخت میں تھوڑا سا نشیب تھا.. میں نے بوتل کا ڈھکن کھول کر اُس ہلکے سے نشیب میں دودھ کے آخری گھونٹ انڈیل دیے.. کچھ تو بہہ گیا اور کچھ ایک مختصر سے سفید تالاب کی صورت اختیار کر گیا جسے دھوپ مزید سفید کرنے لگی..

وہ جو بھی بلی تھی دودھ کے سفید تالاب میں اپنی مونچھیں بھگوتی اُسے سُڑکنے لگی..

کبھی وہ سر اٹھا کر مجھے اپنائیت کی نظروں سے تو لتی اور پھر دودھ سُڑکنے لگتی..

ابو ہریرہؓ کی بلیوں کی نسل کی ایک بلی تھی یا نہیں.. لیکن غارِ حرا میں گزاری ہوئی اُس رات کی آخری یاد وہی بلی تھی.. وہ دودھ جو ختم ہونے میں نہ آتا تھا اُسے جبلِ نور کی ایک چٹان کے نشیب میں طلوع ہونے والے سفید تالاب میں سے مونچھیں بھگوتی اُسے مزے سے سُڑکتی بلی..

نور کے پہاڑ سے اُترتے ہوئے.. میرا تختی تھیلا ہلکا ہو چکا تھا.. بابا کی مانند میری پوٹلی میں جو خوراک تھی وہ میرے کام آ چکی تھی.. کھجوریں، پانی، دودھ، سینڈوچ اور ایک سیب.. اور میں بھی ہلکا، لطیف اور پُر سکون ہو چکا تھا..

کوئی تھکاوٹ نہ تھی.. کچھ اضمحلال نہ تھا..

بس سکون اور سرخوشی تھی..

جیسے ایک موسیٰ کو طور سے اُترتے ہوئے سکون اور سرخوشی میں ہوتا ہے..

ایسے میں جبلِ نور سے اُس سویر اُترتا تھا..



مُنہ وَل کعبے شریف

(سفرنامہ حج)

مستنصر حسین تارڑ

۱) مجموعہ مستنصر حسین تارڑ: نکلے تری تلاش میں، اُندلس میں اجنبی، خانہ بدوش ۲) ہنزہ داستان ۳) سفر شمال کے ۴) کے ٹو کہانی ۵) نانگا پربت ۶) یاک سرائے ۷) سنولیک ۸) دیوسائی ۹) برفیلی بلندیاں ۱۰) چترال داستان ۱۱) رتی گلی ۱۲) بہاؤ ۱۳) راکھ ۱۴) قربتِ مرگ میں محبت ۱۵) ڈاکیا اور جولاہا ۱۶) قلعہ جنگی ۱۷) پیار کا پہلا شہر ۱۸) جپسی ۱۹) دیس ہوئے پردیس ۲۰) نکلے تری تلاش میں ۲۱) اندلس میں اجنبی ۲۲) خانہ بدوش ۲۳) نیپال نگری ۲۴) پرندے ۲۵) پکھیرو ۲۶) کاروان سرائے ۲۷) ہزاروں ہیں شکوے ۲۸) پرواز ۲۹) مُورت ۳۰) کالاش ۳۱) گزارا نہیں ہوتا ۳۲) چک چک ۳۳) اُلّو ہمارے بھائی ہیں ۳۴) سنہری اُلّو کا شہر ۳۵) شہپر ۳۶) ہزاروں راستے ۳۷) سیاہ آنکھ میں تصویر ۳۸) سورج کے ساتھ ساتھ ۳۹) شمشال بے مثال ۴۰) شتر مُرغ ریاست ۴۱) پتلی پیکنگ کی ۴۲) بے عزتی خراب ۴۳) گدھے ہمارے بھائی ہیں

Rs. 450.00

www.sang-e-meel.com
ISBN 969-35-1895-0

